اِداریہ نویسی
مسکین حجازی
مرکزی اُردو بورڈ

اداریہ نویسی

تصنیف

مسکین علی حجازی

لیکچرار شعبۂ صحافت ، پنجاب یونیورسٹی ، لاہور

مرکزی اردو بورڈ ، لاہور

بار اول : اگست ۱۹۷۰ء

تعداد اشاعت : ۱۱۰۰

قیمت : چھ روپے

ناشر

اشفاق احمد

ڈائریکٹر مرکزی اردو بورڈ

1 - اے گلبرگ ، لاہور

طابع

ایس - ایم - شفیق

مطبع

شفیق پریس ، لاہور

انتساب

وقار اور عالیہ کے نام

پیش لفظ

نظری اور اصولی اعتبار سے اداریہ اخبار کی روح اور ادارتی صفحہ اس کی شخصیت کا مظہر ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اداریہ نویسی ایک ایسی ذمہ داری ہے جو صحافت کے باقی تمام شعبوں کی ذمہ داریوں سے زیادہ اہم اور مشکل ہوتی ہے۔ اخباروں اور رسالوں میں ادارتی عملہ کے وہی ارکان اداریہ نویسی پر مامور کیے جاتے ہیں جو زیادہ اہل اور تجربہ کار ہوتے ہیں۔ عام طور پر اداریہ نویسی کی ذمہ داری ادارتی عملہ کے سربراہ یعنی ایڈیٹر کے سپرد ہوتی ہے۔ اب اداریہ نویسی ایک فن بن گئی ہے جس کے لیے بعض خصوصی صلاحیتیں درکار ہیں۔ بڑے اخبارات میں اب اداریہ نویسی پر ایسے افراد مامور کیے جاتے ہیں جو مختلف شعبوں میں ''ماہر'' کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن بیسیوں افراد پر مشتمل ادارتی عملے میں ایسے ''ماہروں'' کی صرف ایک محدود تعداد ہوتی ہے۔ یہ شاید اداریہ نویسی کے مشکل ہونے اور بہت کم لوگوں کے اداریہ نویس بن سکنے ہی کا نتیجہ ہے کہ اس موضوع پر بہت کم کتابیں ملتی ہیں۔ انگریزی میں بھی 'رپورٹنگ'، 'سب ایڈیٹنگ' اور 'فیچر نگاری' وغیرہ پر سینکڑوں تصانیف موجود

ہیں مگر اداریہ نویسی پر نسبتاً بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں ۔ اردو میں اس موضوع پر کوئی علیحدہ تصنیف موجود نہیں ہے ۔ بعض کتابوں اور مضامین میں اس کے اصولوں پر ضرور بحث کی گئی ہے مگر وہ بہت مختصر اور ناکافی ہے ۔ حد یہ ہے کہ برصغیر پاکستان و ہند کے جن نامور اور جلیل القدر صحافیوں کے اداریوں سے انگریزی ایوان اقتدار میں زلزلہ آ جاتا تھا اور جنھوں نے آزادی کی راہیں ہموار کیں ان کی 'اداریہ نویسی' پر بھی بہت کم مواد موجود ہے ۔

پاکستان میں اردو صحافت کی ہمہ گیری ، صحافت کی موجودہ مختلف النوع صورتوں کی ترقی ، حصول پاکستان کی جد و جہد میں اردو کے نامور اداریہ نویسوں اور صحافیوں کے کردار ، ملک کی بعض یونیورسٹیوں میں صحافت کی تعلیم و تربیت کے اہتمام اور صحافت کی طرف بہت سے نوجوانوں کے متوجہ ہونے کا تقاضا ہے کہ اردو میں 'اداریہ نویسی' کے فن پر بھی معلومات مہیا کی جائیں ۔ نیز نئی نسل سے تعلق رکھنے والے اخبار نویسوں کو بتایا جائے کہ ماضی میں ہمارے نامور صحافیوں نے اداریہ نویسی میں کیا کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں اور اردو اداریہ کن ارتقائی مراحل سے گزر کر موجودہ صورت تک پہنچا ہے ۔ 'اداریہ نویسی' اسی ضرورت کو پورا کرنے کی ایک کوشش ہے ۔ یہ کتاب بنیادی طور پر طالب علموں اور نوآموز صحافیوں کے لیے لکھی گئی ہے لیکن میں اسے ارباب نظر اور تجربہ کار اداریہ نویسوں کی

خدمت میں بھی اس توقع کے ساتھ پیش کرتا ہوں کہ وہ اس سلسلے کو آگے بڑھائیں ۔

مجھے اس کتاب کے دوسرے حصے کی تکمیل میں جو مشکلات پیش آئیں ان کا اجمالی تذکرہ بھی ضروری ہے کیوں کہ ایک اعتبار سے وہ قومی المیہ کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ مغربی پاکستان میں ساٹھ سال قبل جس عظیم المرتبت شخصیت اور زندۂ جاوید اخبار نے بیباک اردو صحافت کا آغاز کیا ، اس کا وقار بلند کیا اور اسے عوام تک پہنچایا وہ مولانا ظفرعلی‌خاں اور 'زمیندار' تھے ۔ لیکن ہمارے یہاں اس اخبار کے بھی صرف چند سال کے غیر مربوط فائل ملتے ہیں ۔ اس کی پچاس سالہ زندگی کے اہم ادوار کے فائل مفقود ہیں ۔ اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نئی نسل کو ماضی کے بیش بہا صحافتی ورثہ سے روشناس کرانا کوئی آسان کام نہیں ہے ۔

میں یہ وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اردو اداریہ کے ارتقا کا مطالعہ ہر دور کے چند اہم اخبارات اور اداریہ نویسی کے نمایاں رجحانات تک محدود رکھا گیا ہے ۔ تمام اخبارات و جرائد کے اداریوں کا مطالعہ و تجزیہ مقصود نہیں تھا ، نہ ایک جلد میں اس کی گنجائش ہے ۔ اسی طرح اردو کے نامور اداریہ نویسوں کا تذکرہ ان چند شخصیتوں تک محدود رکھا گیا ہے جو اردو اداریہ کے ارتقا کی منازل میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ حالانکہ ان کے علاوہ بھی بہت سے ایسے بزرگ گزرے ہیں جن کی اداریہ نگاری

نے اردو صحافت کے ارتقا پر غیرفانی نقش چھوڑے ہیں اور جنھوں نے اپنے اپنے دور میں اپنے اپنے رنگ میں ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں - ان بزرگوں اور ان کے فن اداریہ نویسی پر بھی کام کرنا ضروری ہے - اس کتاب میں ان کی اداریہ نگاری کا جائزہ شامل نہ ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کو نظرانداز کر دیا گیا ہے بلکہ مجبوری یہ تھی کہ ان سب کے ذکر کی گنجائش نہیں تھی اور مختصر تذکرے کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیوں کہ اس کتاب کے متعلقہ حصے کا مقصد اردو اداریہ کے ارتقا کا مطالعہ ہے اردو اداریہ کی مکمل تاریخ پیش کرنا نہیں ہے -

صحافت کے فنی پہلوؤں سے متعلق میری پہلی کتاب 'فن ادارت' پر اخبارات و جرائد کے تبصرے بہت حوصلہ افزا ہیں - مجھے خوشی ہے کہ مملکت کے چوتھے ستون کے متعلق قومی زبان میں معلومات پیش کرنے کی کوشش پر پسندیدگی کا اظہار کیا گیا ہے - 'اداریہ نویسی' میں مملکت کے چوتھے ستون کے اہم ترین پہلو کا احاطہ کیا گیا ہے - میں اپنی ان دونوں کوششوں کی تکمیل کے لیے جناب اشفاق احمد خاں کا خاص طور پر شکر گزار ہوں - انہوں نے دونوں مرتبہ ہر ممکن حوصلہ افزائی کی، بھرپور تعاون کیا اور ایسی دلچسپی لی کہ مہینوں کا کام دنوں میں مکمل ہو گیا -

میں محترم و مشفق بزرگ مولانا غلام رسول مہر کا بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے نہ صرف اپنا بہت سا بیش قیمت وقت دیا بلکہ اپنے پاس سے کئی نایاب فائل بھی فراہم کیے - پنجاب

یونیورسٹی لائبریری کے مسٹر عبدالوہاب بھی خصوصی شکریہ کے مستحق ہیں ۔ انہوں نے فائلوں کی تلاش اور فراہمی میں ہر ممکن تعاون کیا ۔ پنجاب پبلک لائبریری کے مسٹر حنیف شاہد نے بھی فراخدلانہ تعاون کیا ۔ میں اپنے شاگردان عزیز محمد شفیق جالندھری ، محمد صدیق ، خورشید احمد خاں ، صولت رضا ، محمد اجمل ملک ، توصیف احمد خاں ، مقبول احمد اور عبدالوحید کا بھی شکرگزار ہوں کہ انہوں نے مسودہ صاف کرنے میں ہاتھ بٹایا ۔ محمد شفیق نے اس سلسلے میں خاصا کام کیا ۔

میں ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کا بھی بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے کتاب کے خاکہ کے متعلق مفید مشورے دیے ۔

مسکین علی حجازی
اگست ۱۹۷۰ء

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ

پہلا حصہ

پہلا باب

اداریہ اور ادارتی صفحہ

اداریے کے لغوی معنی 'مدیر کی تحریر' یا ''مدیر کے انداز میں اظہار خیال'' کے ہیں ، لیکن عرف عام میں اس سے وہ مضمون مراد ہوتا ہے جو اخبار یا رسالے کے ادارتی صفحے پر اس اخبار یا رسالے کے نام کی تختی کے نیچے چھپتا ہے ، خواہ اسے مدیر نے لکھا ہو ، یا ادارے کے کسی دوسرے رکن نے یا کسی اور شخص نے -

تعریف

اگرچہ ہر صحافی اور اخبار یا رسالے کا ہر قاری اداریے کا مفہوم جانتا ہے ، مگر ماہرین نے اس کی کوئی حتمی تعریف متعین نہیں کی - بعض اداریہ نویسوں کے قول کے مطابق : ''اداریہ اخبار کے رجحانات کو شعوری اور مربوط شکل میں پیش کرنے کا نام ہے''[1] - بعض مدیر اسے ''حالات حاضرہ پر اخبار کی رائے'' قرار دیتے ہیں اور کچھ اسے ''حالات حاضرہ پر مدیر کی رائے'' تصور کرتے ہیں -

اداریے کی یہ تعریف ماضی کے اخبارات و جرائد کے اداریوں کے بارے میں ضرور صحیح کہی جا سکتی ہے ، مگر جدید اداریہ

پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا ۔ ماضی کے اخبارات میں اداریہ واقعی مدیر کی رائے یا فیصلے پر مشتمل ہوتا تھا ، مگر آج کل کا اداریہ صرف مدیر کے نقطۂ نظر ، رائے یا اخبار کے رجحانات سے عبارت نہیں ہوتا ۔ جدید اداریے میں بعض اوقات مسئلے کی توضیح یا تحلیل کو کافی سمجھا جاتا ہے ؛ یعنی اس میں کسی رائے کا اظہار لازمی نہیں ہوتا ، بلکہ مسئلے کی تشریح اور اس کے دونوں رخ پیش کرنے کے بعد فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیا جاتا ہے ۔ لیکن بعض لوگوں کی رائے میں یہ انداز تحریر درست نہیں ہے اور وہ اظہار رائے کے بغیر اداریے کو مکمل تسلیم نہیں کرتے ۔ بہرحال یہ امر مسلمہ ہے کہ اب اداریے کی نوعیت اور ہیئت بدل چکی ہے ۔ اب زیادہ تر مدیروں نے انتظامی سربراہ کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور بیشتر اخبارات میں اداریے معاون مدیر یا ایسے اداریہ نویس لکھتے ہیں جو مدیر نہیں ہوتے ۔ اب شخصی صحافت کا زمانہ بھی ختم ہو چکا ہے اور لکھنے والوں کے نام کے ساتھ اداریوں کی اشاعت کا رواج باقی نہیں رہا ۔ اب اداریہ نویس پس پردہ رہ کر کام کرتا ہے ۔ موجودہ دور میں اخبار شخصی نہیں رہا ، اجتماعی بن چکا ہے اس لیے اداریہ بھی اخباری ادارے کی اجتماعی رائے کا مظہر ہوتا ہے ۔ چنانچہ اب اداریے نے صرف ایڈیٹر کی رائے ہونے کی بجائے 'نوائے وقت' کی رائے ، پاکستان ٹائمز کے نقطۂ نظر ، 'مشرق' کے انداز فکر ، 'ندائے ملت' کے مسلک ، کوہستان کے فکری رجحان ، 'جنگ' کے زاویۂ نگاہ اور 'ڈان' کے خیال کی حیثیت اختیار کرلی ہے ۔

اداریے کی اس جدید صورت کے پیش نظر سرجیمز بیری نے اس کی تعریف یوں کی ہے : ''اداریہ رائے کو متاثر یا قاری کو محظوظ کرنے کے لیے حقائق اور نقطۂ نظر کو مختصر ، منطقی اور خوشگوار انداز میں پیش کرنے کا نام ہے یا اسے خبروں کی

ایسی توجیہ قرار دیا جا سکتا ہے جس سے عام قاری کسی خاص خبر کو واضح طور پر سمجھ سکے''[۲] - کارل جی ملر (.Carl G Miller) مصنف 'ماڈرن جرنلزم' نے لکھا ہے کہ : ''اداریہ اس مضمون کو کہتے ہیں جو کسی ہنگامی موضوع پر لکھا گیا ہو اور جس میں قاری کی سوچ ایسی راہ پر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہو جو مضمون نگار کے خیال میں صحیح راہ ہو - اداریہ نویس قاری کو اپنے نقطہ نظر سے متفق کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ایسی باتیں لکھتا ہے جس سے قاری قائل ہو جائے اور موافق رد عمل ظاہر کرے - اداریہ نویس مختلف ترغیبی طریقوں سے کام لے کر قاری کے جذبات و احساسات کو جائز طور پر متاثر کرتا ہے -''

مسٹر میکس لرنر (Max Lerner) کا کہنا ہے کہ : ''اداریہ ان رجحانات پر تبصرے کا نام ہے جو روزمرہ کے واقعات کی تہ میں کارفرما ہوتے ہیں''[۳] - ان مختلف آرا کے تجزیے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اداریہ اس صحافتی مقالے کا نام ہے جس میں ادارے کی طرف سے مسائل و امور پر روشنی ڈال کر قارئین کی رہنمائی کی جاتی ہے ، خواہ یہ رہنمائی فیصلے یا رائے کے اظہار کی صورت میں ہو ، خواہ مسائل و حالات اور معاملات کی توضیح و توجیہ کی شکل میں - چنانچہ ہم اداریے کی یہ تعریف کر سکتے ہیں کہ : ''اداریہ نویس کی طرف سے کسی ہنگامی موضوع پر مباحثے میں تحریری طور پر حصہ لینے کا نام اداریہ ہے -''

ادارتی صفحہ

ادارتی صفحہ اس صفحے کو کہتے ہیں جس پر اداریہ شائع ہوتا ہے - ابتدائی اخبارات میں نہ تو کوئی مخصوص ادارتی صفحہ ہوتا تھا ، نہ اداریے کے لیے کوئی متعین جگہ ہوتی تھی ، بلکہ اوائل اخبارات و جرائد میں تو اداریے کا کوئی جداگانہ

وجود نہیں ہوتا تھا ، بلکہ خبر ہی اس انداز سے لکھی جاتی تھی کہ وہ بہ یک وقت خبر بھی ہوتی تھی اور اداریہ بھی - بعد میں اداریہ الگ اور نمایاں طور پر شائع کیا جانے لگا ، تاہم اس کے لیے جگہ متعین نہیں کی گئی ؛ اسے اخبار یا رسالے میں کسی بھی جگہ 'اداریہ' کے زیر عنوان اور مدیر کے نام کے ساتھ چھاپ دیا جاتا تھا - صحافت نے مزید ترقی کی تو خبروں اور آرا یا نظریات کو الگ الگ رکھنے کے لیے ادارتی صفحہ متعین کرنے کی ضرورت پیش آئی ؛ چنانچہ اب دنیا کے تمام بڑے بڑے اخبارات و جرائد میں اداریے کے لیے ایک صفحہ مخصوص ہوتا ہے جس پر اخبار یا رسالے کے نام کی تختی کے نیچے اداریے چھاپے جاتے ہیں -

افتتاحیہ

پہلے زمانے کے اخبارات و جرائد میں اکثر و بیشتر ایک ہی اداریہ چھپتا تھا ، یعنی مدیر رسالے یا اخبار کی ہر اشاعت میں صرف ایک مسئلے پر اظہار خیال کرتا تھا ؛ اب اخبارات کی ہر اشاعت میں دنیا کے اہم واقعات خبروں کی صورت میں چھپتے ہیں اور بعض اوقات کئی اہم مسائل پر ادارتی اظہار خیال کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے اس لیے اب ایک سے زائد اداریے لکھے جاتے ہیں - ادارتی صفحے پر اخبار یا رسالے کے نام کی تختی کے نیچے شائع ہونے والا پہلا اداریہ 'افتتاحیہ' یا 'مقالہ' افتتاحیہ' کہلاتا ہے - انگریزی میں اسے لیڈنگ آرٹیکل (Leading Article) ، لیڈر (Leader) یا لیڈ ایڈیٹوریل (Lead Editorial) کہا جاتا ہے -

شذرات

مقالہ' افتتاحیہ کے بعد چھپنے والے اداریے شذرات یا ادارتی نوٹ یا مختصر اداریے کہلاتے ہیں - انگریزی میں ان کو نوٹس (Notes) ایڈیٹوریل نوٹس (Editorial Notes) یا لیڈرٹس (Leadrettes) کہا

جاتا ہے ۔

ادارتی صفحے کے مندرجات

اگرچہ ادارتی صفحے کو صرف اداریے کی وجہ سے یہ نام دیا گیا ہے ، مگر اس صفحے پر مقالہ، افتتاحیہ اور شذرات کے علاوہ بھی کئی چیزیں چھپتی ہیں ۔ دنیا کے بڑے بڑے اخبارات کے ادارتی صفحات کے مندرجات عموماً تین قسم کے ہوتے ہیں :

۱ ۔ اداریہ اور شذرات

۲ ۔ قارئین کے خطوط

۳ ۔ ہنگامی نوعیت اور اہمیت کا ایک یا ایک سے زیادہ مضمون ۔ ان مندرجات کے علاوہ اس صفحے پر اخبار کے نام کی تختی (Mast head) بھی چھپتا ہے ۔

مشہور امریکی اداریہ نویس ڈبلیو ڈبلیو ویمک (Waymack) الفاظ میں :

''ہمارے اخبارات کے ادارتی صفحات چار بنیادی اجزا پر مشتمل ہوتے ہیں :

۱ ۔ اداریے

۲ ۔ حالات حاضرہ پر سنڈیکیٹ تبصرے

۳ ۔ قارئین کے خطوط

۴ ۔ منتخب ملخصات اور کتابوں ، رسالوں یا دوسرے اخبارات کے اقتباسات وغیرہ''[۲] ۔

ایک اور مصنف کے بقول :

''مثالی ادارتی صفحہ متنوع مواد پر مشتمل ہوتا ہے ۔ اس

میں ہر طرح کے قارئین کے ذوق کی تسکین کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس صفحے پر واقعات کی وضاحت ان کے صحیح پس منظر میں کی جاتی ہے۔ قائدانہ انداز اختیار کیا جاتا ہے۔ مصروف لوگوں کو معلومات اور تھکے ہوئے لوگوں کو تفریح بہم پہنچائی جاتی ہے۔ اس صفحے میں ایڈیٹر اپنے قارئین سے گفتگو کرتا ہے۔ اہم مقامی یا قومی مسائل پر رائے عامہ کو منعکس کرتا یا اس کی تشکیل کرتا ہے۔ دوسرے افراد کی آوازیں بھی ایڈیٹر کی آواز میں شامل کی جاتی ہیں تاکہ اس صفحے میں ماہر مبصروں، کالم نگاروں اور خود اخبار کے نقطہ ہائے نظر کی ترجمانی ہو سکے''۵۔

اس رائے کی روشنی میں ادارتی صفحے پر یہ مندرجات ہونے چاہئیں:

۱ - اداریہ اور شذرات

۲ - خصوصی مضمون یا فیچر

۳ - مزاحیہ کالم

۴ - مدیر کے نام خطوط

۵ - کارٹون

۶ - تصویریں

مگر بڑے اخبارات کے ادارتی صفحات کے مندرجات انہی تین اقسام کے ہوتے ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ صحافتی روایت یہ ہے کہ اگر اخبار کے قارئین یا دوسرے شہری اخبار کی پالیسی، اس کے مندرجات، اس کی ادارتی رائے یا دوسرے مندرجات سے اختلاف کریں یا ان پر اظہار رائے کریں یا کسی اہم مسئلے پر اپنا نقطۂ نظر پیش کریں تو اسے بھی اسی صفحے پر جگہ دی جاتی ہے جس پر اداریہ چھپتا ہے۔ قارئین کی یہ آرا

خطوط کی صورت میں شائع کی جاتی ہیں ۔ تمام بڑے اخبارات یہ خطوط ادارتی صفحے ہی پر شائع کرتے ہیں ۔ اس کے علاوہ اس صفحے پر اہم قومی یا بین الاقوامی موضوع پر کوئی مضمون بھی باقاعدگی سے شائع کیا جاتا ہے ۔ یہ مضمون ادارے کے کسی رکن کا بھی ہو سکتا ہے اور باہر کے کسی مضمون نگار کا بھی ۔ اس صفحے پر بالعموم صرف ممتاز مبصروں ، دانشوروں ، مفکروں ، نقادوں اور ماہرین کے مضامین جگہ پاتے ہیں ۔ نیویارک ٹائمز کے ادارتی صفحے پر افتتاحیہ ، چند شذرات ، مدیر کے نام خطوط ، خاص مقالات اور ایک نظم ہوتی ہے ، اور دی ٹائمز (لنڈن) کے ادارتی صفحے پر افتتاحیہ ، چند شذرات ، خاص مقالات اور ایڈیٹر کے نام خطوط شائع ہوتے ہیں ۔

اردو اخبارات کے ادارتی صفحات کے مندرجات

بعض اردو اخبارات قارئین کے خطوط ادارتی صفحے پر شائع نہیں کرتے ۔ کم و بیش تمام اردو اخبارات کے ادارتی صفحے پر مزاحیہ کالم اور مذہبی کالم باقاعدگی سے چھپتے ہیں ۔ مذہبی کالم دراصل ادارتی صفحے کے مقاصد کی تکمیل میں مدد دیتا ہے ۔ مزاحیہ کالم اس اعتبار سے کارآمد ہوتا ہے کہ اس میں حالات حاضرہ ، سیاسی و سماجی مسائل اور شخصیتوں پر مزاحیہ و طنزیہ انداز میں تبصرہ کیا جاتا ہے اور اس سے رہنمائی اور اصلاح کا پہلو نکلتا ہے ۔ اردو اخبارات کے ادارتی صفحات کے مندرجات عموماً یہ ہوتے ہیں :

۱ ۔ اداریہ اور شذرات

۲ ۔ مضامین اور فیچر

۳ ۔ مذہبی کالم

۴ - مزاحیہ کالم
۵ - مدیر کے نام خطوط

مخصوص صفحہ کیوں ؟

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب اخبارات میں ادارتی صفحہ مخصوص کیوں ہوتا ہے ؟ اداریے اس مخصوص صفحے کے علاوہ کسی اور صفحے پر کیوں شائع نہیں کیے جاتے ؟

۱ - ابتدائی اخبارات میں خبروں کی بجائے افکار و نظریات مقدم سمجھے جاتے تھے ، اس لیے اکثر اوقات اداریے صفحہ اول پر یا کسی دوسرے صفحے پر نمایاں جگہ پر شائع کیے جاتے تھے - اس وقت تک صحافت نے تکنیکی اعتبار سے ترقی نہیں کی تھی اور مختلف اقسام کے مواد کو الگ اور مخصوص صفحات پر کسی خاص ترتیب سے نہیں چھاپا جاتا تھا - لیکن اب صحافت تکنیکی اعتبار سے ترقی کر چکی ہے ، اس لیے خبروں ، اداریوں اور میگزین کے صفحات الگ اور مخصوص کر دیے گئے ہیں - آج کل کے اخبارات میں خبروں کو مقدم حیثیت حاصل ہوتی ہے ، اس لیے صفحۂ اول خبروں کے لیے مخصوص ہوتا ہے - اگرچہ اب بھی بعض مواقع پر اخبارات مقالۂ خصوصی کی صورت میں صفحۂ اول پر اداریہ شائع کر دیتے ہیں لیکن اس کی ضرورت صرف اس صورت میں محسوس کی جاتی ہے جب صفحۂ اول پر اداریے کی اشاعت واقعی خبروں سے زیادہ اہم ہوتی ہے - مثلاً ۱۹۶۳ء میں لاہور میں عاشورہ محرم کے موقع پر فرقہ وارانہ فساد ہوا تو دوسرے دن لاہور کے کئی اخباروں نے اپنے صفحۂ اول پر مقالہ ہائے خصوصی شائع کیے -

۲ - اب ادارتی صفحہ صرف مقالات خصوصی یا مقالۂ افتتاحیہ سے عبارت نہیں ہوتا بلکہ اس صفحے پر خصوصی مضامین اور

فیچر ، مذہبی اور مزاحیہ کالم اور بعض اخباروں میں مدیر کے نام خطوط بھی شائع ہوتے ہیں ۔ اس سارے مواد کے لیے ایک صفحے کی تخصیص ضروری تھی ، چنانچہ اس مقصد کے لیے ادارتی صفحہ مخصوص کر دیا گیا ۔

۳ ۔ خبروں کے صفحات کا مقصد اطلاعات فراہم کرنا ، میگزین کے صفحات کا مقصد معلومات اور تفریح بہم پہنچانا اور ادارتی صفحے کا مقصد رہنمائی کرنا ، یعنی مسائل و معاملات پر روشنی ڈال کر ان کے مضمرات کو واضح کرنا ہے ۔ اس کے لیے ایک صفحہ مخصوص کرنا ضروری تھا تاکہ رہنمائی کے طالب قارئین کو ہر روز یہ صفحہ تلاش نہ کرنا پڑے ، بلکہ انہیں پہلے ہی سے معلوم ہو کہ وہ جس اخبار کے قاری ہیں اس کا کون سا صفحہ ادارتی صفحہ ہوتا ہے ۔

۴ ۔ صحافتی ضابطۂ اخلاق کے تحت ہر اخبار کا فرض ہے کہ وہ خبروں کو غیر جانبداری سے اور پوری صحت کے ساتھ شائع کرے ۔ خبروں کے انتخاب اور ان کی اشاعت یا پیشکش میں اپنی پالیسی اور پسند و ناپسند کو دخل انداز نہ ہونے دے اور اپنی پالیسی یا مخصوص مقاصد کو اداریوں تک محدود رکھے ۔ اس بنا پر بھی ضروری تھا کہ اخبار کی پالیسی کا مظہر مواد اور اس مواد پر مشتمل صفحہ الگ اور مخصوص ہو ۔

عموماً ہر اخبار ایک 'شعار' (Motto) کا پابند رہتا ہے جو اس کے ادارتی صفحے پر اخبار کے نام کی پیشانی کے ساتھ درج ہوتا ہے ۔

۵ ۔ اصولی اور نظری اعتبار سے ادارتی صفحے کے مندرجات اخبار کی روح ، اس کی شخصیت کے آئینہ دار اور ضمیر کے مظہر ہوتے ہیں ۔ اس روح یا شخصیت کو اخبار کے جسم کے اندر مگر

الگ رکھا جاتا ہے۔

ادارتی صفحے کا مقصد

اخبار کے اہم ترین مقاصد دو ہوتے ہیں :

۱۔ معلومات ، اطلاعات اور خبریں فراہم کرنا۔

۲۔ خبروں پر تبصرہ کرنا ، یعنی حالات حاضرہ پر اپنی رائے دینا ، عوام کی رہنمائی اور رائے عامہ کی تشکیل و تربیت۔

اخبار کے انہی دو بنیادی مقاصد کو پیش نظر رکھ کر اخبار کے صفحات کو دو واضح حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے یعنی 'خبروں کے صفحات' اور 'ادارتی صفحات'۔ خبروں کے صفحات میں وہ تمام اطلاعات اور معلومات دی جاتی ہیں جو خبروں کے زمرے میں آتی ہیں۔ ادارتی صفحات میں اہم ترین خبروں یعنی مسائل حاضرہ پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔ آج کل اخبارات میں اکثر خبریں کم و بیش یکساں ہوتی ہیں یا یکساں ہو سکتی ہیں۔ ان کے علاوہ ہر اخبار اپنی ضروریات اور پالیسی کے مطابق بھی خبریں پیش کرتا ہے ، اس لیے ایک اخبار دوسرے سے مختلف نظر آتا ہے۔ یہ فرق ادارتی صفحات میں خاص طور سے نمایاں ہوتا ہے کیوں کہ ہر اخبار اداریوں کے موضوعات کا انتخاب اور ان پر اظہار رائے اپنی پالیسی کے مطابق کرتا ہے۔

مقالہ' افتتاحیہ اور شذرات کے علاوہ معلوماتی مضامین اور کالم بھی ادارتی صفحے پر جگہ پاتے ہیں۔ اردو اخبارات میں اسی صفحے پر مزاحیہ کالم بھی ہوتا ہے۔ چونکہ اس صفحے کا مجموعی مزاج سنجیدہ ہوتا ہے ، اس لیے مزاحیہ کالم سنجیدگی کے بوجھل پن کو دور کرتا ہے۔ اسی مقصد کے لیے اس صفحے پر کبھی کبھی کارٹون یا ہلکے پھلکے فیچر یا مضامین بھی شائع کیے جاتے ہیں۔

خبریں قارئین کو مقامی ، ملکی اور بین الاقوامی واقعات سے باخبر رکھتی ہیں : کالم نویس انھیں پس منظر اور مضمرات سے روشناس کراتے ہیں؛ خصوصی نامہ نگار مختلف واقعات کی تفصیل پیش کرکے قارئین کی معلومات میں اضافہ کرتا ہے، اس طرح اداریہ نگار کے لیے زمین تیار ہو جاتی ہے کہ وہ حالات حاضرہ پر مدلل اور سنجیدہ بحث کرکے رائے عامہ کو کسی خاص سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرے ۔ اداریہ نگار کا مقصد حالات اور مسائل کی تشریح و توضیح کے علاوہ قارئین کی رہنمائی اور ان کی فکری صلاحیتوں کی نشو و نما بھی ہوتا ہے ۔ اس اعتبار سے اداریہ اخبار کا اہم ترین جزو ہوتا ہے ۔

اہمیت

دنیا کے ہر خطے میں اخبارات کا آغاز کم و بیش ایک ہی مقصد کے تحت ہوا تھا ، یعنی تبلیغ و اصلاح ۔ ابتدا میں ہر اخبار کا اجرا ایسی قد آور شخصیت نے کیا تھا جس کا مقصد ملک و قوم کی اصلاح ، عوام کی رہنمائی اور رائے عامہ کی تشکیل تھا ۔ برصغیر پاک و ہند میں سرسید احمد خاں ، مولانا محمد علی جوہر ، مولانا حسرت موہانی ، مولانا ابوالکلام آزاد ، مولانا ظفر علی خاں ، مولانا محمد اکرم خاں اور ایسے ہی دوسرے زعما نے اپنے اخبار ملک و قوم کی اصلاح ، آزادی کی جد و جہد کو کامیاب بنانے اور قوم میں بیداری پیدا کرنے کی غرض سے جاری کیے تھے ۔ ان کے اخبارات میں ادارتی صفحات کو بنیادی اور اولین اہمیت حاصل ہوتی تھی ، کیوں کہ ان شخصیتوں کے افکار و خیالات مقالات کی صورت میں ادارتی صفحات ہی پر شائع ہوتے تھے ۔

امریکہ میں ای ایل گاڈکن ، ہوریس گریلے ، ہینری ڈبلیو گریڈی ، سیموئل باؤلز اور ہنری واٹرسن جیسی شخصیتوں کے

افکار نے ادارتی صفحے کی اہمیت بڑھائی ۔ برطانیہ میں ڈینیل ڈیفو ، جان والٹر اور نارتھ کلف ایسے لوگوں نے اس صفحے کو عظمت بخشی ۔ نپولین نے ان الفاظ میں اداریے کی قوت کا اعتراف کیا تھا کہ : ''میں سو سنگینوں کی بہ نسبت ایک اخبار سے زیادہ ڈرتا ہوں ۔'' اسی طرح جارج ہشتم نے یہ کہہ کر کہ اخبار ''ٹائمز (لنڈن) دریائے ٹیمز سے بھی زیادہ طاقتور ہے'' ، اخبار کی اسی قوت کی طرف اشارہ کیا تھا جو اداریوں کی صورت میں رائے عامہ کی تشکیل کرتی ہے اور جس سے حکومتیں بنتی یا بگڑتی ہیں ۔

علامہ جمال الدین افغانی نے اخبار کے فرائض کے سلسلے میں کہا تھا کہ : ''اخبار شفیق طبیب ہے ، سچا ناصح ہے ، منکسر معلم ہے ، عاجز مؤدب ہے ، بیدار پاسبان ، ہوشیار نگہبان ......تاجروں کے لیے رہبر ، حاکموں کے لیے مشیر معدلت گستر...... ارباب بصیرت کے لیے نور پاش ، ارباب سیاست کے لیے دستور پسندیدہ ، تمدن کا مضبوط قلعہ اور انسانی بھلائی کی مستحکم رسی ہے''۶ ۔ ظاہر ہے کہ یہ لکھتے وقت ان کے سامنے اخبار کے خبروں کے صفحات کم اور ادارتی صفحات زیادہ تھے ، کیونکہ ان مقاصد کی تکمیل ادارتی صفحات ہی کرتے ہیں ۔

بانی پاکستان حضرت قائداعظم کا ارشاد ہے : ''قوم کی ترقی اور بہبود کے لیے صحافت ایک اہم ضرورت ہے ، کیونکہ صحافت ہی وہ ذریعہ ہے جو زندگی کے تمام شعبوں میں سرگرمیوں کو فروغ دیتا ہے ، جو قوم کی راہنمائی کرتا ہے اور رائے عامہ کی تشکیل کرتا ہے ۔'' نیز ''صحافت ایک عظیم طاقت ہے ۔ یہ فائدہ بھی پہنچا سکتی ہے اور نقصان بھی ۔ اگر یہ صحیح طرح چلائی جائے تو رائے عامہ کی رہنمائی اور ہدایت کا فرض انجام دے سکتی ہے''۷ ۔ بابائے قوم کے یہ دونوں ارشادات بھی اخبار کے ادارتی

صفحے کی اہمیت اور فرائض کی نشاندہی کرتے ہیں ۔ بقول مولانا غلام رسول مہر : ''ادارتی صفحہ اخبار کی روح اور اس کی شخصیت کا مظہر ہوتا ہے اور اس کا اصل کام رائے عامہ کی تشکیل اور عوام کی صحیح رہنمائی ہے''[۸] ۔

علامہ عنایت اللہ مشرقی نے ''پریس اور اس کی طاقت'' کے زیر عنوان لکھا تھا : ''مغرب کی زندہ قوموں نے پریس یعنی اخبارات کو ملک کی ایک بڑی طاقت مانا ہے ۔ ایسا تسلیم کرنے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اخبارات یا رسالے کسی خبر یا رائے یا حقیقت کو ملک کے طول و عرض میں یک دم پھیلا دیتے ہیں ۔ زندہ قوموں کے افراد اس شے کو ماننے یا نہ ماننے کے لیے فوراً تیار ہو جاتے ہیں اور ملک میں آگ سی لگ جاتی ہے ۔ پھر عمل کا دریا بہتا ہے اور ہر مخالف شئے کو سیلاب کی طرح بہا لے جاتا ہے ۔ اصلاح یا ریفارم کی یہ ایسی صورت ہے کہ اس کے مقابل بازاری افواہیں یا ڈھنڈورے اور لیکچر یا عبرت انگیز سزائیں اور انعام اس قدر جلد اثر پیدا نہیں کرتے''[۹] ۔ اس اقتباس میں اصلاح کی جس صورت کا ذکر کیا گیا ہے وہ زیادہ تر ادارتی صفحات کے فرائض سے تعلق رکھتی ہے ۔

مولانا محمد علی جوہر ادارتی صفحے کے مندرجات کے سلسلے میں لکھتے ہیں : ''مضامین میں ایک ایڈیٹوریل ہو ؛ کسی ایسے موضوع پر جو اس زمانے میں زیر بحث ہو ، اور یہ مضمون اخبار بھرنے کی غرض سے نہ لکھا گیا ہو بلکہ ایسا ہو کہ جس کا لکھا جانا نہایت ضروری تھا ، مضمون پولیٹیکل ہو ، خواہ سوشل ، خواہ تعلیمی و تجارتی ۔ ایڈیٹوریل نوٹ حال کے واقعات اور خبروں پر اپنی رائے زنی کے لیے ہے ، اس لیے اسی کام میں آنا چاہیے ۔ ایک مضمون کسی اور کا بھی ہونا چاہیے ۔ خواہ وہ کسی خبر کے

متعلق ہو یا کسی مستقل موضوع پر''[۱۰]۔

رحم علی ہاشمی نے لکھا ہے: ''اخبار کے مقالات افتتاحیہ اور ادارتی شذرات کے ذریعے سے ایڈیٹر رائے عامہ کی رہنمائی اور تشکیل کرتا ہے''[۱۱]۔

مسٹر عبدالقیوم نے ادارتی صفحے کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: ''اس صفحے کے بغیر اخبار خبریں پیش کرنے کے اعتبار سے کامیاب ہو سکتا ہے، لیکن یہ اپنے زمانے پر اثر انداز نہیں ہو سکتا، نہ اپنی تاریخ بنا سکتا ہے''[۱۲]۔

امریکی صحافی ٹام ویلس (Tom Wallace) نے جریدہ The Quill میں لکھا تھا: ''شہروں اور قصبوں میں کاؤنٹی کی نشستوں سے لے کر اوپر تک جمہوریت کی زندگی کا انحصار جس قدر ایک دیانت دارانہ ادارتی صفحے پر ہے اتنا کسی اور چیز پر نہیں، خواہ یہ صفحہ کتنا ہی گیا گزرا ہو''[۱۳]۔

مشہور امریکی کالم نویس اور رپورٹر ریمنڈ کلیپر (Raymond Clapper) نے لکھا تھا کہ: ''جمہوریت کی زندگی کے لیے بحث مباحثہ کو تنفس کی حیثیت حاصل ہے۔ ایک نظریے کے لیے دوسرے نظریے کا چیلنج ناگزیر ہے، اس کے بغیر جمہوریت کی حیثیت اس کمزور گھاس پھوس کی سی ہے جسے باد مخالف کا ایک ہی جھونکا جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔ ادارتی صفحہ امریکہ کا ٹاؤن ہال (مباحثہ کی جگہ) ہے یا اسے ٹاؤن ہال ہونا چاہیے''[۱۴]۔

امریکی ایڈیٹر جوزف پولٹزر جب اخبار ورلڈ World کے مالک بن گئے تو انھوں نے اپنے تاثرات کا اظہار یوں کیا ''میری سٹوارٹ نے سکاٹ لینڈ جاتے وقت کہا تھا، میرا دل فرانس میں رہ گیا ہے، اسی طرح میرا دل اب بھی ادارتی صفحے میں ہے۔

یہ معنوی اعتبار سے وہیں رہے گا ۔ مجھے یہ پسند نہیں کہ صرف اخبار کا مالک کہلاؤں ۔ مجھے جائداد سے نہیں ، سیاست سے محبت تھی ۔ سیاست کے عام اور خود غرضانہ معنی میں نہیں بلکہ آزادی اور انصاف کے نصب‌العین کے معنی میں'' [۱۵] ۔

سیٹز Seitz نے پیولٹزر کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے : ''مسٹر پیولٹزر نے 'ورلڈ' کو اتنی جلد اس لیے کامیاب بنا دیا کہ انھوں نے اس میں دور رس تبدیلیاں کیں ۔ خاص طور پر ادارتی صفحے کو یکسر بدل دیا ۔ ان کے نزدیک ادارتی صفحہ ہی اصل اخبار تھا ۔ یہ ثابت کرنے کے لیے اعداد و شمار کے انبار پیش کیے گئے ہیں کہ ان کے زیر انتظام 'ورلڈ' نے کتنی ترقی کی ، اور وہ توقع سے پہلے خوش حال ہو گیا ۔ لیکن خوشحالی ان کا مقصد نہیں تھی ۔ ان کی خواہش تو یہ تھی کہ اس دور کی عوامی طاقتوں کی کشمکش میں ان کا وجود محسوس کیا جائے ۔ اس اعتبار سے ادارتی صفحہ عوامی زندگی کا اکھاڑا تھا ، یعنی ایسی جگہ تھا جہاں ہر سال کے ہر دن میں قومی بہبود کی حامی یا مخالف تمام قوتوں سے مقابلہ و نبرد آزمائی ہوتی تھی'' [۱۶] ۔

نیویارک ٹائمز نے ۱۹ اگست ۱۸۹۶ء کو اپنے ادارتی کالموں میں ادارتی صفحے کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ : ''ہمارا مقصد نیویارک ٹائمز کے کالموں کو عوامی اہمیت کے تمام مسائل پر غور و بحث کے لیے وقف کرنا اور اس سلسلے میں ہر مکتب فکر اور زاویۂ نگاہ کے لوگوں کو یہ دعوت دینا ہے کہ وہ بحث میں ذہانت کو بروئے کار لا کر حصہ لیں'' ۔ یکم اکتوبر ۱۹۴۴ء کو اس اخبار نے پھر ادارتی صفحے کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا : ''قومی خیالات و نظریات کا سرچشمہ ہر عورت اور ہر مرد کا غور و فکر ہے ؛ خواہ وہ کتنے ہی گمنام اور غیر اہم ہوں مگر اپنے ذہن سے کام لے سکتے ہوں ۔ یہ ایک عظیم

فریضہ ہے جس سے کوئی شخص مستثنیٰ نہیں ہے، بشرطیکہ ہر شخص اچھا شہری بننے کی سعی کرے۔ اپنے ملک ہی کا نہیں اپنے زمانے کا اچھا شہری۔"

مرز (Merz) کے الفاظ میں: "اداریہ ایسے حالات پیدا کرنے میں مدد دے سکتا ہے جن میں حکومت خود اختیاری کامیابی کے ساتھ چل سکے"[۱۷]۔

ایک اور مصنف کے خیال میں: "اداریہ کالم رائے عامہ کی رہنمائی اور تشکیل کرتے ہیں اور قیادت کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ ان کالموں میں روزمرہ کے واقعات و مسائل کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ ان پر بحث کی جاتی ہے، ان کی وضاحت کی جاتی ہے اور نظریات کی تشکیل کی جاتی ہے"[۱۸]۔

ٹراجن کا کہنا ہے: "دو اخباروں کو ایک دوسرے سے جو چیز ممتاز اور جدا کرتی ہے، وہ اداریہ صفحہ ہے"[۱۹]۔

اشتراکی نظام میں اداریے کا مقصد

اداریے کی اہمیت اور اس کے کردار کے بارے میں جو بحث کی گئی ہے وہ جمہوری نظام میں آزاد پریس کے تصور پر مبنی ہے۔ کمیونسٹ نظام میں اخبارات اور دوسرے ذرائع ابلاغ سوشلزم کے فلسفے اور نظریے کے تحت کام کرتے ہیں اور ان کا انتظام اور انصرام نجی ہاتھوں میں نہیں بلکہ ریاست کے قبضے میں ہوتا ہے۔ اخبارات اور دوسرے ذرائع ابلاغ میں کام کرنے والے افراد 'پارٹی' کے ارکان یا سرکاری ملازم ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس نظام میں اداریہ نویس غیر جانبدار منصف ہونے کی بجائے جانبدار مبلغ ہوتے ہیں اور ان اخباروں کے اداریہ کالم متعلقہ فلسفے اور نظام کی ترویج و اشاعت اور حفاظت کے لیے وقف ہوتے ہیں۔ لینن کے

نقطہ نظر کے مطابق : ''پریس کمیونسٹ پارٹی کی تشکیل و تعمیر، 'کمیونسٹ' انقلاب کے نفاذ اور سوشلسٹ پارٹی کی حکومت کے قیام کا ایک مؤثر معاشرتی ذریعہ ہے''۲۰ - لینن ہی کے الفاظ میں : ''بورژوا عہد میں بورژوا پریس نجی کارخانوں اور نجی اداروں کے اندرونی حالات کا ذکر تک نہیں کرتا تھا اور اس کا یہ طرز عمل بورژوا طبقے کے مفاد کے مطابق تھا - ہم نے اس معمول کو یکسر بدل ڈالنا ہے - ابھی تک ہم نے ایسا نہیں کیا ہے اور ہمارے اخبارات میں ابھی وہ تبدیلی نہیں آئی جو سرمایہ دارانہ نظام سے سوشلزم میں بدلنے والے معاشرے کے اخبارات میں آنی چاہیے - ہمارے اخبارات میں سیاست کم ہونی چاہیے - سیاست کی بہت تشریح ہو چکی ہے اور اب یہ دو گروہوں یعنی کثیر التعداد پرولتاری اور قلیل التعداد بورژوا طبقے کے درمیان کشمکش تک محدود ہو کر رہ گئی ہے - ہمارے اخبارات میں معیشت زیادہ ہونی چاہیے، اور معیشت سے مراد ہے نئی زندگی کی اصلی تنظیم کے متعلق حقائق کو جمع کرنا ، ان کی چھان بین کرنا اور ان کا مطالعہ کرنا - یہ دیکھنا کہ آیا کہ بڑے کارخانوں ، زرعی کمیونوں ، غریب کسانوں کی کمیٹیوں اور مقامی اقتصادی کونسلوں نے نئی معیشت کی تیاری میں واقعی حقیقی کامیابی حاصل کی ہے -.......ہمارے اخبارات میں سیاسی بیان بازی اور لا حاصل مباحث کم ہونے چاہئیں - اخبارات کو زندگی کے قریب ہونا چاہیے - کارکن اور کسان روزمرہ کے کام میں جو نئی چیز پیدا کرتے ہیں زیادہ توجہ اس پر دینی چاہیے اور ہر نئی چیز کے بارے میں تحقیق کرکے یہ یقین کرنا چاہیے کہ وہ کمیونزم سے عبارت ہے''۲۱ -

لینن نے یہ خیالات اس وقت ظاہر کیے تھے جب نیا نظام ابتدائی مرحلے میں تھا - چنانچہ بعد ازاں اخبارات نئے سانچے میں پوری طرح ڈھل گئے - ان اقتباسات سے واضح ہے کہ اشتراکی

نظام میں اخبارات اور دوسرے ذرائع ابلاغ غیر جانبدار نقاد اور منصف نہیں ہوتے بلکہ اس نظام ہی کا ایک حصہ ہوتے ہیں اور ابلاغ کے محاذ پر اس نظام کی ترویج و اشاعت اور کامیابی کے لیے کام کرتے ہیں ۔ مگر اشتراکیت کے بانیوں کی رائے میں اخبارات اس سانچے میں ڈھل کر ہی صحیح فرائض ادا کر سکتے ہیں ، کیونکہ : ''صرف سوشلسٹ نظام میں صحافی اور معاشرے کے درمیان تعلقات خوش اسلوبی سے استوار ہوتے ہیں ۔ اس لیے کہ سوشلزم میں مخالف طبقات نہیں ہوتے ۔ اس نظام میں پیشہ ور صحافی عام قارئین کے خلاف کام نہیں کرتا ۔ سوشلزم میں صحافی اور قاری کے ساجی مفادات ایک دوسرے سے وابستہ ہوتے ہیں ۔ اس نظام میں پریس عوام کی خدمت کرتا ہے اور عوام الناس اس (پریس) کے کام میں شریک ہوتے ہیں ۔ یہ حقیقت کہ صحافی کمیونسٹ پارٹی کی حمایت کرتا ہے، اشتراکی پریس کی صحیح ہردلعزیزی کا اعلیٰ ترین اظہار ہے''۲۲ ۔ چنانچہ اشتراکی ممالک کے اخبارات کے اداریے خبروں پر مبنی یا معاشرتی نہیں ہوتے ، پالیسی پر مبنی ہوتے ہیں اور ان کا محور وہ معیشت ہوتی ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ۔

خلاصہ

ادارتی صفحہ اور اداریوں کی ضرورت اور اہمیت کے سلسلے میں جو آرا بیان کی گئی ہیں ، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ادارتی صفحے کو روایتی طور پر اخبار کی روح سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔ یہ صفحہ اخبار کی شخصیت کا مظہر ہوتا ہے ۔ یہی صفحہ اخبار کو معلومات اور اطلاعات کی فراہمی کے دوسرے عام ذرائع سے ممتاز کرتا ہے اور اخبار کو معاشرے میں وقار اور اثر عطا کرتا ہے ۔ اگرچہ ابلاغ عام کے دوسرے ذرائع مثلاً

ریڈیو اور ٹیلیویژن بھی خبروں پر تبصرے نشر یا ٹیلی کاسٹ کرکے یہی مقصد پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر ان ذرائع ابلاغ کی ترقی اور وسعت کے باوجود اخبار اور ادارتی صفحے کی ضرورت و اہمیت میں کوئی کمی نہیں آئی ، بلکہ خواندگی میں اضافے کے ساتھ اخباروں کا دائرۂ اثر وسیع تر ہوتا جا رہا ہے ، کیونکہ ادارتی صفحہ جن مقاصد کی تکمیل کرتا ہے وہ نشر یا ٹیلی کاسٹ ہونے والے تبصروں سے پورے نہیں ہوتے ۔

سوالات

۱ ۔ اداریے کی تعریف کیجیے اور اس کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالیے ؟

۲ ۔ ادارتی صفحہ کسے کہتے ہیں؟ اسے اخبار میں کیا اہمیت حاصل ہوتی ہے ؟

۳ ۔ ''ادارتی صفحہ اخبار کی روح اور اس کی شخصیت و کردار کا مظہر ہوتا ہے'' بحث کیجیے ۔

۴ ۔ ادارتی صفحے کے مختلف مندرجات اور ان کی اہمیت پر روشنی ڈالیے ۔

۵ ۔ اردو روزناموں کے ادارتی صفحات کے مندرجات بالعموم کتنی اقسام کے ہوتے ہیں ؟

حوالہ جات

1. Waldrop, Gayle A., 'Editor and Editorial Writer', Rinehart and Co. Inc. Publishers, New York, Toronto 1948 p. 47.

۲ - ایضاً ص ۸۳

۳ - ایضاً ص ۸۴

۴ - ایضاً ص ۸

5. George Fox-Mott and others, 'Exploring Journalism' New York p. 267.

۶ - 'رہبر دکن' علامہ افغانی نمبر مورخہ ۱۹ بہمن ۱۳۴۹ ف بحوالہ اردو صحافت از بدر شکیب -

۷ - ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ، 'کاروان صحافت' ، باب قائد اعظم اور صحافت -

۸ - انٹرویو کے دوران مولانا کے خیالات کا اظہار -

۹ - 'الاصلاح' کا پہلا اداریہ بحوالہ ہفت روزہ چٹان لاہور - ۹ ستمبر ۱۹۶۳ء ص ۱۳

۱۰ - بحوالہ 'سیرت محمد علی' از رئیس احمد جعفری صفحات ۲۳۲ تا ۲۳۵

۱۱ - رحم علی الهاشمی ، 'فن صحافت' ، انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۴۳ء ص ۱۲۳

12. Qayum M. A., 'The Working Journalist', Ferozsons, 1950 p. 113.

13. 'Editor and Editorial Writer' p. 1.

۱۴ - ایضاً ص ۲

۱۵ - ایضاً ص ۵

16. Bird and Merwin 'The Newespaper and Society', New York p. 306.

۱۷ - ایضاً ص ۳۰۷ -

18. 'Exploring Journalism' p. 288.

19. Natrajan S., 'A History of the Press in India', p. 121.

20. 'The Democratic Journalist' (Journal) No 6, June 1968, Article "How Permanent is Lenin's Conception of the Press by Irenea Tetelowska.

21. Lenin 'Where to Begin,' Progress Publishers, Moscow, 1966 p. 44 to 46.

22. The Democratic Journalist,' No 5, 1969. Article "A Criticism of the Bourgoeis Theory of Journalism" by Prof. Jasen Zasurski p. 104.

دوسرا باب

اداریہ نویسی کے جدید رجحانات

قدیم اور جدید اداریے کا فرق

عام طور پر محسوس کیا جاتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اداریے کی اہمیت بھی کم ہوتی جا رہی ہے ۔ چارلس مرنز نے اس کی ذمہ داری قارئین پر ڈالی ہے ۔ ان کا یہ قول بھی قابل توجہ ہے کہ : ''اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب اس قسم کے اداریے لکھنے والے لوگ نہیں رہے جیسے ماضی میں لکھے جاتے تھے ۔'' حقیقت یہ ہے کہ اب نہ اس طرح کے اداریے لکھنے والے لوگ موجود ہیں نہ ایسے اداریے پسند کرنے والے قارئین ۔ لیکن اس میں نہ تو اس دور کے اداریہ نویسوں کا قصور ہے نہ قارئین کا ۔ یہ تبدیلی امتداد زمانہ کا نتیجہ ہے ۔ اس زمانے کے تقاضے مختلف تھے جب نامور شخصی اداریہ نویسوں کا طوطی بولتا تھا ۔ اس وقت کے اخبارات کاروباری ادارے نہیں تھے ۔ ان کا کام تبلیغ و اصلاح تھا ۔ تعلیم اور روشن خیالی عام نہ تھی ۔ وہ پر جوش تحریکوں کا زمانہ تھا ۔ اس وقت اخبارات کو ریڈیو اور ٹیلیویژن کا مقابلہ نہیں کرنا پڑتا تھا ۔ نہ کئی رنگوں میں شائع ہونے والے رسائل و جرائد ان کے حریف تھے ۔ اخبار نکالنے کے لیے چند ہزار روپے

کافی ہوتے تھے - اخبار جاری کرنے والا عموماً بعض دوسری حیثیتوں سے بھی نامور ہوتا تھا - لوگ اس کے خیالات و نظریات سے روشناس ہونے اور اس سے رہنمائی حاصل کرنے کے لیے اخبار پڑھتے تھے - پھر اس دور کے اخبارات میں آج کل کی طرح تنوع اور دلچسپ مواد بھی نہیں ہوتا تھا ، چنانچہ :

۱ - پہلے اداریے صرف اہم قومی یا بین الاقوامی مسائل و امور پر لکھے جاتے تھے - 'الہلال' ، 'کامریڈ' ، 'ہمدرد' ، 'البلاغ' اور ابتدائی دور کے 'زمیندار' میں زیادہ تر افتتاحی مقالات قومی اور بین الاقوامی سیاست ، ابنائے وطن کی غفلت شعاری اور ان میں بیداری پیدا کرنے کی ضرورت ، سامراجی طاقتوں کی چیرہ دستیوں ، ہندوؤں کی ناانصافیوں اور اسی نوعیت کے دوسرے موضوعات پر ہوتے تھے - اب اخبارات میں خبریں بھی زیادہ چھپتی ہیں اور عموماً الگ الگ 'مقامی' ، 'اضلاعی' ، 'قومی' اور 'بین الاقوامی' 'حصوں' میں تقسیم ہوتی ہیں- لیکن موجودہ اداریوں کے موضوعات میں وسعت پیدا ہو گئی ہے - اب مقامی ، علاقائی ، گروہی بلکہ انفرادی مسائل بھی اداریوں کے موضوع بنتے ہیں - علاوہ ازیں پہلے عموماً سیاسی ، مذہبی اور فکری موضوعات پر اداریے لکھے جاتے تھے ، اب تجارتی ، کاروباری ، صنعتی ، تعلیمی ، تہذیبی ، ثقافتی ، معاشی ، سیاسی اور شہری ہر طرح کے مسائل پر اداریے لکھے جانے لگے ہیں -

۲ - پہلے زمانے کے اداریہ نگار عموماً نامور ادیب ، شاعر ، مقرر اور مذہبی یا سیاسی رہنما ہوتے تھے - ان کی حیثیت محض ایک کارکن صحافی کی نہیں ہوتی تھی - وہ معاشرے میں ممتاز مقام رکھتے تھے - ان کا منفرد اسلوب ہوتا تھا اور مقالہ' افتتاحی لکھنے والے کے مخصوص طرز تحریر اور انداز فکر کا آئینہ دار

ہوتا تھا ۔

۳ ۔ پہلے زمانے میں اداریوں کی طوالت متعین نہیں ہوتی تھی ۔ اداریہ نویس اپنی صوابدید کے مطابق متعلقہ مسئلے پر جس قدر مفصل اظہار خیال کرنا چاہتا کر سکتا تھا ، اور اس کے اداریے کو اخبار میں لازماً جگہ ملتی تھی ۔ مولانا محمد علی جوہر کا اداریہ 'دی چوائس آف ٹرکس' کامریڈ کے انیس کالموں میں شائع ہوا تھا ، مگر اب اداریوں کے لیے جگہ مقرر ہے ۔ اکثر و بیشتر حالات میں اداریے کی طوالت مقررہ جگہ کی پابند ہوتی ہے ۔ صرف غیر معمولی حالات میں اداریے کو زیادہ جگہ دی جاتی ہے یا اسے دو یا اس سے زائد قسطوں میں شائع کیا جاتا ہے ۔

۴ ۔ پہلے زمانے میں اداریے کو مؤثر بنانے کے لیے زبان و بیان پر قدرت سے زیادہ کام لیا جاتا تھا ۔ اس دور میں ادب اور صحافت کی زبان میں زیادہ فرق نہیں ہوتا تھا اور اداریہ نویس صحافتی روایت کے مطابق اپنی تحریر کو مؤثر بنانے کے لیے طلاقت لسانی کا سہارا لیتا تھا ۔ اب ادب او صحافت کے راستے الگ ہو چکے ہیں ، اس لیے اداریوں میں زبان و بیان کے مقابلے میں مفہوم کی ادائیگی کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے ۔

۵ ۔ پہلے زمانے کے اداریے عموماً خبروں پر مبنی نہیں ہوتے تھے ؛ اداریہ نویس جس مسئلے پر چاہتا اداریہ لکھ دیتا تھا ، خواہ وہ مسئلہ خبر کی صورت میں اخبار میں شائع ہوا ہو یا نہ ہوا ہو ۔ اب اداریہ اکثر و بیشتر خبروں پر مبنی ہوتا ہے ۔ یعنی اداریہ نویس جب اپنے روزنامے کی کل کی اشاعت کے لیے اداریہ لکھنے بیٹھتا ہے تو وہ آج کے اخبارات کا مطالعہ ضروری سمجھتا ہے اور آج کی خبروں ہی سے اداریے کے لیے موضوع منتخب کرتا ہے ۔

۶ ۔ قدیم اداریوں میں اشعار بکثرت استعمال ہوتے تھے ۔

بعض اوقات اداریے کا آغاز ہی شعر سے ہوتا تھا ۔ اختتام بھی شعر پر ہوتا تھا اور متن میں بھی جگہ جگہ اشعار استعمال ہوتے تھے ۔ اسی طرح محاورے اور ضرب الامثال استعمال کرنے کا رواج بھی عام تھا ۔ اب یہ صورت نہیں رہی ۔ اب اداریےمیں کوئی غیر ضروری لفظ تک استعمال کرنے سے احتراز کیا جاتا ہے اور مطلب کی بات کم سے کم اور سیدھے سادے الفاظ میں ادا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ اس سے یہ مراد لینا غلط ہوگا کہ اب زبان و بیان پر قدرت کو قطعاً کوئی اہمیت نہیں دی جاتی ۔ اداریے کو مؤثر بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اداریہ نویس جچے تلے الفاظ میں اپنی بات کہنے پر قادر ہو ۔ مقفٰی اور مسجع عبارت کے مقابلے میں آسان اور سیدھی سادی زبان لکھنا کہیں زیادہ مشکل کام ہے ۔

۷ ۔ پہلے زمانے کے اداریے 'دستخطی' ہوتے تھے ، یعنی اداریے کے اوپر یا نیچے اسے لکھنے والے کا نام بھی ہوتا تھا ۔ یہ صورت حال بعض اخبارات میں پاکستان بننے کے بعد بھی قائم رہی۔ مثلاً روزنامہ 'کوہستان' لاہور میں خاص مواقع پر نسیم حجازی کے 'دستخطی' اداریے شائع ہوتے رہے ۔ مگر اب ایسے اداریوں کا رواج ختم ہو چکا ہے اور اداریے کے ساتھ اداریہ نویس کا نام نہیں دیا جاتا ۔

۸ ۔ پہلے زمانے میں اداریوں میں عموماً جذباتیت غالب ہوتی تھی ۔ اداریہ نویس قاری کے ذہن کی بجائے دل سے اپیل کرتا تھا ، کیوں کہ اس وقت اداریہ نویس کا مقصد قاری کو آمادۂ عمل کرنا یا کسی خاص مقصد کے لیے ابھارنا ہوتا تھا ۔ اب اداریہ نویس قاری کے دل کی بجائے اس کے فکر و ذہن سے اپیل کرتا ہے ، کیوں کہ آج کے اداریہ نویس کا مقصد دور حاضر کے با شعور اور باخبر قاری کو سمجھانا اور مسائل کے مختلف پہلوؤں سے آگاہ

کرنا ہے ، اسے جذباتی طور پر متاثر کرنا نہیں ۔

جدید رجحانات

مذکورہ بالا اسباب و امور کی بنا پر اداریہ نویسی کے مقاصد تبدیل ہو گئے ہیں اور جدید اداریہ نویسی میں مندرجہ ذیل رجحانات نے راہ پا لی ہے :

۱ - خبروں کی توضیح و توجیہ

جیسا کہ پہلے وضاحت کی جا چکی ہے ابتدا میں اداریے عموماً خبروں پر مبنی نہیں ہوتے تھے ، بلکہ اس دور کے مسائل اور رجحانات پر لکھے جاتے تھے اور ان میں اداریہ نویس کا انفرادی انداز فکر کارفرما ہوتا تھا ۔ اس اعتبار سے اس دور کا اداریہ انفرادی رائے یا انفرادی فیصلے کا مظہر ہوتا تھا ۔ یہ الگ بات ہے کہ اداریہ نویس کی شخصیت بلند ہونے کے باعث یہ انفرادی رائے اور فیصلہ ، اجتماعی رائے اور اجتماعی فیصلے کی حیثیت رکھتی تھی ۔

اب بیشتر اداریے خبروں پر مبنی ہوتے ہیں ، شاذ و نادر ہی کوئی ایسا اداریہ لکھا جاتا ہے جو کسی خبر پر مبنی نہ ہو بلکہ عمومی نوعیت کا ہو ۔ خبر کو اداریے کی بنیاد بنانے کے سلسلے میں ضروری ہے کہ اس خبر کی توضیح و توجیہ کی جائے ، یعنی جو واقعہ خبر بنا ہے اس کے محرکات و عوامل ، اس کے مختلف پہلو ، اس کے متوقع نتائج اور پورے معاشرے یا اس کے مختلف شعبوں پر اس کے اثرات کا جائزہ لیا جائے ۔ خبر بننے والے واقعے کے مضمرات و محرکات کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کرنے کے بعد یہ ضرورت باقی نہیں رہتی کہ اداریہ نویس کسی فیصلے یا رائے کا اعلان بھی کرے ، کیوں کہ باشعور قارئین مسئلے کو پوری طرح سمجھنے کے بعد خود ہی مطلوبہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں ۔

گویا اب اداریہ نویس کا رجحان 'رائے' دینے یا 'فیصلہ' کرنے کی طرف کم ہو گیا ہے اور مسائل کی تشریح اور وضاحت کی طرف زیادہ توجہ کی جاتی ہے۔

اداریہ نویس کو مسئلے کے ادراک اور اس کی تفہیم پر محنت کرنی پڑتی ہے۔ چونکہ ریڈیو یا ٹیلیویژن کے مبصر اور اخبارات و جرائد کے کالم نگار بھی کم و بیش یہی کام کرتے ہیں، اس لیے اداریہ نویس کا کام نسبتاً محنت طلب اور دشوار ہو گیا ہے۔ اگر وہ اداریے پر محنت نہ کرے تو باشعور قارئین کے لیے اس میں کوئی دلچسپی نہیں رہ جاتی۔ اس کے علاوہ مسائل کو سمجھنے کے سلسلے میں قارئین کے پاس دوسرے ذرائع بھی موجود ہوتے ہیں۔ کسی اداریے میں اگر مسئلے کی پوری تشریح و توضیح نہ کی گئی ہو تو وہ قارئین کی رہنمائی نہیں کرتا اور اخبار میں صرف خانہ پری کی حیثیت رکھتا ہے۔ بہر حال اب جذباتی انداز میں یا لفاظی کے سہارے رائے یا فیصلے کو مؤثر بنانے کی بجائے منطق، استدلال، اعداد و شمار اور حقائق کے ذریعے توضیح و توجیہ کا رجحان کارفرما نظر آتا ہے۔

اب اداریہ نویس صرف اپنے علم، تجربے اور صواب دید پر انحصار نہیں کرتا بلکہ اس کی لائبریری میں اعداد و شمار، جائزہ رپورٹوں، مسائل کے ریکارڈ، ماہرین کے تجربوں اور تجزیوں پر مشتمل مواد کا انبار ہوتا ہے اور منصف کی حیثیت سے کسی معاملے میں فیصلہ دینے سے پہلے وہ ان تمام معلومات سے استفادہ کرتا ہے اور انہیں کام میں لاتا ہے۔

۲ - زیادہ موضوعات

قدیم اداریوں کے موضوعات اہم مگر محدود ہوتے تھے۔ اس وقت کے اخبارات بھی زیادہ ضخیم نہیں تھے۔ گروہی، مقامی

یا علاقائی مسائل نہ خبروں اور فیچروں کی صورت میں اخباروں میں جگہ پاتے تھے ، نہ ان پر اداریے لکھے جاتے تھے ۔ اب اخبارات کی صورت تبدیل ہو چکی ہے ۔ اخبار کی ہر اشاعت میں دنیا بھر کی خبریں شائع ہوتی ہیں ۔ گویا خبروں کی صورت میں ایسے بہت سے واقعات اور مسائل سامنے آتے ہیں جن پر ادارتی اظہار خیال کی ضرورت ہوتی ہے ۔ مثلاً لاہور میں اگر برق رو میں تعطل پیدا ہونے سے شہریوں کو تکلیف ہوتی ہے یا بارش کے پانی کا نکاس نہ ہونے کے باعث لوگوں کو پریشانی اٹھانا پڑتی ہے تو لاہور سے شائع ہونے والے اخبار کے لیے ضروری ہے کہ اس مسئلے پر اداریہ لکھے ، کیونکہ اس کے ہزاروں قارئین لاہور میں موجود ہیں اور اداریوں میں ان کی ترجمانی ضروری ہے ۔ اسی طرح اگر کراچی میں ٹریفک کے نظام میں خلل پڑنے سے شہریوں کو مشکل پیش آتی ہے تو کراچی سے شائع ہونے والے اخبار کے لیے لازمی ہے کہ اپنے ادارتی کالموں میں اس مسئلے پر اظہار خیال کرے ۔ اسی طرح قارئین کے مختلف طبقوں اور گروہوں کے الگ الگ یا اجتماعی مسائل پر بھی اظہار خیال ضروری ہے ۔ چنانچہ اب اداریوں یا شذرات کے بیشتر عنوانات اس قسم کے ہوتے ہیں : ''صفائی کا ناقص انتظام'' ، ''پانی کی غیر تسلی بخش فراہمی'' ، ''پرائمری اساتذہ کے مطالبات'' ، ''ریلوے ملازموں کی شکایتیں'' ، ''کھاد کی تقسیم'' ، ''نتیجے کے اعلان میں تاخیر'' ، ''چینی کی گرانی'' ، ''مزدوروں کی ہڑتال'' ، ''بے جواز مہنگائی'' وغیرہ ۔ گویا اب اداریے کے موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا ہے اور اس کی وسعت میں اضافے کا سلسلہ متواتر جاری ہے ۔ بعض اوقات ایسے موضوعات مسائل پر بھی اداریے لکھے جاتے ہیں جو مقامی ، طبقاتی یا علاقائی نوعیت کے ہوتے ہیں اور ایک اعتبار سے ان کی اہمیت

ثانوی ہوتی ہے۔ مگر اخبار اور قارئین کے نقطہ نظر سے یہ موضوعات اہم ہوتے ہیں۔

۳۔ تخصیص کار

پہلے عموماً ایک ہی شخص اداریے لکھا کرتا تھا جو اہم قومی یا بین الاقوامی مسائل سے متعلق ہوتے تھے۔ اب زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح صحافت میں بھی تخصیص کار راہ پا چکی ہے اور اس فن کے تقاضے پورے کرنے کے لیے بعض خصوصی صلاحیتیں درکار ہوتی ہیں۔ اب ہر اخبار میں ہر روز ایک مقالہ افتتاحیہ اور چند شذرات شائع ہوتے ہیں۔ ان کے موضوعات متنوع ہوتے ہیں، مثلاً مقالہ افتتاحیہ اگر بین الاقوامی سیاسی صورت حال پر لکھا ہوتا ہے تو شذرہ حکومت کی اقتصادی پالیسی پر لکھا جاتا ہے۔ ایک اداریے کا موضوع 'نیا قومی بجٹ' ہوتا ہے، تو دوسرے کا 'زرعی پیداوار'۔ ایک شذرہ 'بلدیات کی کارکردگی' پر لکھا جاتا ہے تو دوسرا 'اساتذہ کے مسائل' پر۔ ہر روز بیسیوں مسائل خبروں کی صورت میں اداریہ نویس کے سامنے آتے ہیں، اسے ان میں سے چند اہم مسائل پر مقالہ افتتاحیہ اور شذرات لکھنے ہوتے ہیں۔ اسے ایک ہی اشاعت کے لیے 'جرائم میں اضافہ' کے مسئلے پر مقالہ افتتاحیہ لکھنے کے بعد 'ٹریفک کے مسائل' پر شذرہ بھی لکھنا ہوتا ہے۔ گویا اداریہ نویس کو بیک وقت مختلف مسائل و امور پر حاوی ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ فرد واحد ہمہ دان نہیں ہو سکتا کہ ہر مسئلے اور ہر موضوع سے پورا انصاف کر سکے اس لیے اب تمام بڑے اخباروں میں ایک سے زائد 'اداریہ نویس' ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر اداریہ نویس ایک یا ایک سے زائد شعبوں کا ماہر ہوتا ہے۔ مثلاً ایک اداریہ نویس اقتصادی امور کا ماہر ہوتا ہے اور جب بھی کسی اقتصادی موضوع

یا مسئلے پر لکھنے کی ضرورت ہوتی ہے تو وہی اداریہ لکھتا ہے۔ دوسرا اداریہ نویس سائنس یا سیاست پر عبور رکھتا ہے اور ضرورت کے وقت اپنے خاص موضوع پر اداریے یا شذرات لکھتا ہے۔ یعنی اب اداریہ نویسی میں بھی تخصیص کار پیدا ہو چکی ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ تخصیص کار مزید وسیع ہوتی جا رہی ہے۔

حال میں ٦٦ بڑے امریکی روزناموں کا جائزہ لیا گیا تھا، ان میں سے انیس اخباروں میں صرف ایک ایک اداریہ نویس تھا: ۲۵ اخباروں میں دو دو اداریہ نویس تھے؛ پانچ اخباروں میں تین تین اور آٹھ اخباروں میں چار چار اداریہ نویس تھے۔ پانچ اخباروں میں اداریہ نویسوں کی تعداد پانچ سے سات تک تھی۔ ایک اخبار کے متعلق بتایا گیا کہ اس میں نصف اداریہ نویس موجود ہے یعنی اداریہ نویس جز وقتی کام کرتا ہے۔

ان اعداد و شمار سے ہر اخبار کے اداریوں کے معیار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ان ٦٥ روزناموں میں سے پندرہ اخبار اپنے ہر اداریہ نویس سے روزانہ نصف کالم یا اس سے بھی کم اداریہ لکھواتے ہیں۔ اس طرح انہیں اپنے موضوع میں مہارت تامہ حاصل کرنے، حقائق کی چھان بین کرنے اور اپنی تحریروں پر نظرثانی کا موقع ملتا ہے۔ اچھے اداریوں میں ۹۰ فیصد مواد اور دس فیصد آرٹ ہوتا ہے۔ ایک اچھا اداریہ نویس نصف کالم کا اداریہ لکھنے کے لیے ۲ دن سے لے کر ایک ہفتے تک محنت کرتا ہے۔ یہ صورت حال بیس پچیس سال پہلے تھی؛ اب امریکہ کے ہر اخبار میں اداریہ نویسوں کی تعداد اس سے بھی کہیں زیادہ ہو چکی ہے[1]۔

ہمارے اردو اخبارات میں اگرچہ اداریہ نویسوں کی تعداد

زیادہ نہیں ہوتی تاہم ہر اچھے اخبار میں دو یا تین افراد یہ فرض انجام دیتے ہیں ، اور اب شاید ہی کوئی ایسا اخبار ہو جس میں اڈیٹر خود اداریے لکھتا ہو ۔ بعض ایڈیٹر کبھی کبھی اداریے لکھتے ہیں اور بعض صرف انتظام کرتے ہیں اور اداریے نہیں لکھتے ۔

۴ ۔ اختصار

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے ، اب اداریے کے موضوعات تعداد میں زیادہ اور متنوع ہو گئے ہیں ۔ ادارتی صفحے پر مقالہ افتتاحیہ اور شذرات کے لیے جگہ متعین اور مخصوص کر دی گئی ہے ۔ اخبار کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس جگہ میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کی ترجمانی کی جا سکے ۔ یعنی مقالہ افتتاحیہ کے علاوہ شذرات کی گنجائش بھی نکل سکے ۔ مقررہ جگہ میں ایک مقالہ افتتاحیہ اور کئی شذرات اسی صورت میں آ سکتے ہیں جب وہ مختصر ہوں ۔ ویسے بھی اب بات کو پھیلا کر کہنے کا زمانہ گزر چکا ہے ۔ عام تحریروں میں بھی غیر ضروری باتوں اور انفاظ سے احتراز کیا جاتا ہے ، اداریوں میں تو بالخصوص اختصار کو ملحوظ رکھنے کا رجحان کارفرما ہے ۔ اب کم سے الفاظ میں مفہوم ادا کرنے اور تھوڑی سی جگہ میں مقالہ افتتاحیہ یا شذرہ لکھنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔

ایک زمانے میں اداریہ نویس تمہید ہی میں کئی صفحے سیاہ کر دیتا تھا اور اداریے عموماً قسط وار شائع ہوتے تھے ، مگر اب اس سے گریز کیا جاتا ہے ۔ اب اداریے میں لمبی چوڑی تمہید کے بغیر بات براہ راست کہی جاتی ہے اور وہ قسطوں میں نہیں بلکہ ایک مخصوص جگہ میں مختصراً شائع ہوتے ہیں ۔

۵ ۔ جذباتیت سے گریز

قدیم اداریے عموماً جذباتی ہوتے تھے ، مگر اب جذبات

کی جگہ منطق ، استدلال حقائق اور اعداد و شمار نے لے لی ہے ۔ مسائل کا تجزیہ استدلالی انداز میں کیا جاتا ہے ، اور ان کے لیے ایسے حل تجویز کیے جاتے ہیں جو عقل کو قبول ہوں ۔ یہ سائنس اور عقلیت کا زمانہ ہے ۔ اس زمانے میں جذباتی باتوں کے مقابلے میں عقلی باتیں زیادہ اثر رکھتی ہیں ۔ البتہ بعض مواقع پر اب بھی ایسے اداریے لکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے یا آسکتی ہے جن میں عقلیت و استدلال کی بجائے جذباتیت غالب ہو ۔ مثال کے طور پر ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ہمارے اخبارات نے جو اداریے لکھے ان میں جذباتیت غالب تھی کیونکہ وہ قوم کے فرزندوں میں حب وطن کا جذبہ ابھانے کا وقت تھا ۔ ایسا وقت ہر ملک و قوم پر آ سکتا ہے اور عقلیت کے اس زمانے میں بھی ایسے مرحلے آتے ہیں جب جذبات کو ابھارنا ایک ناگزیر ضرورت کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے ۔

۶ ۔ ذاتیات سے پرہیز

شخصی صحافت کے دور میں اخبارات میں باہمی کشمکش بھی ہوتی تھی اور ذاتی لڑائیاں بھی زور و شور سے لڑی جاتی تھیں ۔ اخبارات اپنے ادارتی کالموں میں نہ صرف ایک دوسرے کے خلاف لکھتے رہتے تھے ، بلکہ شخصیات کو ہدف تنقید بھی بنایا کرتے تھے ۔ اب شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے ۔ اب ادارتی کالموں کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ شخصیات کے معاملے میں بھی ذاتیات پر حملے سے پرہیز کیا جاتا ہے ۔ البتہ ادارتی صفحات پر چھپنے والے مزاحیہ کالموں میں چھیڑ چھاڑ جائز سمجھی جاتی ہے ۔

۷ ۔ تعمیری انداز

مذکورہ بالا امور کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ

اب اداریوں کا انداز تعمیری ہو چکا ہے ۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پہلے زمانے میں اداریوں کا انداز تخریبی ہوتا تھا ۔ فرق یہ ہے کہ ماضی میں ٹھنڈے دل سے غور و خوض اور عقل و استدلال سے بات کرنے کی بجائے زیادہ تر جوش اور جذبے سے کام لیا جاتا تھا ۔ یہ جوش و جذبہ کبھی انگریزوں کے خلاف ہوتا تھا ، کبھی متعصب ہندوؤں کے خلاف اور کبھی خود اپنوں کے خلاف جو اداریہ نویس کی نظر میں گمراہ یا خطا کار ہوتے تھے۔ ایسے مواقع پر تنقید تلخ اور لہجہ سخت ہوتا تھا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اداریہ نویس مخالف کیمپ پر پے در پے یلغار کر رہا ہے ، یا اپنوں کو جھنجھوڑ رہا ہے ۔ تنقید اب بھی کی جاتی ہے مگر اس کا مقصد بالعموم تعمیری اور اصلاحی ہوتا ہے ۔ اس سے نفرت و حقارت یا غصہ و غضب کی بجائے ہمدردی اور رہنمائی کا اظہار ہوتا ہے ، یعنی وہ مخالفت اور جھگڑے کی بجائے تجویز یا مشورے کا درجہ رکھتی ہے ۔

۸ ۔ وسیع تر ذمہ داری

پہلے اخبار عموماً بعض متعین مقاصد کی تکمیل کے لیے جاری کیے جاتے تھے اور اداریوں میں بھی انھی مخصوص مقاصد کو پیش نظر رکھا جاتا تھا ۔ یعنی کسی خاص گروہ یا مکتب فکر کا اخبار صرف اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے کوشاں رہتا تھا ۔ وہ مخالف یا غیر جانب دار گروہوں کے جذبات و احساسات کو ملحوظ نہیں رکھتا تھا ۔ اگرچہ اب بھی اخبارات کو ان کی پالیسیوں اور رجحانات کے مطابق تقسیم کیا جاتا ہے ، مثلاً دائیں بازو کا اخبار ، بائیں بازو کا اخبار ، اعتدال پسند اخبار ، دائیں بازو کا اعتدال پسند اخبار ، بائیں بازو کا اعتدال پسند اخبار ، اس کے باوجود بڑے اخبارات گروہی سطح سے بلند ہیں ، اور ان کے حلقۂ قارئین میں زندگی کے تمام شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگ

شامل ہوتے ہیں - اچھے اخبار خبروں پر اپنی پالیسی کو غالب نہیں آنے دیتے اور پالیسی کو صرف ادارتی صفحے تک محدود رکھتے ہیں ، بلکہ اب وہ اداریوں کو بھی اپنی مخصوص پالیسی تک محدود نہیں رکھتے ، بلکہ ان کو اپنے زیادہ سے زیادہ قارئین کا ترجمان بنانے کی کوشش کرتے ہیں - وسیع تر ذمہ داری کے اس احساس نے اداریوں کو متوازن ، متنوع اور غیر جانب دار بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے -

۹ - پرکشش میک اپ

اب ادارتی صفحے کو جاذب نظر بنانے کا رجحان بھی عام ہو رہا ہے - بہت سے اخبارات نے اس صفحے کے ''میک اپ'' کو پرکشش بنانا شروع کر دیا ہے - بڑے اور معیاری اخبارات نے اگرچہ ابھی تک اس صفحے کی متانت کو برقرار رکھا ہے ، مگر وہ بھی روایت اور جدید تقاضوں کے درمیان کشمکش کا شکار ہو چکے ہیں - اکثر اردو اخبارات نے ابھی تک ادارتی صفحات کو خبروں کے صفحات یا میگزین کے صفحات کی طرح کئی رنگوں میں پیش کرنا شروع نہیں کیا ، نہ اس صفحے پر تصویروں اور سرخیوں کو زیادہ جگہ دی جاتی ہے ، تاہم بعض اخبارات نے اس صفحے پر تصویریں ، کارٹون اور ہلکے پھلکے فیچر شائع کرنے شروع کر دیے ہیں - یہ فیچر نمایاں سرخیوں اور تصویروں کے ساتھ شائع کیے جاتے ہیں - یہ انداز ابھی عام نہیں ہوا مگر اس کا رجحان ضرور پیدا ہو چکا ہے -

۱۰ - عدالت اور منصف

قدیم '' ادارتی کالم '' قلعہ یا شاہی دربار کی حیثیت رکھتے تھے ، جہاں قلعہ دار یا بادشاہ کی مرضی کے مطابق فیصلے ہوتے تھے - اب ان کالموں نے عدالت کی حیثیت

اختیار کر لی ہے ۔ اس عدالت میں متنازعہ فیہ مسئلے کا ہر پہلو پیش نظر رہتا ہے اور فیصلہ تمام نقطۂ ہائے نگاہ کو ملحوظ رکھ کر کیا جاتا ہے ۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ پہلے اداریہ نویس ''وکیل'' ہوتا تھا اب وہ ''منصف'' بن گیا ہے ، اور منصف بھی ایسا جس کا مقصد ہر مسئلے پر فیصلہ صادر کرنا ہی نہیں بلکہ مصالحت کرانا اور ''تعمیری تجاویز'' پیش کرنا بھی ہے ۔ کوئی فیصلہ یا حکم دیتے وقت معاشرے کے مختلف حلقوں اور طبقات کے رجحانات ، خواہشات ، روایات ، خیالات اور مفادات اس کے پیش نظر رہتے ہیں اور اس کی آواز میں عوام الناس کی آواز شامل ہوتی ہے ۔

کیا ادارتی صفحے کی اہمیت کم ہو گئی ہے ؟

آج کل کے اخبارات میں خبروں کے صفحات اور ادارتی صفحات کے علاوہ بھی بہت سے صفحات ہوتے ہیں ۔ تمام بڑے اخبار ہفتے میں کئی کئی خصوصی اشاعتیں پیش کرتے ہیں ۔ مثلاً سنڈے ایڈیشن ، فلمی ایڈیشن ، ملی یا اسلامی اشاعت ، بچوں کا اخبار اور ٹیلیویژن ایڈیشن وغیرہ ۔ ان اشاعتوں میں زیادہ سے زیادہ معلوماتی مواد مہیا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ اخبارات ان کے علاوہ متعدد خصوصی اشاعتیں پیش کرتے ہیں ، مثلاً قومی رہنماؤں کی ولادت یا وفات کے یوم ، اہم قومی اور مذہبی دن اور اہم مقامی یا قومی تہوار کے موقع پر بھی خصوصی اشاعتیں پیش کی جاتی ہیں ۔ اس کے علاوہ اخبارات مختلف صنعتوں اور اداروں کے متعلق بھی خصوصی نمبر شائع کرتے رہتے ہیں جن کا دائرہ ''ریلوے'' ، ''پی ۔ آئی ۔ اے'' ، ''پنکھے بنانے کی صنعت'' اور 'ہوٹلوں کی صنعت' تک پھیلا ہوا ہے ۔ ان خصوصی اشاعتوں کا مقصد زیادہ سے زیادہ متنوع مواد شائع کر کے اخبار کا حلقۂ

اشاعت وسیع کرنا ہوتا ہے ۔ ان کے ذریعے قارئین مختلف صنعتوں اور کاروباری اداروں سے متعارف ہوتے ہیں اور اخباروں کو یہ بھی فائدہ پہنچتا ہے کہ انہیں معمول سے زیادہ اشتہارات مل جاتے ہیں ۔ ان خصوصی اشاعتوں کی تعداد میں روز افزوں اضافے کی وجہ سے خبروں کے صفحات بالعموم اور ادارتی صفحات بالخصوص دب گئے ہیں ۔ اب اخبارات نے ایک مستقل صنعت کی شکل اختیار کر لی ہے ۔ ان پر کاروباری رنگ غالب آ گیا ہے اور اب ان کے لیے تبلیغی اور اصلاحی مقاصد اولیت کا درجہ نہیں رکھتے ، اس لیے لامحالہ یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ اب اداریوں اور ادارتی صفحات کی اہمیت کم ہو گئی ہے ۔

پاکستان کے روز ناموں نے خصوصی اشاعتوں کا سلسلہ گذشتہ دس بارہ سال کے دوران میں شروع کیا ہے ۔ اس کی ایک اہم وجہ ۱۹۵۸ء میں مارشل لاء کا نفاذ بھی تھی جس کے بعد سیاسی سرگرمیاں ختم ہو گئیں اور صحافت کے مواد کا ایک اہم سرچشمہ (سیاست) بند ہو گیا ۔ ان حالات میں اخبارات کے لیے یہ ضروری ہو گیا کہ وہ اپنی اشاعتیں برقرار رکھنے اور ان میں اضافہ کرنے کی تدابیر اختیار کریں ۔ انھوں نے ایسا مواد شائع کرنے کی خاص طور پر کوشش کی جو زیادہ سے زیادہ قارئین کی دلچسپی کا سامان فراہم کرے ۔ اس کوشش میں کامیابی کے تناسب سے اخباروں کی اشاعت میں اضافہ بھی ہوا ۔ علاوہ ازیں اخبارات میں مقابلہ بھی شروع ہو گیا ہے اور ہر اخبار اپنا حلقۂ اشاعت وسیع کرنے کے لیے نہ صرف نئی نئی خصوصی اشاعتیں پیش کرنے لگا بلکہ طباعت اور میک اپ وغیرہ کو بہتر اور پرکشش بنانے پر بھی زور دینے لگا ۔

اخبارات کو باہمی مسابقت کے علاوہ اجتماعی طور پر رسائل و

جرائد سے بھی مقابلہ درپیش ہے - ڈائجسٹ قسم کے بعض رسالوں کی اشاعت کئی مؤقر روزناموں کی اشاعت سے بھی زیادہ ہے - چنانچہ روزنامے بھی اپنی خصوصی اشاعتوں میں اسی قسم کا مواد شائع کرنے لگے ہیں جیسا ان رسالوں میں ہوتا ہے - اس کے علاوہ ریڈیو اور ٹیلیویژن بھی اخباروں کے حریف بنتے جا رہے ہیں - ابلاغ کے ان ذرائع سے چونکہ تفریحی نوعیت کا زیادہ مواد نشر یا ٹیلی کاسٹ کیا جاتا ہے ، اس لیے اخبارات بھی ایسے مضامین اور فیچر شائع کرنے کی خاص طور پر کوشش کرتے ہیں جو قارئین کے لیے زیادہ سے زیادہ جاذب نظر بن سکیں - اس روش پر اگرچہ تمام اخبار گامزن نہیں ہیں اور بعض روزنامے اپنی پرانی روایات پر قائم رہنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں ، لیکن ایسے اخبارات بھی طباعت اور میک اپ وغیرہ کو بہتر اور پرکشش بنانے پر مجبور ہیں -

ہمارے یہاں اخبارات میں جو تبدیلیاں گذشتہ دس ، بارہ برس میں ہوئی ہیں وہ ترقی یافتہ ملکوں میں بہت پہلے رونما ہو چکی ہیں - وہاں جن اخبارات نے اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھا ہے وہ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں - بیشتر روزنامے مقبول عام اخبارات کی صف میں شامل ہو گئے ہیں - انہیں زیادہ سے زیادہ دلچسپ بنانے کی کوشش اس حقیقت کی مظہر ہے کہ سنجیدہ مواد کی مانگ کم ہو گئی ہے - اخبارات اس کوشش میں مصروف ہیں کہ وہ بیش از بیش افراد کو اپنے حلقۂ قارئین میں شامل کریں - اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ عام اور نسبتاً کم پڑھے لکھے لوگوں کی پسند بھی ملحوظ رکھی جائے - اس کا یہ ایک لازمی نتیجہ نکلا ہے کہ اداریے کو پہلی سی اہمیت اور مرکزیت حاصل نہیں رہی - یہ صورت حال پاکستان میں بھی پیدا ہو گئی ہے ، مثال کے طور پر :

* روزنامہ ''کوہستان'' نے ۱۹۵۹ء میں جمعرات کی

اشاعت ملی میں ادارتی صفحہ ختم کر دیا۔ یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔ اس اخبار کی ترتیب و اشاعت کے ذمہ دار افراد کا کہنا ہے کہ اس اثنا میں کسی قاری نے ادارتی صفحہ ختم کرنے پر احتجاج نہیں کیا، نہ کسی نے یہ کہا کہ ادارتی صفحے کے ذریعے ان کی جو رہنمائی کی جاتی ہے اس سے انہیں کیوں محروم کیا گیا؟

* ڈگری کالجوں کے اساتذہ کا شمار دانش ور طبقے میں ہوتا ہے، مگر ایک جائزے کے مطابق: ''لاہور کے ڈگری کالجوں کے صرف بارہ فیصد اساتذہ اداریے پڑھتے ہیں، حالانکہ ان کی اکثریت اخباروں کا مطالعہ کرتی ہے۲ ۔'' اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ملک کے دوسرے شہروں میں کالجوں کے کتنے اساتذہ اخبار کا اداریہ پڑھتے ہوں گے۔

* قانون ساز اداروں کے ارکان عوام کے ترجمان، باخبر اور باشعور ہوتے ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں اخبار بینی سے متعلق مغربی پاکستان اسمبلی کے ارکان کی عادات کا جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ ''اگرچہ ان کی غالب اکثریت اخبار پڑھنے کی عادی تھی مگر ان میں سے ''صرف ۳۴ فیصد ارکان اداریے پڑھتے تھے۔''۳ اور یہ ارکان بھی ایسے تھے جو نسبتاً معمر اور اعلٰی تعلیم یافتہ تھے۔

* اسی سال لاہور چھاؤنی میں مقیم فوجی افسروں کی اخبار بینی کی عادات کا بھی جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ ان کی غالب اکثریت اخبار کا مطالعہ کرتی ہے مگر ''صرف ۲۸ فیصد فوجی افسر اداریے پڑھتے ہیں''۴ ۔

* ان جائزوں کا دائرہ اگرچہ محدود تھا مگر ان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کالجوں کے اساتذہ، قانون ساز اداروں کے

ارکان اور فوجی افسروں کی اکثریت اخبار ضرور پڑھتی ہے ، البتہ ان میں اداریے پڑھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے ۔ یہ تینوں طبقے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور قائدانہ صلاحیتوں کے مالک ہیں ۔ اگر ان کی اکثریت بھی اداریہ نہ پڑھتی ہو تو ظاہر ہے کہ عام قارئین میں اداریے پڑھنے والوں کا تناسب اور بھی کم ہوگا ۔

* ولزلے (Wolseley) اور کیمپبل (Campbell) کے بیان کے مطابق ''صرف ۸۰۸ء۱ فیصد قارئین اداریے پڑھتے ہیں اور ۸۰۹ء۷ فیصد قارئین ادارتی صفحے پر محض سرسری نظر ڈالتے ہیں''[۵] ۔

''ابلاغ عام (Mass Communication) میں جن جائزوں کے نتائج جمع کیے گئے ہیں ، ان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اخباروں کے اداریوں ، مضامین اور دوسرے سنجیدہ مندرجات کا بہت کم قارئین مطالعہ کرتے ہیں''[۶] ۔

نیویارک ٹائمز کے ادارتی صفحے کے ایک سابق ایڈیٹر چارلس مرز (Merz) نے جنوری ۱۹۴۳ء میں 'ادارتی صفحہ' کے زیر عنوان ایک مضمون لکھا تھا جس کا خلاصہ یہ ہے :

''ایک دور ایسا بھی گزرا ہے جب اخبار کے تمام مندرجات میں ایڈیٹر کا ذاتی نقطہ نظر مترشح ہوتا تھا اور ادارتی صفحے میں تو وہ خوب گرجتا برستا تھا ، لیکن موجودہ دور میں اظہار رائے کو صرف ایک صفحے یعنی ادارتی صفحے تک محدود کر دیا گیا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اخبار میں دوسری تبدیلیاں رونما ہونے کے ساتھ ساتھ ادارتی صفحہ بھی بدل گیا ہے ۔ دور حاضر میں صرف زور بیان کی مدد سے قارئین کو قائل نہیں کیا جاتا ۔ اس دور کے ادارتی صفحات ایسے لوگ پڑھتے ہیں جو دنیا کے معاملات و مسائل سے زیادہ باخبر ہیں ۔ ماضی کے قارئین کا معاملہ مختلف تھا ، اب قارئین خود بھی غور و فکر کے عادی بن چکے ہیں ، اور اگر

اداری صفحے کے مندرجات مسلمہ و معروف نتائج کے حامل نہ ہوں تو قارئین ان کا اثر قبول نہیں کریں گے ۔ ابتدائی دور میں اداریوں پر ذاتی اور جذباتی رنگ غالب ہوتا تھا ۔ وہ بالعموم منطق و استدلال سے عاری ہوتے تھے ، لیکن ایسے اداریے موجودہ دور کے مصروف اور زیادہ باخبر قارئین کی تشفی نہیں کر سکتے ۔ ماضی کے اداریوں میں لفاظی زیادہ ہوتی تھی اور استدلال کا عنصر بہت کم ہوتا تھا ۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اب ایسے اداریے لکھنے والے لوگ نہیں رہے ، اصل صورت یہ ہے کہ اب اس قسم کے ''اداریے پڑھنے والے قارئین نہیں رہے ۔"

امریکی جرائد Des Moines Register اور Tribune کے ایڈیٹر اور انعام یافتہ اداریہ نگار ڈبلیو ، ویمیک نے ۱۹۴۱ء میں ''امریکی ایسوسی ایشن آف ٹیچرز آف جرنلزم" سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا :

''میری رائے میں فرقہ وارانہ نوعیت کے بلند آہنگ اداریوں کا زمانہ گزر چکا ہے ۔ اب اداری صفحے کی قدر و قیمت کم ہو گئی ہے ۔ بعض صورتوں میں انتہائی تعصب کے باعث اس کی اہمیت بالکل ہی ختم ہوگئی ہے ۔ ہمارے نمایاں اخبارات اب معیاری نہیں رہے ۔ وہ ہر سطح کے قارئین کے ذوق کی تسکین ضروری سمجھنے لگے ہیں ۔"

ایک اور صحافی کا خیال یہ ہے :

''اخبار کے دوسرے حصوں میں بلکہ اداری صفحے پر بھی اگرچہ ناموں کے ساتھ مضمون یا کالم شائع کرنے کا رواج عام ہو گیا ہے مگر اداریہ نویس گوشۂ گم نامی میں چلا گیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ گم نامی اسے اس مقام سے نیچے آنے پر

سزا کے طور پر ملی ہے جو اس کے نامور پیش روؤں کا طرۂ امتیاز تھا ۔''

''ادارتی صفحے پر اخباری کالم نگار کے اثرات ابھی متعین نہیں ہو سکے ، تاہم کالم نگار کی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا ہے ۔ اور اب وہ جو کردار ادا کر رہا ہے اس کا مقابلہ انیسویں صدی کے شخصی صحافی سے کیا جا سکتا ہے''۔

مرز (Merz) نے ۱۸۶۶ء میں ''North American Review'' میں لکھا تھا :

''ادارتی صفحے کا وقار ختم ہو چکا ہے ۔ بعض صحافی تو یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اداریوں کو بالکل ختم کرنے کا وقت آ گیا ہے اور صحافت کی تمام قوت عوام کو روزمرہ کے وقائع اور حقائق پیش کرنے پر صرف ہونی چاہیے ۔ لیکن ابھی یہ وقت نہیں آیا اور شاید کبھی نہ آئے ، لیکن صحافی بخوبی جانتے ہیں کہ اب اخبار کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار ادارتی صفحے پر نہیں ہے ۔ اب ان سے عوامی ذہن زیادہ ''متاثر'' نہیں ہوتے ۔ نہ بہت سے رائے دہندگان کے نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے ۔ اخبار کی قوت اور کامیابی کا تمام انحصار خبروں کے حصول اور انہیں پیش کرنے کی مہارت پر ہے ۔ اب خبر ہی رشک و رقابت کا باعث بن گئی ہے ۔ اب زیادہ لوگ خبروں ہی کے لیے اخبار خریدتے ہیں ۔ روزناموں کی قوت اور قدر و قیمت اب خبروں میں مضمر ہوتی ہے اور خبریں ہی ہر آزاد معاشرے میں اخبار کا مقام و مرتبہ متعین کرتی ہیں ۔''

'Baltimore Sun' کے اداریہ نگار ہنری ایل ۔ منکن (Henry L. Mencken) نے ۱۹۳۶ء میں ایسوسی ایٹڈ پریس کے سالانہ

ٹھہرانے میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا :

''اداراتی صفحہ ہماری سب سے بڑی اور سب سے نمایاں ناکامی ہے ۔ یہ صفحہ پہلے جو کردار ادا کرتا تھا وہ اب کالم نویس اور سب ایڈیٹر ادا کرتے ہیں ۔ اداریہ نگار جھاڑو سے سمندر کے پانی کو واپس دھکیلنے کی کوشش کر رہے ہیں ، اور ستم ظریفی یہ ہے کہ وہ دانستہ طور پر چھوٹے جھاڑو استعمال کر رہے ہیں ۔''

موجودہ اداریوں کے نقائص

مسوری (Missouri) یونیورسٹی میں صحافت کے استاد پروفیسر روزکو ایلرڈ (Roscoe Ellard) نے ۱۹۳۶ء میں امریکہ میں اداریہ لکھنے یا اداراتی صفحات کی نگرانی کرنے والوں کی آرا معلوم کی تھیں ۔ ان کا خلاصہ یہ ہے :

۱ ۔ اب اداریوں میں سطحیت ہوتی ہے ، تاریخی معلومات کم ہوتی ہیں ، واقعات کی توجیہ کسی مستحکم فلسفے کی بنیاد پر نہیں کی جاتی ، ادبیت اور اسلوب کی انفرادیت بھی ناپید ہوتی ہے ۔

۲ ۔ بہت سے اداریے بے جان ہوتے ہیں ۔ بہت سے اداریوں کا مقصد دولت کا حصول ہوتا ہے ۔ وہ بڑے محتاط انداز میں لکھے جاتے ہیں ۔ وہ بنیادی حقائق کی چھان بین سے عاری ہوتے ہیں اور ان میں منطقی تجزیہ مفقود ہوتا ہے ۔

۳ ۔ مؤثر تحریر کے لیے یقین کی قوت ضروری ہے لیکن اب یہ قوت ناپید ہے ۔ اب لوگوں کو قائل کرنے کی بجائے لعن طعن کی جاتی ہے ۔ اب احتیاط کے فقدان اور زود نویسی نے ایک معمول کی شکل اختیار کر لی ہے ۔

۴ ۔ موجودہ اداریوں میں سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ وہ

آزادی سے نہیں لکھے جاتے۔

۵ - اداریوں میں گہرائی نہیں ہوتی۔ ادبیت ، تاریخی شعور اور مزاح کی چاشنی بھی نہیں ہوتی۔

۶ - اب صحافت نے کاروبار کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اب ذہین اور آرزو مند نوجوان اس میں ملازم رکھے جاتے ہیں جو بزدل ، متعصب اور سست ہوتے ہیں۔

۷ - اداریے مطالعہ کر کے نہیں لکھے جاتے۔ وہ ناشرین کی ہدایت پر ایسے موضوعات کے بارے میں لکھے جاتے ہیں جو ادارتی تبصرے کے لیے موزوں نہیں ہوتے۔

۸ - اب اداریہ نویس کوئی مثبت کردار ادا نہیں کرتے۔ مطبوعات کے سلسلوں اور کاروباری مقاصد نے ان میں بزدلی یا ضرورت سے زیادہ احتیاط پیدا کر دی ہے۔

۹ - اب اداریے مالی مصلحتوں کے تحت بھی لکھے جاتے ہیں ، اس لیے ان میں لفاظی اور جانبداری کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

۱۰ - اب اداریے نفسیاتی اعتبار سے صحیح نہیں ہوتے۔

۱۱ - اب اداریے صداقت پر مبنی نہیں ہوتے بلکہ پالیسی کے مطابق ہوتے ہیں۔

اداریے کو مؤثر اور اخبار کی جان دار آواز بنانے کے سلسلے میں منکن (Menkin) نے اداریہ نویسوں کو مشورہ دیا تھا کہ :
''وہ خود کو اپنی شخصیتوں سمیت ظاہر کریں۔ موجودہ اداریہ گمنام آدمی کی آواز ہے۔''

Evanston News Index کے ایڈیٹر کرٹس ڈی میک ڈیوگل

(Curtis D. Mac Deugal) نے ۲۷ اپریل ۱۹۳۵ء کو "Editor and Publisher" میں لکھا تھا:

"قارئین کے نقطۂ نظر سے اداریوں کی حیثیت ٹیلیفون پر ہونے والی گفتگو کی سی ہے۔ قارئین گویا ٹیلیفون پر کسی گمنام آدمی سے بات چیت کرتے ہیں جو کبھی ان کو دھمکاتا اور کبھی شاباش دیتا ہے؛ لیکن قاری کا جواب سنے بغیر اور اپنے آپ کو ظاہر کیے بغیر ٹیلیفون بند کر دیتا ہے۔"

قارئین اس قسم کے گمنام اداریہ نگاروں سے اکتا چکے ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اداریوں کا اثر اور وقار پہلے جیسا نہیں رہا۔ اب لوگ کالم نویسوں اور مضمون نگاروں پر زیادہ انحصار کرتے ہیں۔

Donald F. Rose نے ۲۸ ستمبر ۱۹۲۸ء کو "Forum Magazine" میں لکھا تھا: "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ وعظ و تلقین تو گوارا کر لیتے ہیں لیکن وہ واعظ کا چہرہ بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ سامعین اس کی شخصیت کو بھی دیکھنے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ اچھے اداریہ نگار کو اجازت ہونی چاہیے کہ وہ خود کو ظاہر کرے۔

اداریوں کی اہمیت میں کمی کے اسباب

اس دور کے اداریوں پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں، اگرچہ وہ سب درست نہیں ہیں، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اب اداریوں کی اہمیت وہ نہیں رہی جو پہلے ہوتی تھی۔ اگر کسی اخبار کے ادارتی کالموں کو یکسر حذف کر دیا جائے تو شاید اخبار کی اشاعت زیادہ متاثر نہ ہو۔ اداریوں اور ادارتی صفحے کی اہمیت میں کمی کے محرکات اور اسباب کے سلسلے

میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے :

۱ - اب اداریہ نویسوں کی شخصیتیں نامور اور بلند پایہ نہیں ہوتیں - بیشتر صورتوں میں وہ بالکل گمنام رہ کر کام کرتے ہیں -

۲ - اب 'دستخطی' اداریے شائع کرنے کا رواج ختم ہوگیا ہے - مقالہ افتتاحیہ کے ساتھ اداریہ نویس کا نام شائع کرنے کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ اداریہ نویس کو ہمیشہ یہ احساس ہوتا رہتا تھا کہ اس کی شہرت اور نیک نامی کا دار و مدار اس کی تحریر کے معیار پر ہے ، اس لیے وہ ہر ممکن کوشش کرتا تھا کہ اداریے میں کوئی نقص یا سقم باقی نہ رہ جائے -

۳ - موجودہ دور میں اخبار کے اجرا کا مقصد کاروباری نہ ہو ، تب بھی اسے کاروباری بنیادوں پر چلانا ضروری ہے - کیوں کہ اب اخبار نکالنے کے لیے کثیر سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے - عام طور پر فرد واحد اخبار کے اخراجات کا متحمل نہیں ہو سکتا ، اس لیے اب زیادہ تر اخبارات لمیٹڈ کمپنیوں یا ٹرسٹ کی جانب سے شائع کیے جاتے ہیں - یہ ادارے منافع نہ کمائیں یا کم سے کم خود کفیل نہ ہوں تو اخبار کا زندہ رہنا مشکل ہو جاتا ہے ، اس لیے اب اداریہ نویس اخبار کے کاروباری پہلو کو بھی مدنظر رکھتا ہے اور بعض اوقات یہ پہلو آزادی اظہار پر اثرانداز ہوتا ہے -

۴ - اب چوں کہ اخبارات میں عام دلچسپی کا مواد زیادہ ہوتا ہے اور خبریں بھی زیادہ ہوتی ہیں ، اس لیے اداریوں کی ضرورت از خود کم ہو گئی ہے - اب بیشتر قارئین بھی اخبارات میں سنجیدہ مواد کی بجائے دلچسپ مواد کو زیادہ پسند کرتے ہیں -

۵ - اب اداریے میں یہ کوشش نہیں کی جاتی کہ قاری جذبات کی رو میں بہہ جائے بلکہ اس میں منطق و استدلال سے کام لیا جاتا

ہے جس کی وجہ سے وہ خشک معلوم ہونے لگا ہے اور اتنا مؤثر نہیں رہا جتنا پہلے ہوتا تھا ۔

افادیت ختم نہیں ہوئی

ادارتی صفحے کی اہمیت اب اگرچہ ایک حد تک کم ہو گئی ہے اور قارئین کی صرف ایک محدود تعداد اداریے پڑھتی ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ادارتی صفحہ اپنی افادیت سے بھی محروم ہو گیا ہے اور آئندہ یہ صفحہ کبھی اخبار کی روح ، اخبار کے ضمیر ، عوام کے ترجمان اور قارئین کے معلم کا درجہ حاصل نہیں کر سکے گا ۔ یہ بہت غنیمت ہے کہ کارواں کے دل سے احساس زیاں نہیں گیا ۔ اداریہ نویسوں ، دانشوروں اور ارباب فکر و نظر میں شدید احساس پایا جاتا ہے کہ اداریے کی ضرورت اور اہمیت میں کمی دور ہونی چاہیے اور اس کے لیے کوششیں بھی کی گئیں ۔ علاوہ ازیں اگر اداریے کے قارئین کم ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اداریے بے فائدہ یا بیکار ہو چکے ہیں ۔ مسٹر اے قیوم کا قول ہے کہ :
''اگرچہ اداریہ پڑھنے والوں کی تعداد تمام قارئین کے مقابلے میں کم ہوتی ہے لیکن معاشرے میں یہی تھوڑے سے لوگ مؤثر حیثیت رکھتے ہیں ۔ ان کا تعلق ارباب فکر یعنی ان طبقوں سے ہوتا ہے جو کسی حقیقت کی تہہ تک پہنچ کر اس کا مفہوم و مدعا سمجھتے ہیں ، واقعات کی چھان بین کرتے ہیں ، وہ سماجی مقصد کے لیے سماجی نظام پر غور کرتے ہیں ۔ رجحانات سمجھنے کے لیے واقعات کو سمجھتے ہیں اور اپنے فعل و عمل سے تاریخ پر اثر انداز ہوتے ہیں[۸] ۔''

اس کے علاوہ زمانے کے تغیرات کے ساتھ اداریے کے مقاصد ، نوعیت اور ہیئت میں بھی فرق پیدا ہو چکا ہے ۔ موجودہ دور کے اداریوں میں جن خامیوں کی نشاندہی کی جاتی ہے انہیں عصر حاضر

کے تقاضوں یا جدید رجحانات سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

ادارتی صفحہ کیسا ہونا چاہیے؟

اس سے قبل کہ اداریہ نویسی کے اصول بیان کیے جائیں، یہ بتانا مناسب ہوگا کہ ادارتی صفحہ کیسا ہونا چاہیے؟ اداریے اور ادارتی صفحے کی اہمیت میں کمی کے مسئلے اور اداریہ نویسی کے جدید رجحانات نے اس سوال کو اور بھی اہم بنا دیا ہے۔ اس سوال کے کئی رخ ہیں، یعنی اداریہ:

۱ - نظری و اصولی اعتبار سے کیسا ہونا چاہیے؟

۲ - ہیئت کے اعتبار سے کیسا ہونا چاہیے؟

۳ - زبان اور اسلوب کے اعتبار سے کیسا ہونا چاہیے؟

جہاں تک اداریے کی نظری اور اصولی حیثیت کا تعلق ہے، یہ سوال بھی ان سوالات کے زمرے میں آتا ہے جو تغیر زمانہ کے باعث زندگی کے ہر شعبے میں پیدا ہوئے ہیں اور پیدا ہو رہے ہیں۔ صحافت کا زندگی اور زمانے سے گہرا تعلق ہے، اس لیے اداریے کو بھی زندگی اور زمانے کے پس منظر ہی میں دیکھنا چاہیے۔ تغیرات زمانہ نے مذہبی، اخلاقی سماجی، معاشی غرض زندگی کی تمام قدروں کو متاثر کیا ہے۔ ایک عرصے سے ہر شعبۂ حیات میں قدیم و جدید کے درمیان کشمکش جاری ہے۔ پرانی قدریں مٹ رہی ہیں اور نئی قدریں ان کی جگہ لے رہی ہیں۔ کم و بیش ہر معاشرے میں ان کے متعلق تین نقطہ ہائے نظر موجود ہوتے ہیں:

۱ - جدید قدریں بے کار اور فضول ہیں؛ پرانی قدریں ہی صحیح اور بامقصد ہیں۔ انھیں ہر حال میں برقرار رکھنا چاہیے اس لیے نئی اقدار اور نئے رجحانات کے خلاف جنگ ضروری ہے۔

۲ - تبدیلی زمانے اور زندگی کا دستور ہے - پرانی قدریں فرسودہ ہو کر اپنی افادیت کھو چکی ہیں ، اس لیے نئے دور میں نئی اقدار اپنانے اور ہر نقش کہن کو مٹا دینے کی ضرورت ہے -"

۳ - یہ دونوں نقطہ ہائے نظر انتہا پسندانہ ہیں - صحیح اور معقول راستہ یہ ہے کہ قدیم اور جدید کے درمیان امتزاج پیدا کیا جائے - ہر پرانی قدر کو ترک کرنا اور ہر نئی قدر کو اپنانا ضروری نہیں ہے ، بلکہ دونوں میں توازن پیدا کرنے کی ضرورت ہے -"

ظاہر ہے کہ ان میں سے تیسری صورت سب سے زیادہ مناسب اور معقول ہے -

اداریہ نویسی کے سلسلے میں بھی تین نقطہ ہائے نظر موجود ہیں - پہلا نقطۂ نظر ان لوگوں کا ہے جو ان اصولوں کے حامی ہیں جو ابتدا میں متعین کیے گئے تھے - یہ لوگ نظری و فکری طور پر تغیرات زمانہ کے اثرات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں - دوسرا نقطۂ نظر ان لوگوں کا ہے جو اداریے اور ادارتی صفحے کو جدید ترین تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے حامی ہیں ، وہ اس صفحے اور اس کے مندرجات کی خصوصیت کی بجائے اس کی ظاہری شکل و صورت کو اہمیت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ادارتی صفحہ بھی پر کشش ، دلچسپ اور جاذب نظر ہونا چاہیے - تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو ان دونوں کی بجائے درمیان کی راہ پر چلنا چاہتے ہیں - ان کا کہنا ہے کہ ادارتی صفحے کی مقصدیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ اس صفحے کو پر کشش اور دلچسپ بنانا ضروری ہے - ذیل میں ان تینوں مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے بعض افراد کے نقطہ ہائے نظر پیش کیے جاتے ہیں :

پیولٹزر کے انعام یافتہ اداریہ نویس ہاڈنگ کارٹر (Hodding Carter) نے ۱۹۴۶ء میں لکھا تھا کہ: ''ہماری ادارتی پالیسی یہ رہی ہے کہ ہم ایسے مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کریں جن کا تعلق عوامی بہبود سے ہو، خواہ وہ معاملات کتنے ہی اختلافی کیوں نہ ہوں ۔ چونکہ ہمارے نزدیک ایڈیٹر کا کام یہ نہیں کہ وہ ہر دلعزیزی اور مقبولیت عامہ حاصل کرے ۔ اس لیے ہم نے کبھی یہ فکر نہیں کی کہ ہمارے تبصروں پر وہ لوگ چراغ پا ہو جائیں گے جو ہم سے متفق نہیں ہیں ۔ حقیقتاً ہم نے بیباکی سے اظہار رائے کرکے جن لوگوں کو اپنا دشمن بنا لیا ہے ہمیں ان پر بھی اتنا ہی فخر ہے جتنا ان دوستوں پر جو ہم سے متفق ہیں ۔''

ویمیک (Waymack) کا کہنا ہے: ''میرا یقین ہے کہ اخبار اس وقت بہترین خدمت سرانجام دیتا اور قارئین پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتا ہے جب اس کے ادارتی صفحے پر سوچ سمجھ کر عقلمندی سے انتخاب کردہ مختلف النوع ایسا توجیہی مواد دیا جائے جو تمام اہم مسائل کے بارے میں تمام نقطہ ہائے نظر پیش کر دے ۔ اگر اخبار کے اداریے اس معیار پر پورے نہ آتریں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں کوئی نقص باقی رہ گیا ہے اور ان کی اشاعت بے فائدہ ہے ۔ علاوہ ازیں میں اس بات کا بھی قائل ہوں کہ اس صفحے کو قارئین کے لیے مباحثے کی جگہ بنا کر اس خدمت کو مؤثر کیا جائے ۔ میرے یقین کے مطابق ریڈیو اور ابلاغ عام کے ایسے ہی دوسرے ذرائع کے مقابلے نے اخبارات کو ایسا کرنے پر مجبور کر دیا ہے ۔ اور یہ نہ صرف ہمارے اخبارات بلکہ ہمارے معاشرے کے لیے بھی ایک پسندیدہ صورت حال ہے ۔'' ۱۰

وازلے اور کیمبل کی رائے میں: ''اداریہ کے لیے یہ بات بنیادی اہمیت رکھتی ہے کہ اس کے ذریعے ایک ایسی شخصیت تخلیق کی جائے اور برقرار رکھی جائے جس کی آواز اخبار کی آواز ہو ۔ جو

اخبار کے ضمیر اور شعور کی مظہر ہو - جو ایسے کردار کا مظاہرہ کرے جس پر قارئین کو اعتماد ہو اور جس کا وہ احترام کریں"[۱۱] -

امریکی جریدہ American Mercury کے مطابق : "جو ایڈیٹر عوامی معاملات کے بارے میں ٹھوس اور غیر جانب دارانہ مؤقف اختیار کرتا ہے اور قارئین کی زندگیوں کو متاثر کرنے والے معاملات میں صحیح اور سچی بات کہتا ہے ، اسے قارئین کے خطوط سے اپنے اداریوں کی کامیابی کا ثبوت مل جاتا ہے -"[۱۲]

William Allen White کے مطابق : "صفحہ کو جاذب نظر اور خوبصورت بنانے کے طریقے قارئین کو بیوقوف نہیں بنا سکتے"[۱۳] -

امریکہ کی ایڈورٹائزنگ ریسرچ فاؤنڈیشن کی ایک تحقیق کے مطابق : "بہتر اخبارات کے اداریوں کا مطالعہ کرنے والے افراد سے متعلق ایک جائزے سے معلوم ہوا ہے کہ بعض اخبار ایسے ہیں جن کے قارئین میں سے صرف ۱۷ فیصد مرد اور ۹ فیصد خواتین ان کے اداریے پڑھتی ہیں - لیکن بعض اخبار ایسے بھی ہیں جن کے قارئین میں سے ۳۷ فیصد مرد اور ۱۵ فیصد خواتین ان کے اداریوں کا مطالعہ کرتی ہیں - اس کا مطلب یہ ہے کہ جو اخبار اپنے اداریوں میں واقعی مفید مواد پیش کرتے ہیں ان کے اداریے شوق سے پڑھے جاتے ہیں -"[۱۴]

یعنی ایک گروہ کے خیال میں اداریے ہی کو اخبار میں مرکزی اور بنیادی اہمیت حاصل ہونی چاہیے - اداریے میں قارئین کی ترجمانی ، ان کے حقوق کی حفاظت اور رائے عامہ کی تشکیل کے لیے جرأت ، بے خوفی اور دیانت داری سے کام لینے کی ضرورت ہے ، یعنی اسے 'رہنما' کا مقام حاصل ہونا چاہیے - یہ مقصد بدرجۂ اتم حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ پورے اداراتی صفحے کے

مندرجات ٹھوس اور فکر انگیز ہوں اور ان میں قارئین کی صحیح رہنمائی کی صلاحیت ہو ۔ خوبصورت میک اپ ، رنگین طباعت ، تصویروں اور جلی سرخیوں کے بل پر ادارتی صفحے کو پر کشش بنانا اخبار کے اصل مقصد کے منافی ہے ۔

جاذب نظر ہونا چاہیے یا نہیں؟

دوسرے گروہ کا نقطۂ نظر اس کے برعکس ہے ۔ ایک اداریہ نویس کا قول ہے کہ : ''عوام کی اکثریت منطق سے گھبراتی ہے ۔ ایسے لوگوں کو ان کے جذبات سے اپیل کرکے ہی متاثر کیا جا سکتا ہے ۔ اس اپیل کو مؤثر بنانے کے لیے لوگوں کے ذہن کو متاثر کرنا کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے تزئین کے فن سے مدد لی جاتی ہے ۔'' ۱۵ Arkansas Gazette کے مطابق : ''مشکل یہ ہے کہ اکثر لوگوں کو روشنی کی بجائے حرارت ہی سے زیادہ متاثر کیا جا سکتا ہے ۔''

اسی طرح کرٹس ڈی میکڈوگل (Curtis D. Mac Dougall) کا کہنا ہے کہ : ''قارئین گمنام اداریوں سے اکتا چکے ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اخبارات کے اداریوں میں کوئی اثر باقی نہیں رہا ۔ زیادہ لوگ کالم نگاروں اور رسالوں کے مضامین پر انحصار کرنے لگے ہیں ۔''

ڈانلڈ ایف روز (Donald F. Rose) نے ۱۹۲۸ء میں فورم میگزین (Forum Magazine) میں لکھا تھا : ''عوام وعظ سننے کو کافی نہیں سمجھتے، وعظ کرنے والے کی شکل بھی دیکھنا چاہتے ہیں ۔ سامعین شخصیت کی جھلک دیکھنا چاہتے ہیں ۔ اعلیٰ درجے کے اداریہ نگار کو اجازت ہونی چاہیے کہ وہ اپنی شخصیت کو ظاہر کر سکے ، تاکہ لوگ اس کی ڈھال کی مضبوطی اور اس کے بازوے شمشیر زن کی پھرتی کا اندازہ لگا سکیں ۔''

رابرٹ رانڈ (Robert Rand) نے تیس اخبارات کے ادارتی صفحات کا مطالعہ کرنے والوں کا جائزہ لے کر ۸ - اگست ۱۹۴۲ء کے Editor & Publisher میں لکھا تھا : ''کارٹون کے علاوہ ادارتی صفحے کی ظاہری ہیئت قاری کی دلچسپی کی کمی یا بیشی پر گہرا اثر ڈالتی ہے ۔ ادارتی صفحے پر نمایاں سرخیوں ، چوکھٹوں ، جلی عبارات اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کے استعمال کی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے ۔''

جان ای ۔ ایلن کا کہنا ہے کہ : ''جب اخبار کے ایک قاری کے پاس اخبار کے مطالعے کے لیے وقت کم ہو اور وہ صرف سرخیوں یا اہم خبروں یا دلچسپ فیچروں کے مطالعے پر ہی اکتفا کرتا ہو اور اداریوں میں اس کی دلچسپی کم ہو تو ادارتی صفحہ دیکھنے میں بھی بڑا پر کشش ہونا چاہیے ۔ یہ ضروری ہے کہ اسے اخبار کے عام صفحات کے مقابلے میں زیادہ جاذب نظر بنایا جائے اور یہ پڑھنے میں بھی آسان ہو ، یعنی اس صفحے کے میک اپ اور اس کی طباعت کو بھی بہتر اور پر کشش بنانا چاہیے ۔''

دوسرے گروہ کے نزدیک اداریے اور ادارتی صفحے کو پر کشش اور جاذب نظر بنانا ضروری ہے اور ایسا کرنے کی کوشش میں اگر اس کی معنویت برقرار نہ رہے تب بھی کوئی مضائقہ نہیں ۔

ظاہری و معنوی خوبصورتی کا امتزاج

تیسرے گروہ کا نقطۂ نظر ان دونوں کے بین بین ہے ، یعنی یہ گروہ اداریے اور ادارتی صفحے کی معنویت برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ اسے پر کشش اور جاذب نظر بنانے کا حامی ہے ۔

ڈبلیو ۔ ڈبلیو ۔ وہمیک کا کہنا ہے : ''مجھے یقین ہے کہ ادارتی صفحوں کو پر کشش بنانے اور ان کو زیادہ لوگوں پر اثر انداز

ہونے کے قابل بنانے کے لیے متانت یا کسی اور خوبی کو قربان کیے بغیر بھی بہت کچھ کیا جا سکتا ہے ، البتہ اس کے لیے ذہانت کے علاوہ یہ خصوصیت بھی ضروری ہے کہ ادارتی صفحے کا مواد پیش کرنے کے سلسلے میں لکیر کا فقیر بننے سے گریز کیا جائے۔"

ایک اور ماہر کا کہنا ہے کہ :

"آرٹ کو محتاط رہ کر کثرت کے ساتھ استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے ۔ ادارتی صفحے کو جاذب نظر اور دلچسپ بنانے کے جو ذرائع میسر ہیں انھیں کیوں نہ کام میں لایا جائے ؟ نقشے، کارٹون اور تصویریں سلیقے سے کیوں نہ استعمال کی جائیں ؟ ۔ ۔ ۔ اخبار کو اگر کئی رنگوں میں طبع کرنے کی سہولت میسر ہے اور اگر اس سے صفحے کو پرکشش اور موثر بنایا جا سکتا ہے تو اس کے استعمال میں کیا قباحت ہے ؟ ہر اداریہ آخر روائتی نثری انداز ہی میں کیوں لکھا جائے ؟ کیا یہ موزوں نہیں کہ کسی ادارتی نکتے کو زیادہ مؤثر اور پرکشش بنانے کے لیے سوال جواب کا انداز اختیار کیا جائے ؟ کیا باپ کبھی کبھی بیٹے سے مشفقانہ مگر غیر روائتی انداز میں بات نہیں کر سکتا ؟ یا پرانی نسل نئی نسل سے اس انداز میں تبادلۂ خیالات نہیں کر سکتی[۱۶] ؟"

سوالات

۱ ۔ اداریوں کی مقصدیت ، نوعیت اور ہیئت میں تبدیلی کے محرکات بیان کیجیے ۔

۲ ۔ پرانے دور کے اخبارات کے اداریوں کا موجودہ دور کے اداریوں سے موازنہ کیجیے ۔

۳ ۔ اداریہ نویسی کے جدید رجحانات پر روشنی ڈالیے اور ان کے محرکات بیان کیجیے ۔

۴ - آپ کے خیال میں پرانے اخبارات کے اداریے زیادہ بامقصد اور مفید ہوتے تھے یا آج کل کے اخبارات کے اداریے ؟ دلائل سے واضح کیجیے -

۵ - ''اب اداریہ نویسی میں بھی تخصیص کار راہ پا چکی ہے -'' تبصرہ کیجیے ؟

۶ - ''آج کل کے اخبارات میں اداریوں کا انداز تعمیری ہوتا ہے -'' بحث کیجیے -

۷ - آپ کو اس رائے سے اتفاق ہے یا اختلاف کہ ''اب ادارتی صفحے کی اہمیت ختم ہو گئی ہے ؟'' مدلل جواب دیجیے -

۸ - آپ کے نزدیک اداریے اور ادارتی صفحے کی اہمیت کم ہونے کے اسباب کون کون سے ہیں ؟

۹ - آج کل کے اداریوں کی خامیوں پر روشنی ڈالیے -

۱۰ - شخصی اداریہ نویسی اور غیر شخصی اداریہ نویسی کا فرق بیان کیجیے -

۱۱ - آپ کے خیال میں موجودہ اردو اخبارات کے ادارتی صفحات میں کن تبدیلیوں کی ضرورت ہے ؟

۱۲ - ایک اچھے اخبار کا ادارتی صفحہ کیسا ہونا چاہیے ؟

۱۳ - ادارتی صفحہ سنجیدہ اور متین ہونا چاہیے یا اس کا میک اپ خوبصورت ہونا چاہیے ؟

۱۴ - ادارتی صفحے کو خوبصورت بنانے کے حامی کیا دلائل دیتے ہیں ؟

حوالہ جات

1 - Bird and Merwin "The Newspaper and Society", New-York 1946, Prince Hall Inc. p. 316.

2 - "Impact of Newspapers on Male - Degree - College's Teachers of Lahore." (Research Report submitted to P.U. 1967) by Syed Yousaf Imam—p. 18.

3 - "Newspaper Reading Habits of West Pakistan M.P.As. (Research Report submitted to P.U. 1967) by Nazar Rabb, Chapter 'conclusions'.

4 - "Newspaper Reading Habits of Army Officers Stationed at Lahore Cantt." (Research Report snbmitted to P.U. 1967) by Muhammad Bashir Kiani—p. 11.

5 - "Exploring Journalism" p. 244.

6 - "Wilber Schramm, "The Process and Effects of Mass Communication."

7 - Editor and Editorial Writer" p. 23.

8 - The Working Journalist" p. 116.

9 - Editor and Editorial Writer", p. 1

10 - Ibid p. 6.

11 - Exploring Journalism", p. 248.

12 - "Editor and Editorial Writer," p. 28.

13 - Ibid p. 30.

14 - Ibid p. 28.

15 - Ibid.

16 - "Editor and Publisher," April 27, 1935.

تیسرا باب

اداریہ نویسی کے اصول

اداریہ نویسی کے لیے ضروری اوصاف

اداریہ نویس کے عملی کام کے سلسلے میں سب سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اداریہ نویس کا کن اوصاف سے بہرہ ور ہونا ضروری ہے۔ اداریہ نویس یا ایڈیٹر کو ایک اخباری ادارے میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ ادارتی کالموں میں وہ جس رائے کا اظہار کرتا ہے اسے اخبار کی رائے سمجھا جاتا ہے اور اس کی تحریر کی بنا پر ادارتی صفحے کو اخبار کی روح قرار دیا جاتا ہے۔ اداریہ اخبار کے پورے حلقۂ قارئین کا ترجمان سمجھا جاتا ہے۔ اداریہ نویس کے خیالات، تجویزوں اور تبصروں کا ملک کی سیاست اور زندگی کے دوسرے شعبوں پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ وہ عوامی خواہشات و رجحانات کی ترجمانی کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے قارئین کو فکر و نظر کی روشنی بھی دیتا ہے، یعنی اس کی تحریر سے قارئین رہنمائی کی توقع بھی کرتے ہیں۔ اپنے فرائض سے بہ حسن و خوبی عہدہ برآ ہونے کے لیے ایک اداریہ نویس میں جو اوصاف ضروری ہیں وہ یہ ہیں:

۱ - زبان و بیان پر عبور

کسی زمانے میں ایڈیٹر کی نمایاں ترین خصوصیت یہ سمجھی جاتی تھی کہ انداز بیان پر شکوہ اور بلند آہنگ ہو - تحریر کی روانی اور اسلوب کی شدت قارئین کو اپنے ساتھ بہا لے جائے - پرانے زمانے کے اداریے میں ذہن سے زیادہ جذبات سے اپیل کی جاتی تھی اور اداریہ نگار اپنی کامیابی کے لیے زبان پر قدرت اور انداز بیان کی دلکشی کے مرہون منت ہوتے تھے -

دور جدید کے اداریوں میں مسجع و مقفٰی عبارت استعمال نہیں کی جاتی اور جذبات سے اپیل کرنے کے لیے رنگینیٔ بیان کے جوہر نہیں دکھائے جاتے - اس کے باوجود دلائل و براہین پر مبنی خیالات کے مؤثر اور صحیح اظہار کے لیے بھی زبان و بیان پر مکمل عبور ضروری ہے - جدید اداریوں میں زبان کا چٹخارہ نہیں ہوتا ، لیکن اداریوں کو فکر انگیز ، معلومات افزا ، مؤثر ، معقول اور مدلل بنانے کے لیے زبان کی روانی ، الفاظ کا موزوں انتخاب ، ان کا بر محل استعمال اور ان کی صحیح دروبست آج بھی بے حد ضروری ہے - اپنا مؤقف اور اپنے خیالات و افکار مؤثر طور پر پیش کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اداریہ نویس زبان پر پوری قدرت رکھتا ہو اور اسے ہر طرح کے اظہار و بیان پر مکمل عبور حاصل ہو تاکہ وہ پوری وضاحت اور روانی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کر سکے -

۲ - منطقی ذہن

پرانے زمانے کے اداریہ نویسوں کا منطق و استدلال سے کام لینا ہمیشہ ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا - لیکن آج کے

سائنسی دور میں ہر بات حقائق کی روشنی میں اور دلائل و براہین کے ساتھ بیان کی جاتی ہے۔ اس دور کے قارئین جذبات میں بہنے کی بجائے ہر معاملے کو عقل و استدلال کی کسوٹی پر پرکھنے کے قائل ہیں۔ انہیں متاثر یا آمادۂ عمل کرنے کے لیے اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ہر بات منطقی اصولوں کے مطابق کی جائے۔ یوں تو پر زور اور ولولہ انگیز تحریر آج بھی قارئین کے جذبات میں اشتعال پیدا کر کے انہیں وقتی طور پر اپنے ساتھ بہا لے جاتی ہے، لیکن ہر مسئلے کو حقائق کی روشنی میں دیکھنا اور عقل و شعور کی مدد سے فیصلہ کرنا دور جدید کے انسان کی نمایاں ترین خصوصیت ہے، اس لیے تحریر کو مؤثر اور دل نشین بنانے کی غرض سے یہ ضروری ہے کہ اس کی بنیاد منطق اور معقولیت پر ہو۔ زیادہ سے زیادہ قارئین کو زیادہ سے زیادہ متاثر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اداریہ نویس منطقی ذہن کا مالک ہو اور اداریے کو مؤثر بنانے کے لیے اپنے مؤقف کے حق میں معقول اور وزنی دلائل پیش کر سکتا ہو، تاکہ بعد میں اگر اس کے قارئین مخالف خیالات یا متضاد نظریات کا مطالعہ کریں تب بھی اداریے کے اثرات زائل نہ ہونے پائیں۔

٣ - انسانی نفسیات سے آگاہی

مواصلات اور نقل و حمل کے ذرائع کی ترقی کے ساتھ ابلاغ عام کے ذرائع کی ترقی کی بدولت اب یہ بہت آسان ہو گیا ہے کہ انتہائی کم وقت میں زیادہ سے زیادہ لوگوں تک رسائی حاصل کی جا سکے۔ پروپیگنڈے اور پبلسٹی نے ایک ناگزیر ضرورت اور مستقل فن کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ مختلف متحارب قوتیں مختلف ذرائع سے ابلاغ عام کے عمل میں مسلسل مصروف ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ قارئین،

سامعین اور ناظرین کو اپنی جانب سب سے زیادہ متوجہ کرے۔ لیکن آج کا انسان مصروف بھی بہت رہتا ہے ۔ اس کے پاس ابلاغ عام کے ان تمام ذرائع کی طرف توجہ کرنے کا وقت نہیں ہے۔ چنانچہ وہ سننے یا پڑھنے کے لیے صرف وہی چیزیں منتخب کرتا ہے جن میں اس کے لیے سب سے زیادہ کشش اور جاذبیت ہو ، جو اس کے ذہن کو اپیل کرتی ہوں اور اس کی ضروریات و حالات سے ہم آہنگ ہوں ۔

ان حالات میں یہ ازحد ضروری ہے کہ اداریہ نویس انسانی نفسیات کو بہت اچھی طرح سمجھتا ہو ۔ موجودہ دور میں نفسیات کے علم نے بھی حیرت انگیز ترقی کی ہے اور ماہرین نفسیات نے ایسے سائنسی قاعدے وضع کر لیے ہیں جن کی مدد سے قارئین کے ذہن کو نہایت کامیابی کے ساتھ متاثر کیا جا سکتا ہے ۔ نظریاتی کشمکش کے موجودہ دور میں ایک کامیاب اداریہ نویس کے لیے ضروری ہے کہ وہ انسانی نفسیات سے پوری طرح آگاہ ہو ۔ اسے یہ علم ہو کہ مخصوص ماحول اور حالات میں مختلف لوگوں کا ذہنی رد عمل کیا ہوتا ہے ۔ مختلف صورتوں میں انسانی ذہن کس طرح عمل کرتا ہے ، کیسے حالات مؤثر ابلاغ میں معاون ہوتے ہیں اور ذہن پر دیرپا اثر ڈالنے کے لیے مختلف صورتوں میں کون سے طریقے کارگر ثابت ہوتے ہیں ۔

ایک اچھے اداریہ نویس کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ کن حالات میں کون سی نفسیاتی رکاوٹیں مؤثر ابلاغ کی راہ میں حائل ہوتی ہیں ، انہیں کیسے دور کیا جا سکتا ہے اور ان کی موجودگی میں تحریر یا پیغام کو مؤثر بنانے کے لیے کون سی دوسری راہیں اختیار کی جا سکتی ہیں ۔

۴ ۔ غور و فکر کی صلاحیت

اداریہ نویس کا فرض حالات و واقعات کی تشریح و توضیح کرکے

مختلف مسائل پر قارئین کو دعوتِ فکر دینے تک محدود نہیں ہے ؛ زندگی میں بے شمار ایسے موڑ آتے ہیں جہاں اداریہ نویس آگے بڑھ کر قارئین کی فکری رہنمائی بھی کرتا ہے لیکن وہ صحیح رہنمائی کا مشکل اور نازک فریضہ اسی وقت انجام دے سکتا ہے جب اداریہ نویس خود اعلیٰ فکری صلاحیتوں کا مالک ہو ۔ وہ چشم بینا اور قلب حساس کی نعمت سے مالا مال ہو ۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ حالات اور واقعات کے ظاہری محرکات کو سمجھنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ ان کی تہ تک بھی پہنچ سکتا ہو ۔ کھرے اور کھوٹے میں تمیز کر سکتا ہو اور بنے بنائے نظریات و تصورات کو آنکھ بند کر کے قبول کر لینے کی بجائے اپنے علم ، اپنی بالغ نظری اور ذہنی صلاحیتوں کی بدولت ہر معاملے میں خود اپنی جچی تلی رائے رکھتا ہو ۔ اسی صورت میں اس کے اداریوں میں جدت ، ندرت ، انفرادیت اور اثر آفرینی پیدا ہو سکتی ہے ۔ ڈھلے ڈھلائے خیالات اور سنے سنائے افکار و نظریات پر ہر بات کو منطبق کرنے کی کوشش کرنا اور خود اپنی کوئی فکر یا رائے نہ رکھنا اداریہ نویس کا سب سے بڑا نقص ہے ۔

۵ - رہنمائی کا جذبہ

ایک اداریہ نویس کے لیے صرف اصابت رائے اور مختلف موضوعات و مسائل پر غور و فکر کی صلاحیت ہی کافی نہیں ہے ، اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ فکر و تدبر سے کام لے کر حقائق کی تہ تک پہنچنے اور واقعات کے مضمرات کو سمجھنے کی کوشش کرے ۔ اس میں یہ صلاحیت ہونی چاہیے کہ وہ عقل و شعور کی روشنی سے اپنے قارئین کے ذہن کو منور کرے ۔ حالات پر محض تبصرہ کرنے کی بجائے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے خون جگر سے فکر کے چراغ جلائے اور اندھیرے میں بھٹکنے والے لوگوں کو صحیح راستہ

دکھانے کے جذبے سے سرشار ہو ۔

۶ ۔ متوازن شخصیت

مختلف مسائل ، مکاتب فکر اور حکومت کی پالیسیوں پر تبصرے اور اظہار خیال کے وقت اداریہ نویس کو ایک منصف اور ثالث کی حیثیت حاصل ہوتی ہے ۔ اس کے تبصرے اور فیصلے دور رس نتائج کے حامل ہوتے ہیں ۔ انہیں صرف ایک شخص کی رائے نہیں سمجھا جاتا بلکہ یہ رائے ایک ادارے بلکہ عوام کی رائے سمجھی جاتی ہے ۔ اگر اداریہ نویس انتہا پسند یا تند مزاج ہوگا تو وہ عوام کے رجحانات کو سمجھنے اور حقیقی معنوں میں رائے عامہ کا ترجمان بنانے میں ناکام رہے گا ۔ انتہا پسندی کسی معاملے میں مناسب نہیں ہوتی ۔ اس کی وجہ سے بعض اوقات ایسی مشکلیں اور الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ انہیں سلجھانا قریب قریب ناممکن ہو جاتا ہے ۔

بعض اوقات یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اداریہ نویس کسی معمولی سے واقعے ، کسی غیر اہم فرد واحد کے بیان یا کسی ایک قاری کے مراسلے کی اشاعت پر جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے اور معاملے کی اہمیت یا نوعیت کو سمجھے بغیر تند و تیز لہجے میں اداریہ لکھ دیتا ہے ۔ لیکن اس کی اشاعت کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ خبر ، بیان یا مراسلے کی کوئی حقیقت ہی نہیں تھی ۔ اس طرح کے اداریوں سے نہ صرف ادارتی کالم بلکہ پورے اخبار کی ساکھ کو نقصان پہنچتا ہے ۔

اداریہ نویس کو اکثر اوقات کئی اطراف سے دباؤ کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ اخبار (یا جماعتی اخبار ہونے کی صورت میں جماعت) کی پالیسی کا خیال رکھنا ہوتا ہے ۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی

ضروری ہے کہ اداریہ صحافت کے اعلیٰ مقاصد کی نفی نہ کرے۔ اس پر مختلف گروہوں اور طبقوں کی طرف سے بھی دباؤ پڑتا ہے۔ مثلاً مزدوروں اور آجروں کے تنازعہ کی صورت میں مزدوروں یا ان کی تنظیموں کی طرف سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ اداریہ نویس ان کے مؤقف کی حمایت کرے۔ آجر اپنے نقطہ نظر کی تائید کروانے کے لیے دباؤ ڈالتے ہیں، اور اگر آجر اخبار کو اشتہار بھی دیتے ہوں تو ان کا دباؤ اور بھی زیادہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اداریہ نویس کو ایسی صورت نکالنی پڑتی ہے کہ اصول بھی مجروح نہ ہوں اور متعلقہ طبقے بھی مشتعل نہ ہوں۔ ایسے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ٹھنڈے دل و دماغ، متوازن شخصیت، ضبط و تحمل اور زبان و بیان پر قدرت کی ضرورت ہوتی ہے۔

اداریہ نویس کے لیے ضروری ہے کہ کسی موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے اس کے تمام پہلوؤں پر اچھی طرح غور و خوض کرے۔ اسے اتنا متوازن، معاملہ فہم اور دور اندیش ہونا چاہیے کہ کسی مطالبے، کسی واقعے، کسی تجویز یا کسی نقطہ نظر پر تبصرہ کرنے میں جلد بازی سے کام نہ لے، اور اپنے جذبات کی رو میں نہ بہہ جائے، بلکہ موضوع کی اہمیت اور نوعیت کے مطابق اس پر اچھی طرح غور کرے، پس منظر کا مطالعہ کرے اور تمام مضمرات کو سمجھنے اور غور و فکر کرنے کے بعد کوئی حتمی رائے قائم کرے۔ اسے ہر لمحہ اپنی ذمہ داری اور اپنے فرائض کی نزاکت کا احساس ہونا چاہیے۔ اسے کبھی وقار اور متانت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اس طرح وہ جو کچھ لکھے گا وہ واضح حقائق اور ٹھوس دلائل پر مبنی ہوگا۔ اس کی، حمایت میں اثر اور 'مخالفت' میں وزن ہوگا۔ اس کی تائید اور مخالفت دونوں کو قدر کی نظروں سے دیکھا جائے گا اور لوگ اس کے دلائل کو سند کے طور پر پیش کریں گے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اعتدال پسندی ، ضبط و تحمل اور حقیقت پسندی اداریہ نویس کے اہم اوصاف ہیں -

۷ - قوت فیصلہ

اداریہ نویس ایک ایسا جج ہوتا ہے جس کی عدالت میں استغاثہ اور صفائی کے وکیل پیش نہیں ہوتے - اس لیے اسے دونوں طرف کے دلائل سنے بغیر محض اپنی تحقیق و تجزیہ کی بنیاد پر فیصلے کرنے پڑتے ہیں - اس کے لیے اسے تمام حقائق اور قانونی جواز بھی خود ہی مہیا کرنا ہوتے ہیں - اس کے علاوہ ایک جج کا فیصلہ عموماً فرد واحد یا چند افراد پر اثر انداز ہوتا ہے لیکن اداریہ نویس کے فیصلوں سے پوری قوم کی تقدیر متاثر ہو سکتی ہے ، اس لیے یہ ضروری ہے کہ اداریہ نویس میں صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہو -

اداریہ نویس کا ہاتھ ہمیشہ وقت کی نبض پر رہنا چاہیے اور اسے اس قابل ہونا چاہیے کہ وقت ضائع کیے بغیر وہ ہر معاملے میں صحیح فیصلے پر پہنچ سکے - اداریہ نویس میں یہ خوبی بھی ہونی چاہیے کہ کسی واقعے یا مسئلے پر تبصرہ کرتے وقت اس کا ذہن بالکل واضح ہو - تحریر شروع کرنے سے پہلے ہی اس کے ذہن میں اداریے کا پورا خاکہ موجود ہو اور اسے معلوم ہو کہ مسئلے کے کن پہلوؤں پر کس زاویے سے اظہار خیال کرنے کے بعد اسے کس فیصلے پر پہنچنا ہے -

اداریہ نویس کی قوت تمیز بھی اداریے کی معنویت اور اہمیت پر گہرا اثر ڈالتی ہے - اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر روز واقعات کی تقابلی اہمیت کے مطابق فیصلہ کرے کہ اسے کس

مسئلے یا خبر کو اداریے اور شذرات کا موضوع بنانا چاہیے ۔ اس کے بغیر اداریے اور شذرات میں وزن پیدا نہیں ہوتا ، نہ ان کا مطالعہ دلچسپی سے کیا جاتا ہے ۔ موضوع کا انتخاب ، اس کے بارے میں کوئی خاص رائے ظاہر کرنے کا فیصلہ ، دلائل کی نوعیت اور انداز تحریر ، یہ تمام باتیں ایسی ہیں جن کے متعلق صحیح اور فوری فیصلہ ضروری ہے ۔

۸ - مطالعے کی وسعت

اخبارات کے دفتر میں اگرچہ مختلف موضوعات کے متعلق حوالے کی کتابیں اور دوسری ضروری مطبوعات موجود ہوتی ہیں ، لیکن جو اداریہ نویس محض حوالے کی کتب پر انحصار کرتا ہے اور زیر بحث موضوع پر گہری نظر نہیں رکھتا ، اس کے اداریے کبھی مؤثر اور دلنشیں نہیں ہو سکتے ۔ جن

اداریوں میں غیر متعلق معلومات اور غیر مربوط اعداد و شمار کی بھرمار ہوتی ہے ، وہ قاری کو متاثر کرنے میں ناکام رہتے ہیں ۔ معلومات یا اعداد و شمار سے اداریہ نویس کی محض واقفیت کافی نہیں ہوتی ، اس میں ان کے موزوں استعمال کا سلیقہ بھی ہونا چاہیے ۔ اس کے برعکس جن اداریہ نویسوں کا مطالعہ وسیع ہوتا ہے ، جو زیر بحث موضوع کے عوامل اور مضمرات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں ، جو صرف اپنی قابلیت کا رعب ڈالنے کے لیے اعداد و شمار استعمال نہیں کرتے بلکہ ان سے دلائل اور نقطۂ نظر میں وزن پیدا کرتے ہیں ، ان کی تحریر میں زور اور اثر پیدا ہو جاتا ہے ۔ اپنے علم اور مطالعے کے باوصف کسی موقع پر اداریہ نویس اگر صحیح اعداد و شمار ، کوئی نام یا دوسری باتیں بھول جائے تو حوالے کی کتابوں سے مدد لی جا سکتی ہے ۔

اداریہ نویس کا مطالعہ وسیع ہونا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اسے زندگی کے قریب قریب ہر شعبے اور ہر مسئلے پر اظہار خیال کرنا ہوتا ہے۔ مؤثر اور مدلل اداریہ لکھنا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک اداریہ نویس زیر بحث موضوع کے ہر پہلو کے متعلق وسیع معلومات نہ رکھتا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ فرد واحد کے لیے تمام علوم و فنون پر عبور حاصل کرنا ممکن نہیں ہے، تاہم ایک اچھے اداریہ نویس کے لیے ضروری ہے کہ وہ تمام علوم اور نظریات کا کچھ نہ کچھ مطالعہ رکھتا ہو۔

۹ - رپورٹر ہونا چاہیے

اداریہ نویس کے لیے ضروری ہے کہ اس میں ایک اچھے رپورٹر کی تمام اہم خصوصیات بھی موجود ہوں۔ اداریہ نویس اخبارات یا گرد و پیش سے اسی طرح اداریے کا موضوع تلاش کرتا ہے جس طرح کوئی رپورٹر خبریں تلاش کرتا ہے۔ جس طرح رپورٹر کی خبر تازہ ہونی چاہیے، اسی طرح اداریہ بھی تازہ ہونا چاہیے۔ اداریہ نویس حقائق، واقعات یا معلومات جمع کرتا ہے۔ مطالعہ اور غور و خوض کرتا ہے، واقعات و حالات کا تجزیہ کرتا ہے اور پھر ان کو ایک مربوط اور مؤثر صورت میں پیش کر دیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اداریہ نویسی کے تین مرحلے ہوتے ہیں: موضوع کی تلاش، غور و خوض اور اداریہ لکھنا۔ گویا پہلے مرحلے میں اداریہ نویس اسی طرح کا کام کرتا ہے جس طرح رپورٹر انجام دیتا ہے۔ اس کے بعد اداریہ نویس کا کام رپورٹر سے مختلف ہو جاتا ہے۔ وہ حقائق اور واقعات کا تجزیہ کرتا ہے، غور و خوض کرتا ہے اور سب سے آخر میں اپنا فیصلہ دیتا اور قارئین کی رہنمائی کرتا ہے۔

۱۰ - اقوام اور شخصیات سے واقفیت

اداریہ نویس کو مختلف ملکوں کے حالات اور اہم شخصیتوں سے بھی واقف ہونا چاہیے ۔ دنیا کے مختلف ملکوں اور علاقوں کی تہذیب ، ثقافت ، سیاسی ، اقتصادی حالات اور اہم شخصیات سے واقفیت کے علاوہ اسے اپنے ملک کی تمام اہم شخصیتوں اور ان کے سیاسی افکار و نظریات سے بھی باخبر ہونا چاہیے تاکہ اداریہ لکھتے وقت اگر کسی قوم ، ملک یا شخصیت کا ذکر آئے تو اداریہ نویس اس کے تہذیبی ثقافتی ، جغرافیائی ، سیاسی اور اخلاقی پس منظر سے بخوبی واقف ہو ۔ ان معلومات کی روشنی میں اس قوم یا شخص کے کسی نئے فیصلے ، کسی نئے اقدام یا نئے بیان کی اہمیت اور اس کے امکانی نتائج کا صحیح تجزیہ آسان ہوگا ، اداریہ نویس صحیح رائے قائم کرسکے گا اور اداریے میں اگر کوئی فیصلہ کرے گا یا مشورہ دے گا تو اس میں غلطی کا امکان کم سے کم ہوگا ۔

۱۱ - انسانی ہمدردی

صحیح افکار و نظریات ہمیشہ اس وقت سامنے آتے ہیں جب کوئی شخص انسانی ہمدردی اور ابن آدم کی مجموعی فلاح و بہبود کے جذبے سے سرشار ہوتا ہے اور مکمل دیانت داری اور بے لوثی کے ساتھ کسی پہلو پر غور کرتا ہے ۔ انسانی ہمدردی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اداریہ نویس کسی واقعے ، کسی فرد یا گروہ کے حالات سے متاثر ہو کر خود پر ہمدری کے جذبات طاری کرے یا جذبات کی رو میں اس طرح بہہ جائے کہ اسے اپنے الفاظ پر قابو نہ رہے ۔ اس کے برعکس انسانی ہمدردی سے وقتی جوش و خروش کی بجائے انسانی فلاح کا مسلسل خیال اور فکر و نظر کا مستقل خلوص مراد ہے ۔ یہی خلوص

انسانی فکر کو صحیح راستے پر چلاتا اور مسائل کے صحیح حل تجویز کرنے میں مدد دیتا ہے ۔ اپنے دل میں انسانیت کا درد رکھنے کی بدولت ہی اداریہ نویس زندگی کی تاریک راہوں میں افکار تازہ اور عمل پیہم کے چراغ روشن کرتا ہے اور اس کی تحریر بھٹکے ہوئے لوگوں کو راستہ دکھاتی ہے ۔

۱۲ - عوامی حقوق کے لیے جہاد

اداریہ نویس کا قلم ہمیشہ عوامی حقوق کے لیے جہاد کرتا ہے۔ ہر فرض شناس اداریہ نویس غاصبوں اور ظالموں کے خلاف جد و جہد کو اپنا مقصد حیات سمجھتا ہے ۔ وہ غریبوں ، مظلوموں اور پس ماندہ طبقوں کی ترجمانی کرتا اور ان کی حق رسی کے لیے لڑتا ہے ۔ اس کی یہ لڑائی حکومت کے خلاف بھی ہوسکتی ہے اور آبادی کے ان طبقوں کے خلاف بھی جو دوسروں کا حق غصب کرتے ہیں ۔ لیکن اداریہ نویس کو یہ احساس بھی ہونا چاہیے کہ موجودہ دور میں ہر طبقے کی یہی کوشش ہے کہ اسے دوسروں پر فوقیت دی جائے ۔ ہر طبقہ چاہتا ہے کہ قومی وسائل سے زیادہ سے زیادہ فوائد اسی کو حاصل ہوں ، اس لیے ہر طبقہ اپنے آپ کو معاشرے کا اہم ترین مگر سب سے زیادہ مظلوم طبقہ قرار دے کر قوم و ملک کے سامنے زیادہ سے زیادہ مطالبات پیش کرتا ہے ۔ غرض ہر فرد اور ہر طبقہ اپنے اپنے مطالبات کے جواز میں دلائل و براہین کے انبار لگاتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں اداریہ نویس ہر گروہ کے ہر مطالبے کو جائز اور اسی کو زیادہ مظلوم و محروم قرار نہیں دے سکتا ۔ معاشرے کے مسائل و مشکلات اسی وقت حل ہو سکتے ہیں جب معاشرے کے افراد انہیں حل کرنے کے لیے اجتماعی طور پر خلوص و نیک نیتی کے ساتھ جد و جہد کریں ۔ تاہم ہر معاشرے میں بعض طبقے ایسے بھی ہوتے ہیں جو دوسرے طبقوں

سے زیادہ محروم اور پس ماندہ ہوتے ہیں۔ ان کی حق رسی کے لیے اداریہ نویس پر زور آواز بلند کرتا ہے۔ ظالموں اور غاصبوں کا محاسبہ بھی اداریہ نویس کے اہم فرائض میں شامل ہے۔ لیکن یہ سب اسی صورت میں ممکن ہے جب اداریہ نویس معاشرے کے مختلف طبقوں اور افراد کے حقوق و فرائض سے بخوبی آگاہ ہو۔ اسے معلوم ہو کہ حکومت پر عوام کے کیا حقوق ہیں اور ملک و قوم کی طرف سے عوام پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں؟ کس طبقے کا حق کیا ہے اور کس گروہ کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟

حکومت اور عوام کے مسلمہ حقوق و فرائض سے بخوبی واقف ہونے کے علاوہ اداریہ نویس کو چاہیے کہ وہ معاشرے کے مختلف طبقوں کے حالات، مسائل، مشکلات اور محرومیوں یا انھیں حاصل ہونے والے حقوق، مراعات سے بھی باخبر ہو اور ان کے بارے میں خود کوئی موزوں اور متوازن رائے رکھتا ہو تاکہ جب وہ کسی کے حق میں آواز اٹھائے یا کسی پر تنقید کرے تو اس کے وہ خیالات و نظریات اس کی رہنمائی کریں جو اس نے غور و خوض کے بعد عوام کے حقوق و فرائض سے متعلق قائم کیے ہوں۔

۱۳ - تخلیقی صلاحیت

اداریہ نویس اگرچہ من گھڑت قصے کہانیاں بیان نہیں کرتا لیکن اپنی تحریر کو پرکشش اور مؤثر بنانے کے لیے اس میں تخلیقی صلاحیت موجود ہونا ضروری ہے۔ خصوصاً جنگ کے دنوں اور ہنگامی حالات میں جب اداریوں میں جذباتی رنگ غالب ہوتا ہے اور رائے عامہ کو منظم کرکے پوری قوم کو فرد واحد کی طرح متحد کرنا ہوتا ہے تو اداریہ نویس کی تخلیقی صلاحیت اس کے مقاصد کے حصول میں خاص طور پر معاون ہوتی ہے۔ در اصل یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو

عام حالات میں بھی اداریوں کو مؤثر اور فکر انگیز بنانے میں معاون ہوتی ہے ۔ تخلیقی صلاحیت ہی ادیبوں کی تحریروں میں ربط اور تسلسل پیدا کرکے انہیں پر کشش اور دلنشین بناتی ہے ۔ تحریر کی معجز نمائیاں تخلیقی صلاحیت ہی کی مرہون منت ہوتی ہیں ۔ مولانا الطاف حسین حالی کی رائے و میں تخلیقی صلاحیت ایک فطری وصف ہے جو بہت کم لوگوں کو ودیعت ہوتا ہے ، جو محض اکتساب سے پیدا نہیں ہوتا ، اداریہ نگار میں تخلیقی صلاحیت جتنی زیادہ ہوتی ہے اسے اپنی تحریر کو حسین و دلنشین بنانے میں اتنی ہی سہولت ہوتی ہے ۔ یوں تو محنت ، مشاق اور منطقی ذہن کی مدد سے بھی اداریہ نگار کامیابی حاصل کر سکتا ہے لیکن تخلیقی صلاحیت کی کمی قدم قدم پر اس کی راہ میں دشواریاں پیدا کر دیتی ہے اور اکثر مواقع پر وہ اپنی تحریر کو مؤثر بنانے میں ناکام رہتا ہے ۔

۱۳ ۔ معاشرتی حالات سے واقفیت

اداریہ نویس کے لیے ضروری ہے کہ وہ جس معاشرے میں رہتا ہو اس کی تہذیب و ثقافت ، لوگوں کے عقائد اور رسوم و رواج سے بھی واقف ہو کیونکہ بعض اوقات اسے ایک مصلح کا کردار بھی ادا کرنا پڑتا ہے ۔ وہ فرسودہ رسوم ، تعصب ، تنگ نظری ضعیف الاعتقادی اور ایسے ہی دوسرے عیوب کے خلاف جہاد کرتا ہے ۔ وہ بڑی بے باکی سے معاشرے کے رستے ہوئے ناسور پر تنقید کے نشتر چلاتا ہے لیکن اداریہ نویس صرف نکتہ چینی اور منفی کردار ادا کرنے پر اکتفا نہیں کرتا ، وہ صحت مند رجحانات پیدا کرنے کے لیے بڑی جد و جہد جاری رکھنا ضروری سمجھتا ہے ۔ وہ اچھی روایتوں کی حفاظت اور اعلیٰ قدروں کی وکالت کرتا ہے اور اس کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی ہے کہ صحت مند رجحانات کو پھلنے پھولنے کا ہر ممکن موقع ملے ۔

معاشرے کے رسم و رواج اور عوام کے جذبات ، احساسات اور رجحانات سے باخبر ہونا اس لیے بھی ضروری ہے کہ ان سے لاعلمی کی صورت میں ممکن ہے کہ اداریہ نویس کے قلم سے کوئی ایسی بات نکل جائے جس سے قارئین کے جذبات کو ٹھیس پہنچنے کا احتمال ہو ، اور وہ اس اخبار کو ناپسند کرنے لگیں یا اس کا مطالعہ ترک کر دیں ۔ اس صورت میں اخبار کی اشاعت اور آمدنی کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی پسندیدہ صورت حال قرار نہیں دی جا سکتی ۔

۱۵ ۔ قومی تقاضوں کا احساس

اداریہ نویس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ملکی اور قومی تقاضوں کو ہر حال میں ملحوظ رکھے۔ ان تقاضوں کا دائرہ بہت وسیع ہے ۔ ان میں اقتصادی مسائل سے دفاعی ضروریات تک ہر طرح کے امور شامل ہیں ۔ بیرونی ملکوں کی پالیسیوں پر تبصرہ کرتے وقت اداریہ نویس کو دوست اور دشمن کا خیال رکھنا چاہیے ۔ اسے کوئی ایسی بات

نہیں لکھنی چاہیے جس سے ملک کے دشمنوں کو کسی شکل میں بھی فائدہ پہنچ سکتا ہو ۔ اس احتیاط اور چوکسی کے بغیر اداریہ نویس کی تحریریں ملک و قوم کے لیے الجھن یا نقصان کا باعث بن سکتی ہیں ۔

۱۶ ۔ اخبار کی پالیسی سے آگاہی

موجودہ زمانے میں ادارتی صفحہ ہی اخبار کی آواز اور اس کی پالیسی کا مظہر کہا جا سکتا ہے ۔ اس صفحے پر اداریے کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے جسے کسی فرد واحد کی بجائے پورے ادارے کا ترجمان سمجھا جاتا ہے ۔ اس لیے اداریے کو اخبار کی پالیسی سے پوری مطابقت رکھنی چاہیے ۔ اداریہ نگار کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس کا اخبار جس پارٹی جس گروہ یا جس مکتب فکر سے تعلق رکھتا ہے اس کا نقطۂ نظر کیا ہے ۔ معاشرے کے مختلف گروہوں ،

مختلف مکاتب فکر ، اداروں اور سیاسی یا اقتصادی مسائل سے متعلق اس کی پالیسی کیا ہے اور اسے ایک خاص مدت میں مختلف موضوعات پر تقریباً کتنے اداریے لکھنے چاہئیں ۔

اخبار کی پالیسی پر سختی سے عمل کرنا اگرچہ اداریہ نویس کی آزادی محدود کرنے کے مترادف ہے لیکن کارکن صحافی کی حیثیت سے کسی اخبار کے ادارۂ تحریر سے وابستہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اداریہ نویس نے کسی جبر و اکراہ کے بغیر اخبار کی پالیسی کو زیادہ سے زیادہ مؤثر طور پر پیش کرنے کی ذمہ داری قبول کر لی ہے ۔ اس کے باوجود کسی مرحلے پر وہ اپنے ضمیر میں کوئی خلش محسوس کرے یا اس نتیجے پر پہنچے کہ اخبار کی پالیسی پر عمل درآمد جاری رکھنا اس کی فکری دیانت داری کے منافی ہے تو اسے یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ ضمیر کے خلاف کام کرے یا ضمیر کی آواز پر لبیک کہے اور کسی ایسے ادارے سے وابستہ ہو جائے جہاں ایسی کسی کشمکش کا اندیشہ نہ ہو ۔ لیکن موجودہ دور میں صحافت نے ایک صنعت اور صحافی نے ایک فنی کارکن کی حیثیت اختیار کر لی ہے ، اس لیے پالیسی پر فروعی اختلاف کی صورت میں افہام و تفہیم کا راستہ نکالنا مشکل نہیں ہوتا ۔

۱۷ - فنی چابک دستی

اداریہ نویسی کے لیے بعض ایسی خصوصیات بھی درکار ہوتی ہیں جنہیں پیدا کرنے کے لیے مسلسل مطالعہ ، مشق اور ریاضت ضروری ہے ۔ ان خصوصیات میں اداریے کے فن اور اسلوب سے واقفیت بھی شامل ہے ۔ اداریہ نویس کو اچھی طرح معلوم ہونا چاہیے کہ اداریہ کا موزوں آغاز کیسے کیا جاتا ہے ، کس مرحلے پر زیر بحث مسئلے کی وضاحت کی جاتی ہے اور اسے کس وقت کن الفاظ میں اپنا فیصلہ دینا چاہیے ۔

آج کل اخبارات میں اداریوں کے لیے ایک خاص جگہ متعین ہوتی ہے ۔ اداریہ نویس کو بالعموم اسی مقررہ جگہ میں اداریہ اور شذرات کو مکمل کرنا ہوتا ہے ۔ اپنا مافی الضمیر کم سے کم الفاظ میں پوری وضاحت کے ساتھ اور انتہائی مدلل طور پر بیان کرنا ایک مشکل فن ہے جس کے لیے طویل مشق اور ریاضت کی ضرورت ہے ۔ اس فن میں مہارت کے بغیر اداریہ نویسی اور خانہ پری میں تمیز کرنا ممکن نہیں ہوتا ۔

اس بحث کا ماحاصل ای فرینک کنیڈلن کے الفاظ میں یہ ہے :

''ایڈیٹر کی سب سے بڑی خوبی اس کی متوازن اور غیر جذباتی قوت فیصلہ ہے جو دنیا کے وسیع تجربے پر مبنی ہو ۔ اس کے علاوہ ایڈیٹر کو ملکی اور غیر ملکی معاملات سے اچھی طرح باخبر ہونا چاہیے ۔ اس کا مقصد کے بارے میں ثابت قدم اور باحوصلہ ہونا بھی ضروری ہے ۔ چونکہ وہ رائے عامہ کی تشکیل کرتا ہے اس لیے اس پر کئی اطراف سے دباؤ پڑتا ہے ، اس لیے اسے اس قابل ہونا چاہیے کہ دباؤ ، رشوت اور لالچ سے بے نیاز ہو کر اپنا کام کرتا رہے ۔ چونکہ اس نے کام جلدی جلدی کرنا ہوتا ہے ، اس لیے وہ اس قابل ہونا چاہیے کہ جلد فیصلے کر سکے ۔ اسے راست باز ، خوش اطوار اور صاف ذہن ہونا چاہیے ، نہ مشتعل ہو کر جانبداری برتے اور نہ پارٹی بازی میں ملوث ہو ۔ اپنے نقطۂ نظر پر قائم رہتے ہوئے دوسروں کے نظریات کا احترام کر سکے[۱] ۔''

اداریہ اور تاریخ

اداریہ نویس کے لیے تاریخ پر گہری نظر سب سے زیادہ ضروری ہے ۔ ایک دانشور کا قول ہے کہ: ”جو شخص صرف اپنی نسل کو جانتا ہے وہ ہمیشہ بچہ رہتا ہے ۔“ جس شخص کا علم ، مشاہدہ اور تجربہ اس کی اپنی نسل اور گرد و پیش تک محدود رہتا ہے وہ صحیح معنٰی میں با خبر ، با علم اور با شعور نہیں ہو سکتا ۔ کیوں کہ وہ ماضی کے ہزاروں سال کے علم اور تجربات سے بے خبر رہتا ہے ۔ ماضی کے علوم ، تجربات ، قوموں کے عروج و زوال کے فلسفے ، معاشرے کے بننے اور بگڑنے کے اسرار ، قوموں کے عروج و زوال کے رموز سے واقفیت حاصل کرنے کا صرف ایک ذریعہ ہے ، یہ ذریعہ اقوام عالم کی تاریخ ہے ۔ سیاست ، معیشت ، علم ، ادب ، زبان ، ثقافت غرض زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں انسانی ارتقا کی جھلک نہ ملتی ہو ۔ تاریخ کا مطالعہ ایک عام آدمی کے لیے بھی مفید ہوتا ہے لیکن اداریہ نویس کے لیے تو یہ انتہائی ضروری ہے ، کیوں کہ اسے ہر روز اہم گروہی ، طبقاتی ، اجتماعی ، ملکی ، قومی اور بین الاقوامی معاملات و مسائل پر رائے دینا اور اپنے قارئین کی رہنمائی کرنا ہوتی ہے ۔ صحیح رہنمائی کا مقصد پورا کرنے کے سلسلے میں اس کا تاریخی شعور اسے سب سے زیادہ مدد دیتا ہے ۔ اداریہ نویس کسی رجحان کی مخالفت کرتا ہے تو اس رجحان کے نقصان دہ ہونے کا ثبوت تاریخ سے پیش کرتا ہے ۔ کوئی تجویز یا کسی مسئلے کا حل پیش کرتا ہے تو دلیل ماضی کے واقعات سے لاتا ہے ۔ تاریخ درس آموز بھی ہوتی ہے ، علم افروز بھی اور معلومات افزا بھی ۔ اداریہ نویس کو اس سے جو مدد مل سکتی ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے ۔ اداریہ نویس موقع اور محل کے مطابق تاریخ سے مختلف صورتوں میں استفادہ کرتا ہے ۔ اس کی بعض شکلیں حسب ذیل ہیں :

(۱) قوت ایمانی میں اضافہ (۲) ماضی کی غلطیوں سے

سبق (۳) احتساب و گرفت (۴) ہدایت و رہنمائی (۵) تعبیر و توجیہ ۔

قوت ایمانی میں اضافہ

اپنے جلیل القدر اور محترم بزرگوں کی جرأت و بیباکی اور ایثار و قربانی کے واقعات کا مطالعہ ہمیشہ ہمارا ایمان تازہ کرنے کا باعث بنتا ہے ۔ مثلاً بدر اور احد کے غزوات میں مسلمانوں کی بے مثال شجاعت اور سرفروشی ازل تک مسلمانان عالم کے یقین و ایمان کو تقویت عطا کرتی رہے گی ۔ قیام پاکستان سے قبل برصغیر کے مسلمانوں کی خستہ حالی اور ان کے حقوق کی پامالی کے واقعات اور قائد اعظم کی ولولہ انگیز قیادت میں مسلم لیگ کے جھنڈے تلے مسلمانوں کی آزادی اور علیحدہ وطن کے لیے ایک منظم اور عصر آفریں جد و جہد کی روداد ہمیشہ اہل پاکستان کے دلوں میں ایک نیا جذبۂ عمل بیدار کرتی رہے گی ۔

تاریخ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ظالم آمروں کے پنجۂ استبداد سے نجات پانے کے بعد کس طرح بعض اقوام نے صحیح راستے سے بھٹک کر اپنے پاؤں پر آپ کلھاڑی ماری ہے ۔ تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ دنیا نے نیکی اور شرافت کی ہمیشہ سے قدر کی ہے اور اعلیٰ مقاصد کے لیے جد و جہد کرنے والوں کو ہمیشہ یاد رکھا ہے ۔ تاریخی واقعات کے حوالے راہ عمل پر گامزن لوگوں میں یہ جذبہ پیدا کرتے ہیں کہ ان کے پائے استقامت کڑی سے کڑی آزمائش میں بھی متزلزل نہ ہوں ۔

کسی مشکل وقت میں اداریہ نویس قارئین کو ماضی کے مسائل و مشکلات کا حوالہ دے کر بتا سکتا ہے کہ کس طرح ان مصائب پر قابو پانے کے لیے ہمارے اسلاف نے عزیمت و جرأت اور اتحاد و تنظیم کا مظاہرہ کیا اور خود اپنی صلاحیت اور قوت بازو

سے کام لے کر کس حسن و خوبی سے بڑے بڑے مسائل حل کر لیے ۔ مثلاً پاکستان کی وحدت و سالمیت کے خلاف کسی حرکت پر برہم ہو کر اداریہ نویس وطن دشمن عناصر کی ملامت و مذمت کرنے کے علاوہ اہل وطن کو ہندوؤں اور سکھوں کے وحشیانہ مظالم یاد دلا سکتا ہے جو کہ قیام پاکستان سے قبل اور تقسیم ملک کے وقت مسلمانوں پر کیے گئے تھے ۔ پھر وہ ان مقاصد کا اعادہ کر سکتا ہے جن کے لیے ہم نے ماضی میں بے اندازہ قربانیاں دیں اور طویل جد و جہد کے بعد اپنے لیے ایک علیحدہ وطن حاصل کیا ۔

مسلمانوں کی قرن اول کی تاریخ بے شمار ایمان افروز واقعات سے بھری ہوئی ہے جن کا تذکرہ قارئین کے دلوں کو عزم اور یقین سے معمور کر دیتا ہے ۔ مگر اداریے میں اتنی گنجائش نہیں ہوتی کہ تاریخی واقعات تفصیل کے ساتھ بیان کیے جائیں ، چنانچہ ان کا حوالہ کافی ہوتا ہے ۔ مثلاً اداریہ نویس غزوۂ بدر کا تذکرہ کرتے ہوئے میدان جنگ کا پورا نقشہ اور تفصیلات نہیں بتائے گا بلکہ یہ ذکر کچھ اس طرح ہوگا کہ : ''جنگ بدر میں مسلمانوں کا مقابلہ ایک ایسے دشمن سے تھا جو ان سے تین گنا زیادہ طاقتور تھا ۔ لیکن فرزندان توحید کی طاقت کا راز ان کی تعداد میں نہیں ان کے ایمان میں مضمر تھا ۔ مسلمان بے سر و سامانی کی حالت میں بھی قوت ایمانی اور تائید ایزدی کی بدولت کئی گنا زیادہ طاقت پر غالب آنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ، اس کا تازہ ترین ثبوت پاکستان ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں مہیا کر چکا ہے ۔''

ماضی کی غلطیوں سے سبق

تاریخ کو فراموش کرکے ہم ایک ہی غلطی کے بار بار مرتکب ہو سکتے ہیں ۔ لیکن تاریخ پیش نظر رہے تو غلطیوں کے اعادہ سے بچایا جا سکتا ہے ۔ تاریخ عالم قوموں اور حکومتوں کی

غلطیوں سے بھری ہوئی ہے۔ اداریہ نویس اپنے تاریخی شعور کی روشنی میں اس نشیب و فراز کا جائزہ لیتا رہتا ہے جس سے مختلف قومیں گزری ہیں اور پھر اسی نقطہء نظر سے خود اپنے ملک کے مختلف طبقوں، جماعتوں اور افراد کی سرگرمیوں کا جائزہ لیتا ہے تاکہ ان کی غلطیوں کی نشان دہی کر سکے۔ اس کا فرض ہے کہ ملک و قوم کے مفاد کو نقصان پہنچانے والے افراد کی غلطیوں پر تنقید کرنے کے ساتھ ساتھ آئندہ کے لیے احتیاط کی راہ اختیار کرنے کی تلقین کرے۔ بے شمار غلطیاں ایسی ہوتی ہیں جن کے سنگین یا دور رس نتائج کو امتداد زمانہ کے باوجود فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اداریہ نویس اگر ان پر نظر رکھے تو ان کے بر محل حوالے سے وہ اپنا مؤقف زیادہ پر زور الفاظ میں پیش کر سکے گا۔

احتساب و گرفت

جو لوگ ماضی میں غلطیوں کا ارتکاب کرتے ہیں یا جو قومیں دوسروں کے حقوق غصب کرنے یا وعدوں کی خلاف ورزی اور معاہدوں سے انحراف کی مرتکب ہوتی ہیں ان کے کردار کو وقت گزر جانے کے باوجود نظرانداز نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اس سلسلے میں ان کی ہمیشہ گرفت کی جا سکتی ہے۔ مواخذے کا خوف ان لوگوں کو غلطیوں کے ارتکاب سے روکتا ہے جن کے بارے میں اندیشہ ہوتا ہے کہ کسی مرحلے پر وہ بھی راہ راست سے منحرف ہو جائیں گے۔

ہدایت اور رہنمائی

ماضی میں کسی قوم کے کردار اور ذوق عمل کا جائزہ لے کر اداریہ نویس اندازہ لگا سکتا ہے کہ مجموعی طور پر قوم کس طرف جا رہی ہے۔ وہ ترقی کی راہ پر گامزن ہے یا تنزل پذیر ہے۔ اس میں اچھی اقدار نے فروغ پایا ہے یا وہ

جمود و انحطاط کا شکار ہو گئی ہے ۔ قوم کے افراد میں جہد و پیکار کا جذبہ ابھرا ہے یا سرد ہوا ہے جس کے باعث ان میں تن آسانی اور آسودہ خاطری پیدا ہو رہی ہے ۔ وہ اعلیٰ نصب العین اور بلند مقاصد کی طرف بڑھ رہے ہیں یا گم کردہ راہی ان کا مقدر بن چکی ہے ۔ ان سے کوتاہیاں ہوئی ہیں تو وہ کیا ہیں اور کن شعبوں میں ؟ قومی کوششیں ناکام رہی ہیں تو کن پہلوؤں سے ؟ ان کی وجوہ کیا ہیں اور ان کا مداوا کیسے کیا جا سکتا ہے ؟ اداریہ نویس ان تمام سوالوں کے جواب قوم کی تاریخ کا جائزہ لے کر معلوم کر سکتا ہے اور قوم کی اصلاح و رہنمائی کر سکتا ہے ۔ اگر مختلف قوموں کی قدیم تاریخ بھی اداریہ نویس کے سامنے ہو تو اسے اپنی قومی زندگی بھی کسی ایسے موڑ پر نظر آ سکتی ہے جہاں سے کوئی دوسری قوم گزر چکی ہو ۔ وہ ماضی کے آئینے میں حال کی تصویر دیکھ کر مستقبل کے لیے نئی راہیں متعین کر سکتا ہے ۔ اداریہ نویس اپنی قوم کو بتا سکتا ہے کہ ماضی میں کس قوم کو نقصان کا کیوں سامنا کرنا پڑا اور کس نے کامیابی اور عظمت سے ہم کنار ہونے کے لیے کیا راہ عمل اختیار کی ۔

تاریخ کے ہر واقعے میں ہدایت ، رہنمائی یا عبرت کے لاتعداد پہلو پنہاں ہوتے ہیں ۔ ذہن رسا رکھنے والا اداریہ نویس حالات حاضرہ اور گزرے ہوئے واقعات میں موازنہ کر کے اپنے قارئین کا دامن عقل و دانش سے مالا مال کر سکتا ہے ۔

حالات کی توضیح و توجیہ

ماضی میں کسی قوم کی سرگرمیوں اور ان کے نتائج کا تجزیہ کر کے اداریہ نویس زمانۂ حال میں قوموں کے کردار اور انداز فکر و عمل کے مضمرات کی نشان دہی کر سکتا ہے ۔ مختلف واقعات

کے باہمی ربط و تعلق کے ادراک کے بعد وہ بعض قوموں کے متعلق بالکل صحیح پیش گوئی کر سکتا ہے ، یعنی اس کے لیے یہ بتانا بھی ممکن ہو جاتا ہے کہ زمانہ حال کے حالات کے پیش نظر کسی خاص قوم کا مستقبل کیا ہو سکتا ہے ۔

تاریخ کے پیہم رواں دھارے پر بند باندھنا ممکن نہیں ۔ البتہ سخت جد و جہد اور مسلسل کوشش کی جائے تو اس کا رخ بتدریج صحیح سمت میں موڑا جا سکتا ہے ۔ مخصوص حالات اور واقعات کے نتائج بھی مخصوص ہوتے ہیں ۔ تاریخ میں قوموں کے عروج و زوال کی ایسی بے شمار مثالیں ملتی ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ اخلاق انحطاط کے باعث بالآخر رسوائی اور ذلت قوموں کا مقدر بن جاتی ہے ۔ اس کے برعکس اتحاد ، تنظیم اور مکارم اخلاق کی بدولت قومیں کامیابی اور سربلندی حاصل کرتی ہیں، خواہ ان کا تعلق دنیا کے کسی بھی حصے سے ہو ۔ اداریہ نویس ان تمام مثالوں سے استفادہ کرتا ہے اور حسب ضرورت ان کے حوالے دے کر قارئین کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتا ہے ۔

مواد کے ماخذ

اداریہ لکھنے کے لیے مواد کے حصول کا سب سے بڑا ذخیرہ خود اداریہ نویس کا اپنا ذہن ہے ۔ اداریہ نویس کا ذہن بعض حقائق ، واقعات یا اعداد و شمار کو صرف کسی خاص انداز سے ترتیب دینے یا مطلوبہ شکل میں پیش کرنے کا اہتمام نہیں کرتا بلکہ یہ ایک ایسی لائبریری کا بھی کام دیتا ہے جس میں اداریہ نویس کا تجربہ ، مشاہدہ ، مطالعہ اور مختلف مسائل و موضوعات سے متعلق معلومات محفوظ ہوتی ہیں جنھیں وہ کسی دقت یا محنت کے بغیر ضرورت کے وقت فوراً اپنی تحریر میں استعمال کر سکتا ہے ۔ تحریر کے لیے کوئی خاص اسلوب اختیار کرنے میں اداریہ نویس

کی ذہنی اُپج خاص طور پر معاون ہوتی ہے ۔ لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ دنیا کے تمام علوم و فنون کے تمام پہلوؤں سے متعلق مواد اداریہ نویس کے ذہن میں محفوظ نہیں رہ سکتا ۔ اسے اپنی تمام ذہنی اور فکری صلاحیتوں کے باوجود اداریہ لکھنے کے لیے بہت سے دوسرے ذرائع سے بھی مواد حاصل کرنا پڑتا ہے جن میں اخبارات ، جرائد ، عوام ، سفر ، مشاہدہ ، مراسلات ، لائبریریاں ، حوالے کی کتب ، تاریخ ، قوانین ، جغرافیہ ، مقولے ، فائلیں ، تراشے ، رپورٹیں اور اعداد و شمار وغیرہ شامل ہیں ۔

اخبارات و جرائد

اداریے کے موضوع کے انتخاب کے لیے اداریہ نویس اخبارات و جرائد کا مطالعہ کرتا ہے ۔ اداریہ ہمیشہ حالات اور وقت کے تقاضوں کو مد نظر رکھ کر لکھا جاتا ہے ۔ دنیا کے حالات ، واقعات ، رجحانات ، مسائل اور مشکلات سے آگاہ رہنے کے لیے اداریہ نویس ملکی اور غیر ملکی اخبارات و جرائد کا باقاعدہ مطالعہ کرتا ہے ۔ اداریوں میں اخبارات و جرائد میں مطبوعہ اطلاعات اور خبریں ہی موضوع بحث بنتی ہیں ۔ حالات پر گہری نظر رکھنے والا اداریہ نویس ان خبروں کے حوالے دے کر اور واقعات کی کڑی سے کڑی ملا کر زیادہ بہتر اور مناسب طور پر اظہار خیال کر سکتا ہے ۔ غیر ملکی جرائد سے بھی بعض اوقات اداریہ نویس کو ایسے حقائق مل جاتے ہیں جن کی بنیاد پر بہت اہم اداریے لکھے جا سکتے ہیں ۔

عوام

اداریے عام قارئین کے لیے لکھے جاتے ہیں ، اس لیے اداریہ نویس عوام کے رجحانات ، خیالات اور نظریات کی ترجمانی کے علاوہ ان کے مسائل و مشکلات کا تجزیہ کرتا ہے اور ان کے

حقوق و مفادات کی حفاظت کے لیے ہمیشہ سینہ سپر رہتا ہے ۔ بات خواہ کسی بھی موضوع پر کی جائے اداریہ نویس عوام اور اجتماعی مفادات کو نظر انداز نہیں کر سکتا ۔ عوام کے مفادات کا تحفظ ، ان کے حقوق کی علم برداری اور ان کے مسائل کے حل کے لیے یہ ضروری ہے کہ اداریہ نویس عوام سے قریب ہو ، ان کے ذہن کو سمجھے ، ان کے دل کی دھڑکن کو غور سے سنے اور پوری بیباکی ، نیک نیتی اور احساس ذمہ داری کے ساتھ اپنا فرض ادا کرے ۔

مشاہدہ

اداریہ نویس کا ذاتی مشاہدہ اس کے لیے قابل اعتماد مواد کا ذریعہ ہوتا ہے ۔ اپنی قوت مشاہدہ ، جز رسی اور نکتہ شناسی کی بدولت اداریہ نویس اپنے گرد و پیش کے روزمرہ کے واقعات سے بھی بہت سی مفید باتیں اخذ کر سکتا ہے ۔ اسی لیے بعض اوقات وہ ایسے امور کو بھی اپنا موضوع بناتا ہے جو بظاہر بہت معمولی ہوتے ہیں لیکن اپنے مضمرات یا نتائج کے اعتبار سے وہ بہت اہم اور دور رس ہوتے ہیں ۔

ڈاک

اخبارات کے دفاتر میں ہر روز ڈاک سے بہت سے خط موصول ہوتے ہیں جن میں سے چند ایک مراسلات کی صورت میں شائع کر دیے جاتے ہیں ۔ ان خطوط میں قارئین مختلف معاملات اور مسائل پر اظہار خیال کرتے ہیں ۔ بعض میں نئے خیالات ہوتے ہیں یا مفید تجویزیں پیش کی جاتی ہیں ۔ اکثر و بیشتر خطوط شکایات پر مشتمل ہوتے ہیں ۔ مثلاً ان میں مختلف اداروں یا محکموں کے افسروں اور اہل کاروں کی نااہلیوں اور بد عنوانیوں کا پردہ چاک کیا گیا ہوتا ہے ۔ بعض خطوط کا لہجہ ناقابل برداشت

حد تک سخت ہوتا ہے ، بعض کی تحریر اہانت آمیز ہوتی ہے ، بعض میں جو واقعات بیان کیے جاتے ہیں ان کی صداقت مشکوک ہوتی ہے ، اور بعض خطوط اخبار کی پالیسی کے اس حد تک منافی ہوتے ہیں کہ وہ اشاعت کے لیے موزوں نہیں ہوتے ۔ لیکن ان کے مطالعے سے اداریہ نویس پر کبھی کبھی اہم حقائق بھی منکشف ہو جاتے ہیں ، اس لیے اداریہ نویس ایڈیٹر کے نام خطوط کا ہمیشہ غور سے مطالعہ کرتا ہے ۔ ان کے ذریعے وہ اپنے قارئین سے قریبی رابطہ قائم کر سکتا ہے اور اسے اپنے فرائض زیادہ خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کرنے میں مدد ملتی ہے ۔

لائبریری

بڑے اخبارات کے دفاتر میں اپنی خاص لائبریری ہوتی ہے جس سے اخبار کے مضمون نگار ، رپورٹر ، فیچر لکھنے والے ، سب ایڈیٹر ، کالم نگار اور اداریہ نویس استفادہ کر ہیں ۔ دفتر میں لائبریری کی سہولت نہ ہو تو اداریہ نویس کسی پبلک لائبریری کا ممبر بن سکتا ہے جہاں مختلف علوم پر بڑی تعداد میں کتابیں موجود ہوتی ہیں ۔ کسی خاص موضوع سے متعلق مواد حاصل کرنے کے علاوہ اداریہ نویس لائبریری سے مختلف علوم کی کتابیں حاصل کر کے اپنا باقاعدہ مطالعہ بھی جاری رکھ سکتا ہے ۔

حوالے کی کتب

ہر اچھے اخبار کے دفتر میں انسائیکلوپیڈیا اور حوالے کی دوسری کتب موجود ہوتی ہیں جن سے مختلف واقعات ، شخصیات ، جگہوں اور اشیا وغیرہ کے متعلق معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں ۔

قوانین

اداریہ نویس اور دوسرے صحافیوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ تمام اہم مروجہ قوانین مثلاً توہین عدالت اور ہتک عزت سے متعلق قوانین سے پوری طرح واقف ہوں۔ عوام کے حقوق کے تحفظ اور انھیں غاصبوں کے ظلم سے نجات دلانے کے لیے اداریہ نویس قلم سے جو جہاد کرتا ہے اس کے سلسلے میں اسے انتہائی احتیاط سے کام لینا ہوتا ہے تاکہ وہ کسی قانون کی خلاف ورزی کا مرتکب نہ ہو۔

اقوال

ممتاز شخصیتوں کے اقوال کا برمحل استعمال اداریے کو مؤثر بنانے میں خاص طور پر مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ قومی اور ملی رہنماؤں کے اقوال بعض اوقات اداریوں میں پیش کیے جاتے ہیں۔ مختلف امور کے متعلق اہم شخصیتوں کے اقوال اداریہ نویس کے ذہن میں ہونے چاہئیں۔ اس کے علاوہ اخبار کی لائبریری میں نامور شخصیتوں کے اقوال پر مشتمل کتابیں بھی موجود ہوتی ہیں جن سے ضرورت کے وقت فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

فائلیں اور تراشے

اخبارات کے دفاتر میں مختلف اہم ملکی اور بین الاقوامی واقعات کی خبروں کے تراشے ترتیب وار فائلوں میں محفوظ رکھے جاتے ہیں جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ متعلقہ موضوع پر ایک کتاب کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اخبار کی لائبریری میں نئے قوانین ، نئے بجٹ ، اہم اعلانات اور اسی طرح کے دوسرے واقعات سے متعلق تراشے محفوظ کر لیے جاتے ہیں۔

جب کوئی مسئلہ شدت اختیار کرتا ہے یا کسی معمولی

واقعہ سے بات بڑھتے بڑھتے دو ملکوں کے درمیان جنگ کی صورت اختیار کر لیتی ہے تو اداریہ نویس کو اس کا واقعاتی پس منظر ان تراشوں کی فائلوں میں مل جاتا ہے ۔ یہ کام بعض اداروں کی مطبوعات مثلاً Keesing's Contemporary Archives نے آسان کر دیا ہے جو دنیا کے اہم واقعات کی مستند روداد مرتب کرکے اخبار کے دفتر میں بھیجتے رہتے ہیں ، جیسے یکجا کرنے سے ایک طرح کی عصری تاریخ تیار ہو جاتی ہے اور ضرورت کے وقت حوالے لیے ستعمال کی جا سکتی ہے - لیکن اس طرح کی مطبوعات میں چونکہ صرف اہم بین‌الاقوامی واقعات کی گنجائش نکل سکتی ہے اس لیے ہر اخبار ضروری سمجھتا ہے کہ اپنی خاص ضروریات کے مطابق تراشے جمع کرنے کا اہتمام بھی کرے تاکہ اسے ہر موضوع کے متعلق مطلوبہ مواد آسانی سے مل سکے ۔

جن اخبارات ہیں تراشوں کی فائل اور عصری تاریخ کی کتب حوالہ موجود ہوں وہاں اداریہ نویس کا کام بہت آسان ہو جاتا ہے ۔ اس کے برعکس جن اخبارات کے دفاتر میں تراشے محفوظ نہیں رکھے جاتے وہاں اداریہ نویس کو متعلقہ خبریں اخبار کے فائل سے تلاش کرنی پڑتی ہیں ۔

رپورٹیں

مختلف سرکاری امور غیر سرکاری ادارے ، کمیشن اور کمیٹیاں وقتاً فوقتاً اپنی مختلف رپورٹیں شائع کرتی رہتی ہیں ، جن کا مطالعہ بڑا معلومات افزا ثابت ہوتا ہے ۔ اس کے علاوہ یونیورسٹیوں کے شعبے اور تحقیقاتی مراکز بھی مختلف امور سے متعلق تحقیقاتی رپورٹیں شائع کرتے رہتے ہیں ۔ اگر یہ تمام رپورٹیں اخبارات کے دفاتر میں محفوظ رہیں تو ضرورت پڑنے پر اداریہ نویس ان سے مدد لے سکتا ہے ۔

اعداد و شمار

سرکاری محکمے اور بین الاقوامی ادارے اور دوسرے تحقیقی شعبے مختلف امور، مثلاً صنعتی اداروں کی پیداوار، ترقیاتی منصوبوں کے نتائج، ٹریفک کے حادثات، آبادی یا جرائم میں اضافے کی رفتار اور زندگی کے دوسرے ان گنت پہلوؤں سے متعلق اعداد و شمار شائع کرتے رہتے ہیں۔ اخبارات کے دفتروں اور لائبریریوں میں ان کا ریکارڈ محفوظ رکھا جاتا ہے۔ اداریہ نویس ان اعدادو شمار کی مدد سے اپنی تحریر کو مدلل اور مؤثر بناتا ہے۔

اداریہ کیسے لکھنا چاہیے؟

کہنہ مشق اداریہ نویسوں کو اپنے فرائض منصبی ادا کرنے کے سلسلے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ خود بخود اس فن میں ماہر بن جاتے ہیں بلکہ وہ اپنے علم، مطالعے اور تجربے سے فائدہ اٹھانے کے بعد اس منزل پر پہنچتے ہیں۔ ان کی مشاقی ان کی طویل عرق ریزی کی مرہون منت ہوتی ہے۔ منجھے ہوئے اداریہ نویس غیر شعوری طور پر ان تمام اصولوں نیز فنی اور معنوی تقاضوں کا لحاظ رکھتے ہیں جو ان کی تحریر کو مؤثر بنانے کے لیے ضروری ہیں۔ لیکن نئے اداریہ نویس سے بعض کوتاہیاں سرزد ہو سکتی ہیں اور ممکن ہے کہ اس کے اداریے میں کسی پہلو سے کوئی خامی یا تشنگی باقی رہ جائے۔ اداریے کو جامع، مکمل اور مؤثر بنانے کے لیے جن باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے ان پر آئندہ صفحات میں بحث کی جائے گی۔

موضوع کا انتخاب

اداریہ نویس کا پہلا کام موضوع کا انتخاب ہوتا ہے۔

یعنی یہ فیصلہ کرنا کہ وہ کس مسئلے پر مقالہ‘ افتتاحیہ لکھے اور کن مسائل پر شذرات لکھے جائیں ۔ افتتاحیہ اہم ترین مسئلے پر لکھا جاتا ہے اور شذرات نسبتاً کم اہم موضوعات پر ؛ لیکن ”اہمیت“ ایک اضافی امر ہے ۔ اخبارات کے الگ الگ مسلک ہوتے ہیں ۔ ان کی پالیسیوں اور نقطہ ہائے نظر میں فرق ہوتا ہے ۔ اس لیے ہر اخبار کا اداریہ نویس اپنے اخبار کی پالیسی اور مسلک کے پیش نظر موضوع کا انتخاب کرتا ہے ۔ بڑے اخبارات میں افتتاحیہ اور شذرات کے موضوعات کا انتخاب ادارتی کانفرس میں ہوتا ہے ۔ یعنی اخبار کے ایڈیٹر ، اداریہ نویس اور ادارتی عملے کے دوسرے اہم ارکان باہمی تبادلہ‘ خیالات کے بعد طے کرتے ہیں کہ افتتاحیہ کس مسئلہ پر ہو اور اس میں کیا مؤقف اختیار کیا جائے ۔ شذرات کن مسائل پر ہوں اور ان میں کیا کہا جائے ۔

پالیسی سے قطع نظر ’اداریوں‘ کے موضوعات کے انتخاب میں دو باتیں ملحوظ رکھنی چاہئیں :

۱ ۔ مسئلے کی نوعیت

سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ انسانیت ، عوام ، امن عامہ اور قومی مفاد کے نقطۂ نظر سے کون سا مسئلہ زیادہ اہم ہے ۔ اگر کسی واقعے سے امن عامہ کو خطرہ لاحق ہو گیا ہو یا اعلیٰ انسانی اقدار خطرے میں پڑ گئی ہوں تو لازماً اس کو اداریے کا موضوع بنانا چاہیے ۔ مثال کے طور پر موجودہ دور میں اگر دنیا کے ایک خطے میں جنگ چھڑ جائے یا جنگ کا خطرہ پیدا ہو جائے تو اس کا پوری دنیا پر اثر پڑتا ہے ۔ چنانچہ اگر کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے تو اس مسئلے کو اداریے کا موضوع بنانا چاہیے ۔ کوئی اہم

اداریہ کے لیے موضوع کی تلاش ـــــ کارٹونسٹ کی نظر میں

بین الاقوامی مسئلہ درپیش نہ ہو تو دیکھنا چاہیے کہ قومی ، ملکی یا عوامی نقطۂ نظر سے کون سا مسئلہ اہم ہے - اگر کوئی خوردنی جنس یکدم نایاب ہو جانے کے باعث تمام عوام یا ان کی اکثریت کے متاثر ہونے کا احتمال ہو یا کسی مقام پر دو فرقوں میں تصادم سے پورے ملک کا فرقہ وارانہ امن درہم برہم ہونے کا اندیشہ ہو تو اس مسئلے کو اداریے کا موضوع بننا چاہیے - اگر یہ صورت بڑی نہ ہو تو پھر یہ دیکھنا چاہیے کہ عوامی مفاد یا دلچسپی کے اعتبار سے کون سا مسئلہ زیادہ اہم ہے - حکومت کی کسی وزارت یا محکمے نے ایسا فیصلہ کیا ہے جو ہزاروں لوگوں کے لیے مفید ہو یا ضرر رساں ہوسکتا ہو ، یا کسی جگہ جرائم پیشہ لوگوں نے عوام کا سکون غارت کر دیا ہو یا کسی شہر میں پینے کے پانی کی نایابی کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہو تو اس پر اداریہ لکھنا چاہیے - کبھی کبھی بیک وقت کئی مسائل ایسے ہو سکتے ہیں - جو اپنی اپنی جگہ پر اہم ہوں - ان میں سے افتتاحیہ اور شذارت کے لیے موضوع کا انتخاب کرتے وقت ان کی تدریجی اہمیت ملحوظ رکھی جاتی ہے اور اس کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے کہ کون سا مسئلہ زیادہ سنگین یا اہم ہے -

توازن اور تنوع

افتتاحیہ اور شذرات کے لیے موضوعات کے انتخاب میں توازن قائم رکھنا ضروری ہے - یعنی افتتاحیہ اہم ترین مسئلے پر لکھا جاتا ہے اور شذرات نسبتاً کم اہم مسائل پر - یہ نہ ہو کہ افتتاحیہ کے لیے نسبتاً کم اہم موضوع منتخب کیا جائے اور شذرات کے لیے اہم تر موضوع - اس کے علاوہ مسائل کی اقسام کے اعتبار سے بھی ان میں توازن قائم رکھنا ضروری ہے - افتتاحیہ اور شذرات کے لیے ایک ہی طرح کے مسائل کا انتخاب مناسب نہیں ہے - مقامی ، قومی ، اور بین الاقوامی موضوعات کے علاوہ

سیاسی ، معاشرتی ، اقتصادی ، ثقافتی موضوعات کے درمیان توازن قائم رکھنا بھی ضروری ہے تاکہ ادارتی کالموں میں متنوع مواد کو جگہ مل سکے اور مختلف طبقوں ، علاقوں یا مذاق کے قارئین اس سے مستفید ہو سکیں ۔ کسی بہت اہم مسئلے پر طویل افتتاحیہ لکھنا ضروری ہو اور شذرات کے لیے جگہ نہ رہے تو الگ بات ہے۔ لیکن ادارتی کالموں میں ایک افتتاحیہ اور دو تین شذرات کو جگہ دینی ہو تو ان کے موضوعات کے انتخاب میں توازن اور تنوع کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے ۔ ماضی میں اخبارات کی تعداد محدود تھی اور صرف اہم قومی یا بین الاقوامی موضوعات پر اداریے لکھے جاتے تھے ، مگر اب تقریباً ہر بڑے شہر سے کئی کئی اخبارات شائع ہوتے ہیں ۔ ان شہروں کی آبادی بھی بہت زیادہ ہوگئی ہے ، اس لیے 'مقامی مسائل' نے بھی اہمیت اختیار کر لی ہے ۔ مثال کے طور پر لاہور کے پندرہ لاکھ شہریوں کا ایک مسئلہ لاہور سے شائع ہونے والے اخبارات کے لیے کراچی کے تیس لاکھ شہریوں کے مسئلے سے زیادہ اہم ہوتا ہے ، کیونکہ لاہور کے اخبارات کے زیادہ قارئین لاہور اور اس کے گرد و نواح میں رہتے ہیں ۔ اگر موضوع کا انتخاب نظریاتی بنیاد پر یا پالیسی کے پیش نظر کرنا ہو تو الگ بات ہے کیونکہ اس صورت میں مسئلے کے مقامی' قومی یا بین‌الاقوامی ہونے کا امتیاز باقی نہیں رہتا ؛ ورنہ کوئی اخبار اپنے حلقۂ قارئین کے مفادات یا احساسات کو پس پشت نہیں ڈال سکتا ۔

عنوان

اداریے کے لیے موضوع یا مسئلے کے انتخاب کے بعد عنوان کا مرحلہ آتا ہے ۔ اداریے کے عنوان کی وہی حیثیت ہوتی ہے جو خبر میں سرخی کی ہوتی ہے ۔ خبر کی سرخی کے چند الفاظ پوری خبر کا خلاصہ بیان کر دیتے ہیں ؛ اسی طرح اداریے کا عنوان

بھی اس کی روح کا مظہر ہونا چاہیے ۔ مثلاً 'بھارتی مسلمانوں پر مظالم' 'اسرائیل کی تازہ جارحیت' 'عالم اسلام کا اتحاد' اور اسی طرح کے عنوانات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اداریے کا لب لباب کیا ہے ۔ عنوان کو تبصرے کی حیثیت دینے کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی رکھنا چاہیے کہ وہ آسان اور عام فہم ہو ۔ ماضی میں اداریہ نویس عام قومی و معاشرتی مسائل پر اداریے لکھتے وقت عموماً اس قسم کے عنوانات استعمال کرتے تھے 'پس چہ باید کرد' ، 'تن ہمہ داغ داغ شد' ، 'مہیب و ہولناک انتشار و افتراق' ۔ یہ عنوانات موضوع سے چاہے جتنی مطابقت رکھتے ہوں مگر ایک عام قاری انہیں سمجھنے سے قاصر رہتا ہے ۔ عنوان کی خوبی یہ ہے کہ وہ مختصر ہو ، آسان ہو اور اپنی جگہ پر تبصرے ، رائے ، تنقید یا نقطۂ نظر کی حیثیت رکھتا ہو ۔

اداریے کی تحریر کے اصول

اب تک جتنی باتیں کہی گئی ہیں وہ اداریہ لکھنے سے پہلے کے مراحل سے متعلق تھیں ۔ موضوع کے انتخاب ، عنوان کے تعین اور ضروری مواد کے حصول کے بعد اداریہ لکھنے کا مرحلہ آتا ہے ۔ اداریہ لکھتے وقت حسب ذیل باتیں ذہن میں رکھنی چاہییں :

اداریے کی ہیئت اور تکنیک

اداریوں کی ہمیشہ ایک خاص ہیئت اور ترکیب ہوتی ہے جسے اداریہ لکھتے وقت پیش نظر رکھنا ضروری ہے ۔ اداریہ نویس کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ آغاز ہی میں اپنا فیصلہ سنا دے یا فریق مخالف پر طعن و تشنیع شروع کر دے اور حقائق و دلائل پیش بھی کرے تو اداریہ کے آخر میں ۔ یہ اسلوب نہ صرف اداریہ نویسی کے فن بلکہ عام تحریر کے اصولوں کے بھی منافی ہے ۔ مؤثر اداریوں

کا آغاز بالعموم اس طرح ہوتا ہے کہ کوئی واقعہ یا حقیقت بیان کرنے کے بعد اس کے پسندیدہ یا ناپسندیدہ ہونے کے متعلق دلائل پیش کیے جاتے ہیں ، جس کے بعد فیصلہ دیا جاتا ہے یا تجاویز پیش کی جاتی ہیں۔ یہ مرحلہ عام طور پر اداریے کے آخر میں آتا ہے۔ 'اداریے کی ہیئت' کے باب میں اس تکنیک کا مفصل ذکر کیا گیا ہے۔ اس تکنیک سے واقفیت کے علاوہ اداریہ نویس کو مختلف موضوعات سے متعلق دوسری مؤثر تحریروں کی ہیئت اور تکنیک کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔

سطحیت سے گریز

موجودہ اداریوں کے غیر مقبول ہونے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان میں سطحیت ہوتی ہے۔ اداریہ نویس کے لیے ضروری ہے کہ وہ بات کو خواہ مخواہ طول دینے کی کوشش نہ کرے اور محض کالم بھرنے کو اپنا مقصد نہ بنائے۔ اسے ایک ایک لفظ کو خوب اچھی طرح ناپ تول کر لکھنا چاہیے۔ اب کامیابی اور مقبولیت انھی اداریوں کے حصے میں آتی ہے جن کی ایک ایک سطر معلومات افزا اور خیال افروز ہو۔ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ دلائل اور بیش از بیش معلومات بہم پہنچا کر اداریے کو مؤثر بنانا چاہیے۔ اداریہ نویس کا فرض ہے کہ وہ سطحیت سے گریز کرے اور کوئی رائے قائم کرنے میں جلد بازی نہ کرے ، بلکہ معاملات کی تہ تک پہنچنے کے بعد کوئی نتیجہ اخذ کرے۔

غیر ضروری اور مشکل الفاظ

تحریر کو جامع اور ٹھوس اسی وقت کہا جا سکتا ہے جب اس میں غیر ضروری الفاظ نہ ہوں۔ پیچیدہ تراکیب ، بوجھل اسلوب ، مبہم فقرے اور مشکل الفاظ بھی تحریر کو ناقابل فہم بنا دیتے ہیں۔

اخبار کا اداریہ کسی خاص طبقے کے لیے نہیں بلکہ عوام و خواص سبھی کے لیے ہوتا ہے ۔ اس کے قارئین میں نیم خواندہ افراد بھی شامل ہوتے ہیں اس لیے مشکل الفاظ سے گریز ضروری ہے ۔ اگر کسی موقع پر کوئی اصطلاح استعمال کرنا ضروری ہو تو اس بات کا لحاظ ضروری ہے کہ اس کی وجہ سے عبارت ناقابل فہم نہ بننے پائے بلکہ سیاق و سباق سے اس کا مفہوم آسانی سے واضح ہوجائے۔

ربط اور تسلسل

ربط اور تسلسل مؤثر تحریر کی ایک اہم خصوصیت ہے ۔ اداریے میں جو خیالات ، حقائق ، دلائل ، تجاویز و آرا اور فیصلے پیش کیے جائیں ان سب میں ربط اور تسلسل ضروری ہے ۔ پوری تحریر ایسی ہونی چاہیے کہ پہلے کوئی بات یا حقیقت بیان کی جائے ، پھر اس کی اہمیت یا اس کے مضمرات کی وضاحت کی جائے ، اس کے بعد دلائل و براہین کی مدد سے اس کے تاریک یا روشن پہلو کے بارے میں رائے بیان کی جائے ۔ یہ عمل اس طرح انجام پانا چاہیے کہ ایک صداقت سے دوسری صداقت کا سرچشمہ پھوٹتا ہوا نظر آئے اور قاری یہ محسوس کرے کہ تمام دلائل اور حقائق صداقت کی ایک لڑی میں پرو دیے گئے ہیں ۔ اسلوب میں اتنا ربط ، اتنا تسلسل اور اتنی روانی ہونی چاہیے کہ قاری غیر ارادی طور پر اس کے ساتھ بہتا جائے اور اس کے دل میں یہ تاثر پیدا ہو کہ اداریہ نویس نے اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا بلکہ خود اس کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی ہے ۔ اس کے برعکس اگر ٹھوس حقائق اور دلائل بھی اس طرح پیش کیے جائیں کہ ایک بات ادھر کی ہو ، دوسری ادھر کی اور درمیان میں کوئی اور ہی قصہ چھیڑ دیا جائے تو اس بے ربطی پر قاری جھنجھلا اٹھتا اور اداریہ نویس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیتا ہے اگر بادل ناخواستہ

وہ مکمل اداریہ پڑھ بھی لے تو ذہنی اُلجھن اور پریشان خیالی کے سوا اس کے ہاتھ کچھ نہیں لگتا۔ اداریے کا محض معلومات افزا ہونا کافی نہیں ہے؛ اداریہ نویس کی کامیابی کا راز صرف حق گوئی اور بیباکی میں مضمر نہیں، اسے صحیح بات صحیح طریقے سے کہنے کا سلیقہ بھی آنا چاہیے۔

پر زور اور مؤثر انداز بیان

اداریے کو مؤثر بنانے کے لیے خیالات کا مربوط ہونا کافی نہیں ہے، الفاظ کی صحیح نشست و ترتیب اور ان کے برمحل استعمال سے انداز بیان کو پر زور بنانا بھی اداریے کی کامیابی کے لیے ضروری ہے۔ افکار کو ایک تسلسل کے ساتھ مناسب الفاظ میں بیان کرنے کا نام زور بیان ہے۔ یعنی اچھے خیالات اور ٹھوس دلائل کو اچھے اور مؤثر الفاظ میں ادا کیا جائے۔ زور بیان کے لیے خیالات میں روانی کے ساتھ ساتھ ان الفاظ میں بھی روانی اور تاثیر ضروری ہے جن میں یہ خیالات پیش کیے گئے ہوں۔

پر زور اور مؤثر انداز بیان کا مطلب یہ ہے کہ قاری کا اپنا نقطۂ نظر اگر اداریہ نویس سے مختلف ہو تب بھی وہ اداریہ نویس کے بیان کیے ہوئے نظریات اور دلائل کی صحت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے، یہ دوسری بات ہے کہ کسی وجہ سے وہ زبان سے اس کا اعتراف نہ کرسکے، کیونکہ اداریے کا اصل مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ قاری کو متاثر اور قائل کیا جائے۔ اس لیے اداریے کو پرزور اور مؤثر بنانے پر سب سے زیادہ توجہ دی جانی چاہیے۔

سائنسدان اور فنکار

بہترین اداریہ نویس وہی ہو سکتا ہے جو بیک وقت سائنسی انداز فکر اور فنکارانہ صلاحیتوں سے بہرہ‌ور ہو۔

ایک سائنس دان ہمیشہ اس کوشش اور کھوج میں مصروف رہتا ہے کہ اس کے سامنے جو اعداد و شمار موجود ہیں ان سے کیا نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔ ایک فنکار کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی پیشکش کو پر اثر اور پرکشش بنائے۔ اگر وہ مصور ہے تو رنگوں کے امتزاج سے بہترین نقش پیش کرے۔ اور اگر ادیب ہے تو بر محل الفاظ کے استعمال سے اثر پیدا کرے۔ اداریہ نگار کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے حقائق سے مواد حاصل کرے اور اسے اثر انگیز پیرائے میں پیش کرے۔ سائنسدان اور اداریہ نگار دونوں کا پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ مواد کا انتخاب کرکے اس کا تفصیلی جائزہ لیں، اس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں، ایک رائے قائم کریں یا ایک نتیجہ اخذ کریں۔ یہاں پر سائنسدان کا کام ختم اور فنکار کا شروع ہو جاتا ہے۔

اداریہ نفسیاتی اعتبار سے درست ہو

اداریہ لکھتے وقت حالات، ماحول اور قارئین کی ضروریات کو پیش نظر رکھنا اور یہ دیکھنا چاہیے کہ اداریہ قارئین کی نفسیات سے مطابقت رکھتا ہو۔ یعنی اس میں ایسی باتیں لکھی جائیں جنھیں قارئین کا ذہن قبول کرلے اور جن سے وہ متاثر ہوسکیں۔ اگر اداریہ نفسیاتی اعتبار سے درست نہیں ہوگا تو انتہائی پر زور، مدلل اور جامع ہونے کے باوجود اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوگا۔ نفسیاتی اعتبار سے غیر درست اداریے کی حیثیت ایک ایسی خوبصورت مزین اور مرصع چیز کی ہے جس میں ظاہری کشش اور سج دھج تو واقعی ہوتی ہے لیکن کوئی اس کا استعمال نہیں جانتا اور وہ بے کار پڑی رہتی ہے

تعمیری نقطہ نظر

تعمیری نقطہ نظر کی جتنی ضرورت اس دور میں ہے، اتنی

شاید پہلے کبھی نہ تھی ، کیوں کہ اب انسان کی تخریب پسندی ، انتہائی ہولناک اور ہلاکت آفریں ثابت ہو سکتی ہے - ایک منصف ، ایک مصلح اور ایک مشیر کی حیثیت سے اداریہ نویس کے لیے ضروری ہے کہ وہ معاشرے کی اصلاح و تعمیر کے لیے مثبت رویہ اختیار کرے - اداریے میں تنقید بھی ضروری ہوتی ہے لیکن اس کا مقصد حالات کی اصلاح ہونا چاہیے - تنقید اور عیب جوئی میں زمین آسمان کا فرق ہے ، کیوں کہ تنقید اگر شائستگی اور صحافتی ضابطہء اخلاق کے دائرے میں رہ کر نہ کی جائے تو اس کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا - باضمیر اداریہ نویس کو دشنام طرازی اور بلیک میلنگ سے ہر قیمت پر اپنا دامن محفوظ رکھنا چاہیے -

اصول پسندی

اداریہ نویس کو اصول پسند ، باوقار اور شائستہ ہونا چاہیے - مرغ باد نما بن کر رہ جانا اس کی عزت نفس اور صحافتی روایات کے منافی ہے - اسے چاہیے کہ اپنی تحریروں میں خود اپنی تردید نہ کرے - اس کے لیے یہ ہرگز مناسب نہیں ہے کہ آج وہ کسی مؤقف کی حمایت میں زمین آسمان کے قلابے ملا دے اور کل اسی مؤقف کی تردید شروع کر دے - آج کی تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا میں موضوعات میں تنوع اور وسعت پیدا ہونے کے بعد تضاد بیانی کا احتمال بڑھ گیا ہے - لیکن اداریہ نویس میں اگر اصابت رائے اور دور اندیشی ہو تو وہ انتہا پسندی سے گریز کرتا ہے - اس کی رائے جچی تلی اور سوچی سمجھی ہوئی ہوتی ہے اور وہ اصول شکنی سے محفوظ رہتا ہے -

جاپان کے اخبارات کے مدیروں اور پبلشروں کی انجمن کے

ضابطہ اخلاق میں درج ہے کہ :

''اداریٰ تبصرے میں صداقت سے انحراف کر کے جانبداری برتنا صحافت کی روح کے منافی ہے ۔ اداریے میں اداریہ نویس کے یقین اور عقیدے کا جرأت مندانہ اظہار ہونا چاہیے اور خوشامد کا شائبہ تک نہیں ہونا چاہیے ۔ اداریہ نویس کو اداریہ لکھتے وقت یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ وہ ان لوگوں کی ترجمانی کر رہا ہے جن کے پاس اپنی آراء کے اظہار کے اور ذرائع نہیں ہیں ۔ اخبار کو اداریہ نویسی کے ذریعے عوام کا ترجمان بنانا چاہیے[۲] ۔''

اداریہ اور صداقت

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اداریہ نویس کو اپنے تبصروں ، تجزیوں اور خیالات کے اظہار میں صداقت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے ۔ لیکن اداریے میں مکمل صداقت کا اظہار نہ تو ممکن ہے اور نہ ضروری ہے ۔ اداریہ ایک طرح سے عصر حاضر کی تاریخ پر تبصرے کی حیثیت رکھتا ہے اور عصر حاضر کی تاریخ سے متعلق مکمل صداقت سے کوئی بھی باخبر نہیں ہو سکتا ۔ پھر صداقت ایک نقطہ نظر سے صداقت ہوتی ہے ، دوسرے نقطہ نظر سے وہ کذب بھی قرار پا سکتی ہے ۔ اخبار جماعتی بھی ہوتے ہیں اور گروہی بھی ۔ ایک اخبار ایک مکتب فکر سے تعلق رکھتا ہے تو دوسرا دوسرے مکتب فکر سے ۔ ایک اخبار کے نزدیک کسی صنعت کو قومیانے کا اقدام مستحسن ہو سکتا ہے تو دوسرے کے نزدیک غیر مستحسن ۔ ایک جماعت کے اخبار کے نزدیک پارلیمانی جمہوری نظام حکومت بہتر ہے تو دوسری جماعت کا اخبار صدارتی نظام کو بہتر اور صحیح سمجھتا ہے ۔ چنانچہ جو چیز ایک اخبار کے نزدیک صداقت ہے وہ

دوسرے کے نزدیک صداقت کے منافی بھی ہو سکتی ہے ۔ چنانچہ اداریے میں مجرد یا مکمل صداقت کا اظہار ممکن نہیں ہے ، لیکن یہ ضروری ہے کہ اداریے میں جو بھی نقطہ نظر پیش کیا جائے وہ پوری دیانت داری سے پیش کیا جائے اور حقائق اور اعداد و شمار پیش کرتے وقت ان کی صحت کو ملحوظ رکھا جائے ۔ متعلقہ واقعے یا خبر کی توضیح و توجیہ صحیح طور پر کی جائے اور اپنے نقطہ نظر سے قارئین کو متفق بنانے اور غور و فکر کرنے کی دعوت دی جائے ۔ خبر یا واقعے کی توضیح و توجیہ کبھی تاریخ کی روشنی میں کی جاتی ہے اور کبھی جغرافیائی پس منظر میں ؛ کبھی متضاد و متصادم قوتوں اور نظریات کی روشنی میں توضیح و توجیہ کرنا ہوتی ہے اور کبھی مسائل کی پیچیدگیوں ، تحریکوں اور رجحانات کی نشاندہی کی جاتی ہے ۔ بہر حال قاری کے نزدیک ایک ہی بات اہم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ اداریے میں زیر بحث آنے والا مسئلہ یا واقعہ اس سے کیا تعلق رکھتا ہے ۔ چنانچہ اداریے میں اس سوال کا جواب موجود ہونا چاہیے کہ ''اس واقعے کا مجھ سے کیا تعلق ہے ؟''

اداریے میں پیرایہ اظہار کی بھی کسی حتمی صورت کی پابندی نہیں ہو سکتی ۔ پیرایہ اظہار کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اداریے میں کہی ہوئی باتیں قاری کی سمجھ میں آ جائیں اور وہ ان سے متاثر ہو ۔ چنانچہ اداریہ نویس کو اس امر کی اجازت ہوتی ہے کہ وہ قارئین کو غور و فکر کی دعوت دیتے وقت فلسفیانہ لہجہ اختیار کرے ، ہلکے پھلکے انداز میں اپنی بات قاری کے ذہن نشین کرا دے یا اشاروں اور معنی خیز کنایوں میں تلخ سے تلخ باتیں کہہ جائے ۔

اداریہ لکھنے کے بعد کیا کرنا چاہیے ؟

اداریہ لکھنے کے بعد اسے دوبارہ پڑھنا ضروری ہے ۔ دوبارہ

اداریہ نویس اداریہ لکھنے کے بعد ـــ کارٹونسٹ کی نظر میں

پڑھتے وقت ان باتوں کا خیال رکھا جاتا ہے :

۱ ۔ اداریے میں سہواً جو الفاظ یا باتیں غلط تحریر ہو جائیں انھیں درست کر دیا جائے ۔

۲ ۔ اداریے کو ایک قاری کے نقطۂ نظر سے پڑھنا اور دیکھنا چاہیے کہ اس کی زبان میں روانی ہے یا نہیں ۔ اگر کہیں ابہام ، تضاد یا تعقید نظر آئے تو اسے دور کر دیا جائے ۔

۳ ۔ دوبارہ پڑھتے وقت بعض الفاظ کی جگہ بہتر اور مؤثر الفاظ ذہن میں آ جاتے ہیں ؛ زبان کی نوک پلک سنوارنے کے لیے الفاظ میں مناسب رد و بدل کر دیا جاتا ہے ۔

۴ ۔ اگر اداریے کی عبارت کسی جگہ مشکل اور ثقیل ہو تو اسے آسان اور عام فہم بنا دیا جائے ۔

۵ ۔ خود سے پوچھا جائے کہ کیا یہ واقعی بہترین اداریہ ہے ؟ اگر اداریہ نویس کو اس کے بہترین ہونے کا یقین نہ ہو تو اس پر مزید محنت کرنی چاہیے ۔

سکالسٹک جرنلزم (Scholastic Journalism) کے مرتبین انگلش اور ہیچ (English & Hach) کا کہنا ہے کہ اداریہ لکھنے کے بعد اداریہ نویس اپنے آپ سے مندرجہ ذیل سوال کرے اگر ان کا جواب اثبات میں ہو تو اداریہ مؤثر اور بہتر ہوگا ۔ اگر جواب اثبات میں نہ ہو تو اداریے پر مزید محنت کی جائے ۔

۱ ۔ کیا اداریہ کی ہیئت اور اسلوب متن اور مقصد سے ہم آہنگ ہیں ؟

۲ ۔ کیا اداریہ کوئی مقصد پورا کرتا ہے ؟

۳ ۔ کیا اداریہ قاری کو غور و فکر پر آمادہ کرتا ہے ؟

۴ - کیا اس میں لکھنے والے کی تخلیقی حس موجود ہے ؟

۵ - کیا تحریر صاف ، پر اثر ، براہ راست اور سادہ ہے ؟

۶ - کیا نتیجہ واضح اور منطقی ہے ؟

۷ - کیا اس میں خلوص کارفرما ہے ؟

۸ - کیا پیراگراف مختصر ہیں ؟

۹ - اداریہ جامع ، مختصر اور مربوط ہے ؟

بہترین اداریے کی خصوصیات

ماہرین نے اداریوں کی جانچ پرکھ کے لیے کوئی کسوٹی تو مقرر نہیں کی ہے تاہم کچھ شرائط مقرر کر دی ہیں جنھیں پورا کرنے پر کوئی اداریہ بہترین اداریہ کہلا سکتا ہے - انھی شرائط کو بہترین اداریے کے اوصاف قرار دیا جا سکتا ہے - یہ اوصاف مندرجہ ذیل ہیں :

۱ - جو واقعات ، اعداد و شمار یا معلومات اداریے میں پیش کی گئی ہوں ، وہ صحیح ہوں اور جس خبر یا واقعے پر اداریہ لکھا گیا ہو ، اس کی توضیح و توجیہ پوری صحت اور دیانت کے ساتھ کی گئی ہو -

۲ - اداریہ بر وقت اور برمحل ہو یعنی وہ کوئی اہم واقعہ رونما ہونے کے فوراً بعد لکھا گیا ہو - اگر واقعہ گزرنے کے بعد تاخیر سے اداریہ لکھا جائے تو اس کی افادیت اور اہمیت ختم ہو جاتی ہے -

۳ - اس میں جو رائے ظاہر کی گئی ہو وہ معقول اور مدلل ہو - اگر اس میں کسی جماعت ، شخصیت ، نظریے ، فلسفے یا

نظام کی مخالفت بھی کی گئی ہو تو معقولیت کے ساتھ ۔

۴ ۔ اگر اداریہ جماعتی نوعیت کا ہو تو اس میں منطق ، استدلال اور معقولیت ہونی چاہیے ۔ اپنی جماعت کی بے جا تعریف ، محض پراپیگنڈا ، اور مخالف جماعت یا جماعتوں کی بے بنیاد جذباتی مخالفت اداریے کی تاثیر اور افادیت ضائع کر دیتی ہے ۔

۵ ۔ اداریے میں شخصیات کی بجائے مسائل کو زیر بحث لایا گیا ہو ۔ اگر شخصیت پر بحث ہو بھی تو مسائل کے واسطے سے یا اس وقت جب کوئی شخصیت ملک یا عوام کے مفاد کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے ۔

۶ ۔ قاری کو جذبات کی رو میں بہا لے جانے کی بجائے اسے دلائل سے قائل کرنے کی کوشش کی جائے ۔ واقعات ، دلائل و مسائل کا تجزیہ غیر جانبداری سے کیا گیا ہو ۔

۷ ۔ اداریے میں رہنمائی کا بنیادی صحافتی فرض ادا کیا گیا ہو ۔

۸ ۔ انفرادی یا جماعتی عقائد اور مذہب پر حملے نہ کیے گئے ہوں ۔ اداریے سے نفرت یا اشتعال یا خوف نہ پیدا ہوتا ہو ، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مختلف عقائد رکھنے والے افراد اگر غلط کام کریں تو ان کا محاسبہ نہ کیا جائے ۔ کسی کے مذہب یا عقیدے پر حملے کیے بغیر بھی اس پر تنقید ہو سکتی ہے ۔

۹ ۔ اداریے میں جو کچھ کہا گیا ہو ، وہ غیر مبہم اور واضح ہو ۔ اس میں واقعی کوئی بات کہی گئی ہو ۔ ایسی بات پڑھنے والے جس پر یقین کر لیں ۔

۱۰ ۔ پورے اداریے میں وحدت تاثر موجود ہو اور یہ اسی

وقت پیدا ہو سکتی ہے جب اداریے کے تمام حصے آپس میں مربوط ہوں اور پیرایہ اظہار موزوں و مؤثر ہو ۔

پاکستان کے مدیران اخبارات کی کونسل کا ضابطۂ اخلاق

پاکستان کے اخبارات کے مدیروں کی کونسل (C.P.N.E.) نے اپنے پیشے کے لیے رضاکارانہ طور پر جو ضابطۂ اخلاق مرتب کر رکھا ہے ، اس میں ادارتی تبصروں کے متعلق مندرجہ ذیل اصول معین کیے گئے ہیں :

۱ ۔ صحافت ایک عوامی ادارہ ہے اور اسے کسی ذاتی مفاد یا غیر سماجی یا اس پیشے کی اقدار کے منافی مقاصد کے لیے استعمال نہیں ہونا چاہیے ، اس لیے ادارتی تبصروں میں عوامی مفاد کو ہر صورت ملحوظ رکھنا چاہیے ۔

۲ ۔ ادارتی تحریر میں خیالات و نظریات کا اختلاف بڑے بھرپور انداز میں ہوتا ہے مگر اختلاف کی شدت زبان کی شائستگی پر اثر انداز نہیں ہونی چاہیے ۔ تنقید منصفانہ اور معروضی ہونی چاہیے ، اور اس سلسلے میں حقائق کو کسی صورت مسخ نہیں کرنا چاہیے ۔

۳ ۔ تحریر میں کسی کی دل آزاری یا استخفاف نہیں ہونا چاہیے اور افراد یا اداروں پر تنقید کے سلسلے میں ازالۂ حیثیت عرفی کے قوانین کی پوری پابندی کرنی چاہیے ۔

۴ ۔ ایسے تبصروں سے اجتناب لازمی ہے جن سے ملک کی سلامتی اور قوم کے استحکام کو گزند پہنچتا ہو ۔

۵ ۔ ایسے تبصروں سے بھی اجتناب کرنا چاہیے جو مسلح افواج کی وفاداری کو متاثر کر سکتے ہوں ۔

۶ ۔ اداری کالموں کو آبادی کے مختلف طبقات کے درمیان منافرت پھیلانے کے لیے ہرگز استعمال نہیں کرنا چاہیے ۔

۷ ۔ خارجی تعلقات کو زیر بحث لاتے وقت ملک کے وسیع تر مفادات اور دوست ملکوں کے ساتھ اپنے قومی تعلقات کی نزاکت کا خیال رکھنا چاہیے ۔

۸ ۔ مزدوروں کے مسائل میں جہاں ان کے جائز حقوق کی ہم نوائی کرنی چاہیے اور انھیں آجروں کے استحصال سے بچانے کی نظریاتی جد و جہد کرنی چاہیے ، وہاں ہڑتال یا صنعتی املاک کی توڑ پھوڑ کے رجحان کی حوصلہ افزائی نہیں کرنی چاہیے ۔

۹ ۔ طلبہ کے مسائل میں بھی جہاں ان کی جائز شکایات کے ازالے کی تعمیری صورتیں تجویز کرنی چاہئیں اور نظام تعلیم کی بہتری کے لیے نظریاتی جہاد کرنا چاہیے، وہاں طلبہ میں ایجی ٹیشن کے رجحان کی حوصلہ افزائی نہیں کرنی چاہیے ۔

سوالات

۱ ۔ اداریہ نویس بننے کے لیے کن اوصاف سے بہرہ ور ہونا ضروری ہے ؟

۲ ۔ ''اداریہ نویس کو فہیم ، محنتی اور متوازن شخصیت کا مالک ہونا چاہیے ۔ بحث کیجیے ۔

۳ ۔ تخلیقی صلاحیت اداریہ نویسی میں کیونکر مدد دیتی ہے ؟

۴ ۔ وسیع مطالعے سے اداریہ لکھنے میں کیسے مدد ملتی ہے ؟

۵ ۔ تاریخ سے واقفیت اداریے کو وسیع ، مدلل اور مؤثر بنانے میں کیسے مدد دیتی ہے ؟

۶ - اداریہ نویس قارئین کے ایمان و یقین کو مضبوط و مستحکم بنانے کے لیے تاریخ سے کس طرح مدد لیتا ہے ؟

۷ - کیا یہ صحیح ہے کہ بیشتر اداریے ایسے ہوتے ہیں جنہیں لکھنے میں تاریخ سے واقفیت مؤثر مدد دیتی ہے ؟

۸ - اداریے کے مواد کے ماخذ پر روشنی ڈالیے -

۹ - اداریہ لکھنے سے پہلے کن امور کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے ؟

۱۰ - اداریہ لکھتے وقت کن اصولوں کو مد نظر رکھنا چاہیے؟

۱۱ - اداریے کی 'زبان' کیسی ہونی چاہیے ؟

۱۲ - اداریہ لکھنے کے بعد اس پر نظرثانی کیوں ضروری ہے ؟

۱۳ - کیا اداریے میں صداقت کا اظہار ممکن ہے ؟ مدلل اور مفصل بحث کیجیے -

۱۴ - پاکستانی اخبارات کے مدیروں کی کونسل کے ضابطہ اخلاق میں اداریہ نویسی کے بارے میں کن اصولوں کی پابندی ضروری قرار دی گئی ہے ؟

حوالہ جات

1- E. Frank Candlin, Teach Yourself Journalism, English Universities Press Ltd. London ; chapter 'Editor's Chair'.

2 - The Democratic Journalist No. 9 1969-article. 'The Canons of Journalism' p. 192.

چوتھا باب

اداریوں کی قسمیں

اصولی طور پر اداریوں کی ایک ہی قسم ہے یعنی اداریہ جو با مقصد اور مؤثر ہو ۔ نہ صرف اداریہ بلکہ پوری صحافت کا مقصد انسانیت اور جمہوریت کی خدمت ہے ۔ ایک مفکر کا کہنا ہے :

> ''جمہوریت کو اس کے انفرادی ، معاشرتی ، بلدیاتی ، ریاستی اور قومی دوائر میں کامیاب بنانے کا ایک اور صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ لوگوں کو حالات و واقعات سے صحیح طور پر اور پوری طرح باخبر رکھا جائے ۔ اخفا کے پردے میں ہر جرم اور ہر گناہ ہوتا ہے ۔ پوشیدہ طور پر ہر فریب ، جعلسازی ، دھوکہ اور چالبازی ہوتی ہے ۔ ان سب چیزوں کو منظر عام پر لاؤ ، ان کا حال بیان کرو ، ان پر وار کرو ، ان کا مضحکہ اڑاؤ ۔ بالآخر رائے عامہ کی قوت ان سب کو بہا لے جائے گی ۔''

اداریہ ایسا ہونا چاہیے کہ وہ اس مقصد کی تکمیل کرے ۔ بایں ہمہ اداریہ کوئی صنف ادب یا علم بھی نہیں ہے کہ ہیئت کی رو سے اس کی قسمیں مقرر کی جا سکیں جیسے شاعری کی مختلف اصناف ہوتی ہیں یا ادب کی الگ الگ قسمیں ہوتی ہیں ۔ تاہم بعض

لوگوں نے اداریوں کو سمجھنے اور لکھنے میں آسانی کی خاطر ان کی قسمیں مقرر کی ہیں ؛ بالکل اسی طرح جیسے خبر یا فیچر کی اقسام ہوتی ہیں ۔ یہ اقسام مندرجہ ذیل ہیں :

موضوع کے لحاظ سے قسمیں

موضوع کے لحاظ سے اداریے کو عموماً مندرجہ ذیل قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :

۱ ۔ خبروں پر مبنی اداریے ۔
۲ ۔ پالیسی پر مبنی یا جماعتی اداریے ۔
۳ ۔ معاشرتی اداریے ۔
۴ ۔ خصوصی اداریے ۔

وضاحت

۱ ۔ خبروں پر مبنی اداریے اہم خبروں کے متعلق یا انہیں بنیاد بنا کر لکھے جاتے ہیں ۔ روزناموں کے بیشتر اداریے خبروں ہی پر مبنی ہوتے ہیں ۔ اداریوں کی یہ قسم باقی تین اقسام سے یکسر الگ نہیں ہوتی ؛ خبر پر مبنی اداریہ جماعتی اداریہ بھی ہو سکتا ہے اور سماجی بھی ۔ اگر کسی خبر کو اداریہ کی بنیاد بنایا جائے اور صرف متعلقہ واقعہ یا اس کے مختلف پہلوؤں کو زیر بحث لایا جائے تو اداریہ خالصتاً خبر پر مبنی ہوگا جیسا کہ مندرجہ ذیل مثالوں سے واضح ہے ۔

خبروں پر مبنی اداریے

۱ ۔ ''عوامی مسائل اور اختیارات کی تقسیم

مغربی پاکستان کے گورنر نے اعلان کیا ہے کہ صوبائی

نظم و نسق میں لامرکزیت پیدا کی جائے گی تاکہ اسے عوام سے قریب تر لایا جا سکے ۔ اس فیصلے کے تحت سب ڈویژن یا تحصیل کو انتظامی ڈھانچے کا یونٹ بنا دیا جائے گا تاکہ عوام کے مسائل اور مشکلات مقامی سطح پر حل ہو سکیں اور انہیں اضلاع یا ڈویژن کے صدر مقام پر نہ جانا پڑے ۔

حکومت کا بنیادی اور اہم ترین فریضہ عوام کے مسائل حل کرنا ہے ۔ اس لیے کسی حکومت کے اچھی یا خراب ہونے کا اندازہ صرف یہ دیکھ کر لگایا جاتا ہے کہ وہ عوام کے کتنے مسائل حل کرتی ہے اور روزمرہ کی زندگی میں انہیں کئی سہولتیں حاصل ہوتی ہیں ۔ اس ضمن میں فیصلہ کن حیثیت کسی حکومت کے عزائم یا اعلانات کو نہیں بلکہ اس کے اعمال کو حاصل ہوتی ہے ۔ یعنی کسی حکومت کی جانب سے محض یہ دعویٰ کر دینا کافی نہیں ہے کہ وہ عوام کی خادم اور دردمند ہے ؛ اس کا ثبوت اسے اپنے عمل سے بھی دینا چاہیے ۔

موجودہ نظام حکومت کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس میں قواعد و ضوابط کو انسان اور انسانی تقاضوں سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے ۔ یہ صورت حال اس لیے پیدا ہوئی ہے کہ حکومت کے جو شعبے عوام کی فلاح و بہبود اور ترقیاتی کاموں میں مصروف ہیں ، انہیں ثانوی حیثیت حاصل ہے اور امن و امان یا دفتری نظام چلانے والے شعبوں کے ہاتھوں میں تمام اختیارات مرکوز ہیں ۔

موجودہ نظام کی ایک مضحکہ خیز حد تک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ اس کے تحت سول سروسوں کو بھی مصنوعی طور پر مختلف شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے جس کی وجہ سے ان سروسوں سے وابستہ افراد کے سامنے کوئی قومی مطمح نظر باقی نہیں رہ جاتا ۔ جہاں تک قومی مفادات اور عوامی بہبود کا تعلق

ہے ۔ تمام سروسوں کے فرائض یکساں اہمیت رکھتے ہیں بلکہ عوام کے نقطۂ نظر سے ایک مجسٹریٹ کے مقابلے میں ایک ڈاکٹر کو زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے ۔ لیکن کمشنر یا ڈپٹی کمشنر کو بہر حال اپنے ڈویژن یا ضلع کے محکموں کی سربراہی حاصل ہوتی ہے ۔ حالانکہ اب انتظامی اور فلاحی شعبوں کے درمیان کوئی حد فاصل نہیں ہونی چاہیے ، بلکہ دانشمندی کا تقاضا تو یہ ہے کہ حکومت کے مختلف شعبوں کی فلاحی سرگرمیوں کو روزمرہ کے نظم و نسق سے متعلق امور پر ترجیح دی جائے ۔

ضلع کی بجائے تحصیل اور سب ڈویژن کو انتظامی ڈھانچے کا بنیادی یونٹ بنانے کا فیصلہ یقیناً بہت دانش مندانہ ہے ۔ لیکن یہ تنظیم نو صرف اس وقت نتیجہ خیز اور سود مند ثابت ہو سکتی ہے جب نظم و نسق کا پورا ڈھانچہ تبدیل کرنے کا اہتمام بھی کیا جائے کیوں کہ سی ۔ ایس ۔ پی افسروں کا چھوٹا سا طبقہ اسی طرح سیاہ و سپید کا مالک رہا تو کوئی انتظامی اصلاح کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی ، عوام کی فلاح و بہبود کے منصوبوں سے عام لوگوں کی زندگی میں کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا اور ترقی کے راستے میں سرخ فیتہ اسی طرح رکاوٹ بنا رہے گا ۔

ملک میں تعمیر و ترقی کے منصوبوں پر اگرچہ اربوں روپیہ خرچ کیا جا چکا ہے لیکن اس سے عوام کا معیار زندگی بلند نہیں ہو سکا ۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ دفتر شاہی اپنے آپ کو عوام کی بجائے حکومت وقت کا خادم سمجھتی رہی ہے ۔ جب تک فکر و نظر کا یہ انداز نہیں بدلے گا اور دفتر شاہی کے ارکان اپنی استعماری روایات کو خیرباد نہیں کہیں گے وہ کبھی عوام کے خادم نہیں بن سکتے ۔ پٹواری سے چیف سکریٹری تک ہر سطح پر یہ تبدیلی لانا سب سے بڑی ضرورت ہے ۔ اس کے بغیر ہم

پاکستان کو ایک فلاحی مملکت بنانے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

انتظامیہ میں اصلاح کے سلسلے میں اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ سرکاری افسروں کے اختیارات تمیزی محدود کیے جائیں اور معاملات کا فیصلہ محض ان کی صوابدید پر نہ چھوڑ دیا جائے بلکہ ان پر ضروری بندشیں عائد کر دی جائیں کیوں کہ انتظامیہ کی بیشتر خرابیاں اختیارات کی کمی کے باعث نہیں بلکہ ان کے غلط استعمال کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں''

(مشرق - ۱۲ اکتوبر ۱۹۶۹ء)

۲ - ''سازشوں کا چکر

لیبیا کے بعد سوڈان میں بھی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش پکڑی گئی ہے۔ دونوں حکومتوں نے یہ الزام عائد کیا ہے کہ سازش میں بیرونی قوتوں کا بھی ہاتھ ہے۔ سوڈان کے سربراہ نے تو امریکہ کو بالواسطہ طریقے سے ملزم ٹھہرایا ہے اور قدامت پسند اخوان کو ذمہ دار گردانا ہے مگر لیبیا کی حکومت کے اعلان میں کسی کا نام نہیں لیا گیا؛ اس میں صرف یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ سازش کرنے والوں میں وزراء بھی شریک تھے۔ ان میں سے کچھ اصحاب تو ایسے ہیں جو فوجی انقلاب سے پہلے جیل میں تھے یا گمنامی کی زندگی بسر کر رہے تھے، انہیں قید سے آزاد کر کے یا گوشہ سے بلا کر اعلیٰ مناصب سونپے گئے۔ اگرچہ یہ الزام انوکھا نہیں ہے کہ سازش کا جال پھیلانے والے استعمار کے آلۂ کار اور خادم ہیں اور انہوں نے استعماری مفادات کی خاطر اپنی حکومت کا تختہ الٹنے کے منصوبے تیار کیے ہیں۔ مگر مشرق وسطیٰ اور خاص طور سے عرب دنیا کی سیاست اور حالات پیش نظر ہوں اور لیبیا اور سوڈان کی معدنی دولت اور جغرافیائی اہمیت کا اندازہ

ہو تو یہ بات بعید از امکان نہیں ہے کہ بعض بڑی قوتیں لیبیا اور سوڈان بلکہ کئی دوسری عرب حکومتوں سے بھی نجات حاصل کرنا چاہتی ہیں اور اس انتظار میں ہیں کہ موجودہ قائدین اقتدار سے محروم ہوں تو وہ ان کے جانشینوں سے معاملہ کریں اور اپنی کچھ غیر معمولی مگر منسوخ شدہ مراعات واپس لے لیں۔ ان قوتوں کے قول و فعل سے بعض اوقات ان کی بے صبری بھی ظاہر ہو جاتی ہے اور یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ وہ ابھی تک ماضی کے استعماری خواب دیکھ رہی ہیں اور اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ اب ایشیائی اور افریقی اقوام آزاد اور خود مختار ہیں اور اپنے حقوق و مفادات کی حفاظت کرنے کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتی ہیں۔

یہ سب صحیح ہے مگر عرب راہنماؤں کو یہ بنیادی نکتہ نظرانداز نہیں کرنا چاہیے کہ ان میں سے بیشتر ابھی تک کوئی ایسا آئینی نظام اور انتظامی ڈھانچہ قائم نہیں کر سکے جسے عوام اپنا سمجھیں اور جس کی حفاظت کرنے کے لیے وہ سر دھڑ کی بازی لگا دیں۔ ان کے ملکوں میں وہ خلا موجود ہے جسے پر کرنے کے لیے سازشوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور جس سے استعماری قوتیں بھی فائدہ اٹھانا چاہتی ہیں اور کچھ کم اندیش افراد کو اپنا آلہ کار بنانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ سوڈان اور لیبیا کے انقلابی رہنماؤں نے اگرچہ چند ماہ پہلے اقتدار کی عنان سنبھالی ہے، مگر حفاظت اور دور اندیشی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ابھی سے ایک ایسا انتظامی اور آئینی ڈھانچہ قائم کرنے کی کوششیں کریں جس کی بدولت آئینی اور سیاسی خلا باقی نہ رہے اور اصلاحی اور افادی پروگرام عوام کے بھرپور تعاون سے مکمل ہوتے رہیں۔ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ جس حکومت کے کاروبار میں عوام براہ راست شریک ہوں گے اور اس کی تائید کرتے ہوں گے

اس کا تختہ الٹنے کی سازش کرنے والوں کا حوصلہ پست رہے گا اور خواہش کے باوجود وہ اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کی کبھی جرأت نہ کر سکیں گے'' ۔ (امروز ۱۵ دسمبر ۱۹۶۹ء)

اگر کسی خبر پر اداریہ معاشرتی نقطہ نظر سے لکھا جائے تو وہ بیک وقت خبر پر مبنی ہونے کے علاوہ معاشرتی بھی ہوگا ۔ مثلاً

خبر پر مبنی معاشرتی اداریے

۱- ''یہ سفاکی !

اشیائے خوردنی میں ملاوٹ کی ایک انتہائی ہولناک مثال سامنے آئی ہے ۔ مشرق پاکستان کے مارشل لاء حکام نے سمگلنگ کے ایک مقدمے کی تحقیق و تفتیش کے دوران خوردنی تیلوں میں ایک زہریلے مادے کی ملاوٹ کا پتا چلایا ہے ۔ یہ گھناؤنا کاروبار کئی سال سے جاری تھا ۔ زہریلا مادہ غیر ممالک سے درآمد کرکے گھٹیا قسم کے تیلوں میں ملا دیا جاتا تھا جس سے ان کا رنگ اور خوشبو سرسوں کے خالص تیل جیسی ہو جاتی تھی ۔ یہ زہریلا کیمیکل بموں اور نیپام گیس کی تیاری میں کام آتا ہے اور دوسری جنگ عظیم میں کیمیائی ہتھیار کے طور پر استعمال ہو چکا ہے ۔ ڈاکٹروں اور سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ اس کی ملاوٹ کے بعد تیار ہونے والے گھی اور تیل کے استعمال سے موت یقینی ہوتی ہے ۔ فوری طور پر جلد میں جلن ہو جاتی ہے اور پھیپھڑے خراب ہو جاتے ہیں اور پھر آہستہ آہستہ بیماری اپنے پنجے گاڑ لیتی ہے ۔ مشرق پاکستان کے عوام کی صحت پر یہ حملہ کئی سال سے جاری ہے ۔ عین ممکن ہے کہ مغربی پاکستان میں بھی یہی کچھ ہو رہا ہو ۔ سمگلر اور تیل کے کارخانہ دار اس جرم میں برابر کے شریک ہیں ۔ انھوں نے لاکھوں عوام کی جانوں کو خطرے میں ڈال کر راتوں رات دولتمند بننے کی ہوس کو پورا کرنے کی کوشش کی

ہے۔ اس سے زیادہ سفاکی اور عوام دشمنی اور کیا ہو سکتی ہے جسے ہرگز برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے تمام کارخانہ داروں کو عبرت ناک سزائیں ملنی چاہئیں۔ اس کے علاوہ دوسری اشیائے خوردنی کی تیاری میں استعمال ہونے والے خام اجزا کی بھی جو باہر سے درآمد کیے جاتے ہیں تفصیلی جانچ پڑتال ہونی چاہیے۔ اس جانب بھرپور توجہ مارشل لا حکام کی بہت بڑی عوامی خدمت ہوگی''۔ (حریت کراچی ۲۹ اکتوبر ۱۹۶۹ء)

۲۔ ''خوش حال افراد کا فرض

صدر جنرل یحییٰ خاں نے خوشحال افراد سے اپیل کی ہے کہ وہ اپنے کم نصیب بھائیوں کی ساجی بھلائی کے لیے امداد کریں، کیوں کہ کوئی حکومت اس بہت بڑے کام کو تنہا انجام نہیں دے سکتی۔ اس کے لیے حکومت کو مخیر افراد اور اداروں کی رضاکارانہ امداد پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔

پاکستان ایک غریب اور پس ماندہ ملک ہے جس کے باشندوں کی بہت بڑی اکثریت کو اتنی بھی آمدنی نہیں ہوتی کہ وہ اپنی روزمرہ کی ضرورتیں تک پوری کر سکیں۔ انھیں کھانے کو صحت بخش خوراک میسر نہیں ہے، ان کے پاس تن پوشی کے لیے کپڑے اور سر چھپانے کو مکان نہیں۔ وہ بیمار پڑتے ہیں تو انھیں دوا میسر نہیں آتی۔ وہ اتنی استطاعت نہیں رکھتے کہ اپنے بچوں کو معمولی سی تعلیم بھی دے سکیں۔

یہ تمام مسائل اتنے سنگین اور ملک گیر ہیں کہ بحیثیت مجموعی ان کا جائزہ لیا جائے تو دل بیٹھنے لگتا ہے اور ذہن پر ایک گھٹا سی چھا جاتی ہے۔ لیکن ہمیں کسی مسئلے سے اسی وقت نجات مل سکتی ہے جب اسے حل کرنے کی سرگرمی سے کوشش کی جائے۔ اس لیے مایوسی اور ناامیدی کی بجائے ہمیں اپنے دل

میں یہ عزم اور جذبہ پیدا کرنا ہوگا کہ ہم اپنے وطن کی تعمیر و ترقی کے لیے تن دہی سے مصروف عمل رہیں گے۔

جہاں تک حکومت کا تعلق ہے وہ معاشی اصلاح اور عوامی مسائل حل کرنے کے لیے اپنی صلاحیت و استطاعت کے مطابق کوشش کر رہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے منصوبوں اور اس کی پالیسیوں میں بھی بہت سی خرابیاں ہیں لیکن حکومت پر بے عملی کا الزام بہر حال نہیں لگایا جا سکتا۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ حکومت کے وسائل محدود ہیں جس کے باعث وہ اپنے منصوبوں کو صرف بتدریج عملی جامہ پہنا سکتی ہے۔

سرمائے کی یہ کمی ملک کے ارباب ثروت بڑی آسانی کے ساتھ پوری کر سکتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے ان کی ایک بڑی تعداد نے اب تک اپنی معاشرتی اور قومی ذمہ داریاں محسوس نہیں کیں۔ اس طبقے کے افراد کو روپیہ کمانے اور اپنے ذاتی عیش و عشرت سے زیادہ دلچسپی ہے۔ دنیا کے تمام جمہوری ملکوں کے دولت مند اور خوشحال افراد عوام کی فلاح و بہبود کے لیے ادارے قائم کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ لیکن اسلام سے وابستگی کے دعوے کے باوجود ہم اس طرف بہت کم توجہ کرتے ہیں۔ ارباب ثروت کو سوچنا چاہیے کہ اقتصادی تفاوت اگر طویل مدت تک برقرار رہا تو سب سے زیادہ نقصان خود ان کو اٹھانا پڑے گا۔"

(مشرق ۳۰ اکتوبر ۱۹۶۹ع)

اگر کسی خبر پر اداریہ لکھتے وقت اخبار کی پالیسی، رجحان یا نقطہ نظر کو سامنے رکھا گیا ہو تو اداریہ خبر پر مبنی ہونے کے ساتھ ساتھ پالیسی پر بھی مبنی ہوگا۔ جیسے :

خبر اور پالیسی پر مبنی اداریہ

نظریاتی اساس پر حملے

دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت ــــ پاکستان ــــ اسلام کے نام پر معرض وجود میں آئی تھی۔ اسلامیان ہند نے اپنے محبوب رہنما حضرت قائد اعظم محمد علی جناح کی زیر قیادت ایک علیحدہ وطن محض اس لیے حاصل کیا تھا وہ یہاں پوری آزادی سے دین مبین، شریعت محمدیہ اور اسلامی روایات و شعائر کے مطابق زندگیاں بسر کر سکیں۔ لیکن یہ حقیقت بڑی ہی تکلیف دہ ہے کہ حصول پاکستان کے بعد ہم نے اصل مقصد کو فراموش کر دیا۔ دنیاوی اغراض و مفادات، جاہ و حشمت اور ظاہری نمود و نمائش کی دوڑ میں ہم اس قدر آگے نکل گئے ہیں کہ ہماری منزل گرد و غبار کے بگولوں میں اٹ کر رہ گئی ہے۔ گزشتہ بائیس برس کے دوران میں قومی زندگی کے ہر شعبے کو اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالنے کے دعوے تو بہت کیے گئے، لیکن عملاً ہم اسلام سے دور ہی ہٹتے چلے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نظریۂ پاکستان اور اسلام کے مخالف عناصر کو کھل کھیلنے کا موقع ملا۔ انھوں نے سیاسی، ثقافتی، ادبی، صحافتی، صنعتی، تجارتی شعبوں میں کمیں گاہیں بنا لیں اور اتنے دیدہ دلیر ہو گئے ہیں کہ کھلم کھلا پاکستان کو لادینی مملکت بنانے کے نعرے لگانے لگے۔ گزشتہ دس سال کے دوران میں ملک پر آمریت کے مہیب سائے مسلط رہے۔ گھٹن کی فضا بالعموم زیر زمین سرگرمیوں کے لیے بڑی سازگار ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ دہ سالہ آمریت کی فضا میں لادینی تحریکوں اور مخالف اسلام عناصر کو مزید تقویت پہنچی اور وہ کھلم کھلا اسلامی شعائر کی تضحیک و اہانت کرنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب آمریت کی تاریکیاں چھٹنے لگیں تو یہ عناصر بھانت بھانت کی بولیاں بولتے ہوئے عوام کو گمراہ کرنے

لگے ۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے ۔ کبھی اسلام میں سوشلزم کے پیوند لگائے جاتے ہیں ۔ کبھی کسی ازم کا نعرہ بلند کیا جاتا ہے ، تو کبھی طے شدہ آئینی و سیاسی مسائل دوبارہ اٹھا کر قوم کو فکری و نظریاتی انتشار سے دوچار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ ان کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ کائنات ارضی کے اس خطے میں اسلام کا نام نہ لیا جائے ۔

ہماری اس تمہید کے محرک پاک فضائیہ کے سابق سربراہ اور ممتاز سیاست دان ایئر مارشل اصغر خاں اور پاکستان ڈیمو کریٹک پارٹی کے رہنما نوابزادہ نصراللہ خاں کے تازہ ترین بیانات ہوئے ۔ ایئر مارشل اصغر خاں نے شکارپور میں سیاسی کارکنوں کے ایک اجتماع میں ملک کے موجودہ حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے اعلان کیا ہے کہ پاکستان کے عوام کسی صورت میں ''سوشلزم'' کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے ۔ نوابزادہ نصراللہ خاں نے یہی بات کراچی میں ذرا واضح انداز میں کہی ہے اور واشگاف

الفاظ میں کہا ہے کہ : ''کمیونسٹ عناصر آج پاکستان بھر میں بنگالی ، سندھی ، بلوچ ، پختون نیشنل ازم کا لبادہ اوڑھ کر پاکستان دشمن سرگرمیوں میں مصروف ہیں ۔ پاکستان اسلام اور جمہوریت کے نفاذ کے لیے معرض وجود میں آیا تھا اس لیے محب وطن پاکستانیوں اور اسلام پسندوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ان نظریات اور اصولوں کے تحفظ کے لیے متحد ہو جائیں جن کے لیے پاکستان حاصل کیا گیا تھا ۔''

پاکستان اسلام اور جمہوریت کے نام پر معرض وجود میں آیا تھا اور ہم یہ بات بحث کی خاطر بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں کہ یہاں اسلام اور جمہوریت کے سوا کوئی اور نظام بھی نافذ ہو سکتا ہے ۔ یہ بات ناقابل فہم ہے کہ خدا و رسولؐ کے نام پر قائم ہونے والے اس ملک میں آخر سرخ عناصر کو کھل

کھیلنے اور طرح طرح کے انتشار انگیز نعرے لگانے کی کیوں اجازت دی جا رہی ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام اور جمہوریت فرد کی آزادی اظہار کے قائل و معترف ہیں ، (بلکہ اسلام اور جمہوریت میں اظہار کی جتنی آزادی ہے اتنی آزادی کسی نظام میں نہیں اور اشتراکیت و اشتمالیت تو فرد کے حقوق اور آزادیوں کو مفلوج کرکے رکھ دیتے ہیں) لیکن یہ کیسی آزادی ہے کہ ایک جانب تو لوگ لب شکایت وا کرنے اور دل کی بات زبان تک لانے کو ترستے ہیں اور دوسری جانب اسلام دشمن عناصر کو شریعت بیضا کی بنیادیں متزلزل کرنے کی اور پاکستان کی جڑیں کھوکھلی کرنے کی کھلی چھٹی ہے ۔ اظہار افکار و نظریات کی آزادی کے اعتبار سے برطانیہ ایک مثالی ملک ہے ۔ آج کا انگریز اتنا مذہب پرست بھی نہیں بلکہ نوجوان طبقہ تو مذہب سے بیگانہ ہی ہے ۔ لیکن وہاں بھی کسی کو یہ جرأت نہیں ہو سکتی کہ کلیسائے انگلستان کی سربراہ ملکہ الزبتھ ثانی کی ذات پر کوئی رکیک حملہ کر سکے ۔ ہم یہ سمجھنے سے بھی قاصر ہیں کہ جس ملک میں کمیونسٹ پارٹی پر برسوں سے پابندیاں عائد ہیں وہاں زیر زمین کمیونسٹوں کو ادبی ، ثقافتی ، سیاسی ، صحافتی ، معاشرتی ، الغرض ہر محاذ سے پاکستان کے اساسی نظریات ــ اسلام اور جمہوریت ــ پر وار کرنے کی کیوں کھلی چھٹی ہے ؟ اور انہیں سرکاری امداد و اعانت سے چلنے والے اداروں میں کمیں گاہیں بنانے کی کیوں اجازت ہے ؟ ہم اس مرحلے پر پاکستان کے ارباب اقتدار و اختیار اور محب وطن عناصر اور اسلام کی سربلندی کے لیے کام کرنے والی قوتوں کو صاف طور پر کہہ دینا چاہتے ہیں کہ اگر انہوں نے اس نازک صورت حال کا احساس نہ کیا ، لادینی قوتوں کو اسی طرح تقویت حاصل ہوتی رہی اور کمیونسٹ عناصر کو اسی طرح کھل کھیلنے کا موقع ملتا رہا تو پھر وہ منحوس دن دور نہیں جب پاکستان کو

ایک مثالی اسلامی مملکت بنانے کا خواب (خدا نخواستہ) پریشان ہو کر رہ جائے گا۔ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے۔ اس کی نظریاتی اساس اسلام اور جمہوریت ہے۔ پاکستان میں کمیونسٹوں، ملحدوں اور لادینیت کے پجاریوں کو اپنے نظریات کے پرچار کی اس سے زیادہ اجازت ہرگز نہیں ہونی چاہیے جتنی کمیونسٹ ملکوں میں اسلام اور جمہوریت کا نام لینے کی ہے۔''

(ندائے ملت - ۲۷ جولائی ۱۹۶۹ء)

جماعتی روزنامے یا متضاد نقطہ ہائے نظر سے تعلق رکھنے والے اخبارات عموماً یہی انداز اختیار کرتے ہیں۔ یعنی وہ اداریے کو ہنگامی بنانے کے لیے تازہ خبر کو اس کی بنیاد بناتے ہیں مگر رائے یا فیصلہ اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے دیتے ہیں۔ اس کے برعکس غیر جانبدار اخبار اپنے تبصرے کو کسی خاص واقعہ کے محرکات اور اثرات کے جائزے تک محدود رکھتے ہیں۔

پالیسی پر مبنی اداریے کا مقصد اپنی جماعت، مکتب فکر یا گروہ کی پالیسی کی تبلیغ، اس کے مطابق رائے عامہ کی تشکیل یا مخالفوں کی باتوں اور پراپیگنڈے کا جواب، ان پر اعتراضات کرنا یا اپنے مؤقف کی وضاحت اور تشریح ہوتا ہے۔ جماعتی اخبارات کے اداریے عموماً پالیسی پر مبنی ہوتے ہیں یعنی وہ زیادہ تر کسی خبر کو اداریے کی بنیاد بناتے ہیں، مگر اس خبر پر تبصرہ یا اظہار رائے اپنی پالیسی کے مطابق کرتے ہیں اس لیے ان کے اداریے بیک وقت خبروں پر مبنی بھی ہوتے ہیں اور جماعتی بھی۔ اگرچہ نٹراجن کا مشورہ یہ ہے کہ: ''ہر ایسا معاملہ جس پر (اداریے میں) تبصرہ مقصود ہو، لازماً پالیسی سے متعلق نہیں ہوتا۔ مناسب یہ ہے کہ پالیسی پر مبنی اداریے کم سے کم ہوں اور واضح مسائل تک محدود رکھے جائیں[1]۔'' مناسب یہی ہے کہ پالیسی پر مبنی

اداریہ واضح طور پر پالیسی ہی کا مظہر ہو اور ہر معاملے میں پالیسی کو داخل نہ کیا جائے ۔ ظاہر ہے کہ پالیسی اہم سیاسی یا اقتصادی معاملات و مسائل ہی کے بارے میں ہو سکتی ہے ، اس لیے جب کوئی واضح مسئلہ در پیش ہو تو اس پر پالیسی کے مطابق لکھا جائے ، ورنہ اداریے کو خبر پر صحیح تبصرے کی صورت دی جائے ۔

پالیسی پر مبنی اداریوں کی مثالیں

۱ - ''پاکستان اور نظریہ' پاکستان

یہ ایک صاف اور واضح بات ہے کہ پاکستان کی وحدت اور سالمیت کی حفاظت صرف ایک آئیڈیالوجی اور نظریے کے ذریعے ہی کی جا سکتی ہے ۔ مشرقی پاکستان کو اگر آج مغربی بنگال سے کسی چیز نے جدا کر رکھا ہے تو وہ اس نظریے کے سوا اور کیا ہے جس کی بنیاد پر پاکستان حاصل کیا گیا تھا ۔ ملک کے مغربی بازو کو اس کے مشرقی بازو سے کاٹ دینے کے لیے بہت سے اسباب و محرکات موجود ہیں ۔ جغرافیائی اعتبار سے دونوں صوبوں میں کوئی مناسبت و یگانگت موجود نہیں ہے ۔ ایک ہزار میل کا طویل فاصلہ اور دونوں حصوں کے درمیان ۵۰ کروڑ کی آبادی رکھنے والا ایک ایسا جارح و متعصب ملک حائل ہے ، جس کی اکثریت مسلمانوں کو اس راستے سے نکال دینا چاہتی ہے جس راستے سے وہ اس برصغیر میں دخل ہوئے تھے ۔ اس طرح وہ اکھنڈ بھارت کے پرانے خواب کو پورا کرنا چاہتی ہے ۔ مغربی بنگال کے کمیونسٹوں نے متحدہ بنگال کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دے لیا ہے اور وہ مشرقی و مغربی بنگال کو ملا کر بھارت میں لادینی بنیادوں پر ایک خود مختار سوشلسٹ ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں ۔ اس عنصر کو بھارت کے فرقہ پرستوں کی درپردہ محض اس لیے

حمایت حاصل ہے کہ اس طرح مسلمان اور پاکستان ایک ناقابل برداشت مہلک ضرب کا شکار ہو جائیں گے - جب پاکستان کا ایک بازو کٹ جائے گا تو دونوں بازو علیحدہ ہو کر اس قدر کمزور ہو جائیں گے کہ اپنا وجود بھی باقی نہ رکھ سکیں گے - زبان کے اعتبار سے بھی دونوں صوبوں میں یگانگت سے زیادہ مغائرت و اجنبیت موجود ہے - غرض یہ کہ جغرافیائی ، اسانی اور مادی اعتبار سے وہ سارے اسباب و عوامل موجود ہیں جو اسے مغربی پاکستان سے زیادہ مغربی بنگال سے وابستہ کر سکتے ہیں ، اور یہ ایسے زوردار عوامل ہیں کہ جن کی موجودگی میں کوئی سیاسی نظریہ مشرق اور مغربی بنگال کے درمیان علیحدگی کی دیوار کھڑی نہیں کر سکتا - لیکن ان ساری مناسبتوں اور یگانگتوں کے باوجود ایک دوسرے سے دور ایک ہزار میل کے فاصلے پر واقع ان دو خطوں کو صرف اس نظریے نے جوڑ رکھا ہے جسے کلمہ' طیبہ کے دو فقروں میں سمو دیا گیا ہے - اسی کی بنیاد پر پاکستان حاصل کیا گیا تھا - اس کلمے کی قوت ، جامعیت ، جاذبیت اور شدید عصبیت کا اندازہ اس وحدت سے لگایا جا سکتا ہے جو گزشتہ بائیس سال سے ملک کے دونوں بازوؤں کے درمیان پائی جاتی ہے - یہ اسلام ہی ہے جس نے مشرق پاکستان کو صرف مغربی پاکسان ہی سے نہیں بلکہ سارے عالم اسلام سے جوڑ رکھا ہے - اگر خدا نخواستہ مغربی بنگال کے کمیونسٹوں اور فرقہ پرستوں کو جو اپنے ایجنٹوں کے ذریعے مشرق پاکستان میں شرپسند نعروں کو مقبول بناتے ، مختلف فتنے کھڑے کرتے اور عصبیتوں کو ہوا دیتے رہتے ہیں اپنی سازشوں کو عملی جامہ پہنانے کا موقع مل گیا اور ملک کا یہ مشرق بازو اپنے مغربی بازو سے کٹ گیا تو اندازہ کیجیے کہ ان کروڑوں مسلمانوں کا انجام کیا ہوگا جو پورے صدق و اخلاص کے ساتھ اسلام سے وابستہ رہنا چاہتے ہیں - بڑی بڑی آبادیوں

کے جس سمندر میں وہ گھرے ہوئے ہیں اس میں ڈوبنے سے انہیں دنیا کی کون سی طاقت بچا سکے گی ؟ آج بھارت میں اپنی مذہبی انفرادیت برقرار رکھنے کی کوشش کرنے والے مسلمانوں کا حشر ہمارے سامنے ہے ، اور دنیا کی ان بڑی بڑی مسلم اقلیتوں کی تاریخ بھی ہمارے سامنے ہے جن کے نام تو آج مسلمانوں جیسے ہی ہیں لیکن وہ اپنی نظریاتی و تہذیبی انفرادیت کھو چکے ہیں - آج مشرقی پاکستان کو مغربی بنگال کے کمیونسٹوں ، بھارتی فرقہ پرستوں ، ان کے ایجنٹوں اور ان کی خطرناک سازشوں سے اگر کوئی چیز بچا سکتی ہے اور اسے مغربی پاکستان سے وابستہ رکھ سکتی ہے تو وہ صرف ایک ایسا مضبوط ارادہ ہے جو پوری قوت و طاقت سے کام لے کر اسلام کے سیاسی اور معاشی نظام کو اس کے پورے تقاضوں اور شرائط کے ساتھ نافذ کردے اور اسے ایک مکمل نظریاتی مملکت بنانے کا فیصلہ کر لے - یہ ملک ایک خاص نظریے کی بنیاد پر حاصل کیا گیا ہے - گنتی کے چند افراد کو چھوڑ کر سارا ملک اسلام کے سیاسی و معاشی نظام کا حامی ہے - عوام کی اس آرزو اور آزادی و خود مختاری کے باوجود پھر وہ کون سی چیز ہے جو اس راستے میں حائل ہے ؟ اگر ملک کا کوئی با اختیار فرد اور کوئی مضبوط ہاتھ اس ذمہ داری کو اپنے کندھوں پر اٹھا لے گا تو نہ صرف پاکستان کی عظیم اکثریت اس کی پشت پر ہوگی بلکہ ساری مسلم دنیا اس کی حمایت کرے گی - اس وقت دنیا میں جو آمریت پسند اور جمہوری نظام رائج ہیں ، ان کی بنیاد کسی فرد ، کسی ایک گروہ یا عوام کی حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ پر رکھی گئی ہے اور ان ہی میں سے کسی کو قانون سازی کا حق حاصل ہوتا ہے - لیکن نظریہ پاکستان جس کی بنیاد کلمہ طیبہ پر ہے وہ ایک دوسرے انقلابی نظریے کو پیش کرتا ہے - اس کی رو سے حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ کا مرکز خدا کی ذات ہوتی ہے اور

انفرادی و اجتماعی زندگی کے لیے اسی کے قانون کو قوت نافذہ اور برتری حاصل ہوتی ہے۔ ملک کی سیاسی طاقت اور اقتصادی وسائل ایک امانت ہوتے ہیں؛ عوام اور ان کے نمائندے اس امانت کو اصل مالک یعنی اللہ تعالیٰ کی مرضی و منشا کے مطابق استعمال کر سکتے ہیں اور تصرف میں لا سکتے ہیں۔ کسی فرد، عوام یا ایک مخصوص گروہ کی حاکمیت کا نظام اخلاق انارکی، معاشی استحصال کا ذریعہ بنتا ہے۔ فرد کو مجبور و مفلوج اور بڑی بڑی آبادیوں کو غلام بنا کر رکھ دیتا ہے۔ اگر ہم نے اسی طرح کا کوئی نظام پاکستان میں قائم کیا تو ہمارا معاشرہ بھی ان تمام خرابیوں کا شکار ہو جائے گا جن میں دور جدید کے انسانی معاشرے مبتلا ہیں اور انھیں خود اپنے ہاتھوں تیار کی ہوئی بیڑیوں سے نجات کی کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی ہے۔ پاکستان اس وقت ایک دوراہے پر کھڑا ہوا ہے۔ ایک طرف انسانی اقتدار اعلیٰ اور عوامی حاکمیت کا نظریہ ہے اور دوسری طرف خدا کی حاکمیت، اقتدار اعلیٰ اور اسی کے قانون کی برتری کا نظریہ ہے۔ مستقبل قریب میں ملک کو اجتماعی طور پر یہ فیصلہ کر لینا ہوگا کہ اسے ان دو راستوں میں سے کون سا راستہ پسند ہے۔ اگر دوسرا راستہ پسند کر لیا گیا اور ایک ایسے دستور کی بنیاد ڈال دی گئی جس کے جمہوری نظام میں قانون سازی کے لیے خدا کی مرضی و منشا کے بجائے عوام کی مرضی کو اصل فیصلہ کن طاقت قرار دیا گیا اور اسلام کے سیاسی و معاشی اصولوں کے بجائے کچھ دوسرے اصول اپنا لیے گئے تو پھر مشرق پاکستان کو مغربی پاکستان سے دنیا کی کوئی طاقت وابستہ نہیں رکھ سکے گی۔ اس طرح پاکستان نہ صرف پارہ پارہ ہو جائے گا بلکہ اس کا اصل وجود تک خطرے میں پڑ جائے گا۔"

(جنگ - ۵ نومبر ۱۹۶۹ء)

۲ - "اسلام کے خلاف سازشیں

کارل مارکس ، لینن ، ٹراٹسکی اینجاز وغیرہ بلاشبہ عظیم لوگ تھے۔ انھوں نے بدترین قسم کی جاگیرداری ، نوکر شاہی ، استعماریت ، دین و مذہب (عیسائیت) اور پاپائیت سے عاجز مغربی انسانوں کو اشتمالیت (کمیونزم) ، اور اشتراکیت (سوشلزم) کے روپ میں اقتصادی و معاشی آسودگی کا مژدہ سنایا ۔ لیکن ان کے معتقدین اور نائبین نے جہاں بھی ان مفکرین کے دین و مذہب سے معرا افکار و نظریات کو اختیار کیا اور عوامی انقلاب کے نام پر انسانی خون کی ندیاں بہانے کے بعد اشتراکی یا اشتمالی سلطنتیں قائم کیں آج وہاں انسانیت بدترین قسم کی پرولتاری "بیورو کریسی" کے چنگل میں گرفتار اپنی حالت پر نوحہ خواں نظر آتی ہے ۔ "سرخوں کی جنت" میں ہم نے اپنی آنکھوں سے انسانیت کے مسخ چہروں پر کرب و اذیت کی خراشیں دیکھی ہیں ۔

اس تمہید کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی ہے کہ بعض حلقے بڑی شدومد سے اسلام کے نام پر معرض وجود میں آنے والے اس خطۂ ارضی میں بھی سوشلزم اور کمیونزم کو جاری و ساری دیکھنا چاہتے ہیں ۔ بلکہ کچھ عرصے سے تو وہ اشتراکیت و اشتمالیت ایسے لادینی نظام کی کڑیاں دین اکمل ــ اسلام ــ سے ملانے کی مذموم و ناپاک کوششوں میں مصروف ہیں ۔ وہ کبھی خدیجۃ الکبریٰ رضؓ ، کبھی ابوذر غفاری رضؓ ، کبھی خلفائے راشدین رضؓ اور کبھی دوسرے اکابرین اسلام کے حالات و واقعات کو مسخ کرکے پیش کرتے ہیں اور ان سے اشتراکیت کے اسلام کے عین مطابق ہونے اور اشتراکیوں کے مسلمان ہونے کی دلیلیں نکالتے ہیں ، اور یہ تو ابھی کل کی بات ہے کہ ایک سر پھرے نام نہاد کمیونسٹ نے خاکش بدہن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سوشلزم کا

مؤسس اول اور سب سے بڑا سوشلسٹ قرار دینے کی ناپاک کوشش کی ہے۔

کاش ان سے کوئی دریافت کر سکتا کہ اگر اشتراکیت اور اشتمالیت کا منبع و مرجع مکہ و مدینہ ہی ہیں تو پھر انھوں نے اپنا قبلہ پیکنگ اور ماسکو کو کیوں بنا رکھا ہے ؟ پھر مارکس ، لینن اور ماؤزے تنگ کے افکار و نظریات پھیلانے اور ان کی تصویروں کے بیج اپنے سینوں کی زینت بنانے کی کیا ضرورت ہے ؟ کیا ان ملحدوں کا فلسفہ جو خالق کائنات کی ہستی کے منکر ہیں اور باری تعالیٰ کے وجود کو سرمایہ داروں کی تخلیق بتاتے ہیں اس رسول عظیم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق ہو سکتا ہے جو اس پوری کائنات کا موجد و مدبر رب عرش عظیم کو مانتے ہیں اور اپنی پوری زندگی کو اس کی عبادت اور اس کی طرف دعوت دینے میں بسر کر دیتے ہیں ؟ کیا یہ اسلام کے خلاف سازش نہیں اور ناطق وحی کی اہانت نہیں کہ آپؐ کو اور آپؐ کے صحابہؓ کرامؓ کو یہودی مارکس ، اینجلز ، لینن اور ماؤزے تنگ ایسے ملحدوں کی صف میں لا کھڑا کرتے ہیں ؟

ہم اس مرحلے پر اپنے ارباب بست و کشاد سے بھی یہ سوال کرنا چاہتے ہیں کہ خدا و رسول کے نام پر معرض وجود میں آنے والے اس ملک میں آخر سرخ عناصر کو کھل کھیلنے کی کیوں اجازت دی جاتی ہے ؟ یہ کیسی آزادی اظہار ہے کہ ایک طرف عام لوگ لب شکایت وا کرنے اور دل کی بات زبان تک لانے کو ترستے ہیں اور دوسری جانب اسلام دشمن عناصر کو شریعت بیضا کی بنیادیں متزلزل کرنے کی کھلی چھٹی ہے ۔ اظہار افکار و نظریات کی آزادی کے اعتبار سے برطانیہ ایک مثالی ملک ہے ۔ لیکن آج کل کا انگریز اتنا مذہب پرست بھی نہیں ، بلکہ

نوجوان طبقہ تو مذہب سے بیگانہ ہی ہے ، لیکن وہاں بھی کسی کو یہ جرأت نہیں ہوتی کہ کلیسائے انگلستان کی سربراہ ملکہ الزبتھ ثانی کی ذات پر ہی کوئی رکیک حملہ کر سکے - ہم ارباب اقتدار سے یہ استفسار بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ جس ملک میں کمیونسٹ پارٹی پر برسوں سے پابندی ہے ، وہاں زیر زمین کمیونسٹوں (ٹائم ویکلی کے حالیہ جائزے کے مطابق ۴۱ سو) کو ادبی ، ثقافتی ، صحافتی ، معاشرتی - الغرض ہر لحاظ سے پاکستان کے اساسی نظریات اسلام اور جمہوریت پر وار کرنے کی کھلی چھٹی کیوں ہے ؟ اور انہیں سرکاری امداد و اعانت سے چلنے والے اداروں میں کمین گاہیں بنانے کی کیوں اجازت ہے ؟ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے اور اس کی نظریاتی اساس اسلام و جمہوریت ہے - پاکستان میں کمیونسٹوں اور ملحدوں کو اپنے نظریے کے پرچار کی اس سے زیادہ اجازت نہیں ہونی چاہیے جتنی کمیونسٹ ممالک میں اسلام و جمہوریت کا نام لینے کی ہے -''

(ندائے ملت ۳ جولائی ۱۹۶۹ء)

'' اقتصادی انقلاب کی ضرورت

ہم نے کل ان کالموں میں لکھا تھا کہ اس حقیقت سے آج کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ کمیونزم نے جو اقتصادی نظام پیش کیا ہے اس میں کئی ایک خوبیاں ہیں اور یہ خوبیاں ایسی ہیں جو اسلام میں بدرجہ اولی موجود ہیں اور قرن اول میں مسلمانوں نے اس پر عمل بھی کیا تھا - یہ بات ممکن ہے ہماری زبان سے ان لوگوں کو ناگوار گذرے جنھوں نے برسوں مغربی پنجاب اسمبلی میں میاں افتخارالدین پر اس بنا پر کمیونسٹ ہونے کے آوازے کسے کہ موصوف موجودہ اقتصادی نظام میں بنیادی تبدیلیاں چاہتے ہیں - کاش وہ اس عہد کے سب سے بڑے اسلامی

مفکر اور مجدد ملت کا کلام پڑھتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ اگر میاں صاحب پر ان باتوں کی وجہ سے کمیونسٹ ہونے کا الزام لگ سکتا ہے تو پھر علامہ اقبال مرحوم ان سے کہیں بڑے کمیونسٹ تھے۔ کیونکہ میاں صاحب تو صرف یہ کہتے ہیں کہ اس نازک وقت میں بڑے زمینداروں پر زیادہ سے زیادہ لگان لگایا جائے لیکن علامہ مرحوم تو سرے سے زمینداری ہی کے خلاف تھے اور ان کے نزدیک قرآن کے پیغام کا خلاصہ ہی یہ تھا ؂

چیست قرآن ؟ خواجہ را پیغام مرگ
دستگیر بندۂ بے ساز و برگ

اور انہوں نے روسی انقلاب کے زعیم لینن کو مخاطب کرتے ہوئے یہ فرمایا ؂

ہم چو ما اسلامیاں اندر جہاں
قیصرت را بہ شکستی استخواں

آج ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اقبال مرحوم نے روس کے اقتصادی انقلاب کی تعریف میں اور بھی بہت کچھ کہا ہے۔ اس ضمن میں وہ روسی ملت کو پیغام دیتے ہوئے فرماتے ہیں : ''اب ضرورت ہے کہ تمام اقوام مشرق کی جانب توجہ کرو ، کیونکہ تمہاری تاریخ مشرق سے وابستہ ہے۔ بے شک تم نے دلوں میں ایک نیا سوز بپا کر دیا ہے اور تمہارے اندر ایک نئے زمانے نے جنم لیا ہے ، اور چونکہ یورپ کا آئین اور دین بالکل فرسودہ ہو گیا ہے ، اس لیے اب تم اس بت کدے کی طرف نہ دیکھو۔'' اور آخر میں وہ یہاں تک کہتے ہیں کہ تم نے سرمایہ داری اور شہنشاہیت کو مٹا کر حقیقت میں ع

کردۂ کار خداونداں تمام

بات یہ ہے کہ مرحوم کے نزدیک اسلام اور سرمایہ داری اور اسلام اور شہنشاہیت دو متضاد چیزیں تھیں اور عمر بھر کے مطالعے اور غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اس زمانے میں جس قوت کے ہاتھوں بھی یہ دونوں چیزیں تباہ ہوں ، وہ قوت ایک حد تک اسلام کے مشن کو پورا کرتی اور قرآن کے اس وعدے کے لیے راستہ ہموار کرتی ہے ، جس میں یہ کہا گیا ہے کہ ایک زمانہ آئے گا کہ ساری دنیا پر اللہ کا دین غالب ہو جائے گا ۔

اقبال نے روسی ملت کے انقلابی کارناموں کو سراہتے ہوئے اسے دعوت دی تھی کہ بگزر از لا جانب الا خرام ۔ کیونکہ انہیں یقین تھا اور ان کی طرح آج ہر مسلمان کو بھی اس بات پر پورا یقین ہے کہ روسی نظام لا تک محدود ہے اور جب لا کے ساتھ الااللہ نہ ہو دنیا میں کوئی نظام پائدار اور مستحکم نہیں ہو سکتا ۔ مزید براں مرحوم نے اپنی ایک فارسی مثنوی میں یہاں تک کہا ہے کہ یورپ میں سرمایہ داروں اور مزدوروں کی جنگ ہوئی جس کا نتیجہ روس کا انقلاب ہے ۔ اس انقلاب نے نہ صرف یہ کہ پرانے نظام کو درہم برہم کر دیا بلکہ اس نے تمام دنیا کی رگ پر نشتر لگا دیا ہے ۔ میں نے اس انقلاب کے احوال میں بہت بہت غور و خوض کیا ، میرے نزدیک یہ عبارت ہے :

لا سلاطیں ، لا کلیسا ، لا الہ

سے. لیکن اس لا کی باد تند پر سوار رہنا عارضی ہے ، ایک دن آئے گا کہ وہ الااللہ کے حصار عافیت میں پناہ لینے پر مجبور ہوگا ۔ اس سلسلے میں مرحوم کا ایک شعر ہے ؎

آیدش روزے کہ از دور جنوں
خویش را زیں تند باد آرد بروں

علامہ مرحوم کا ارشاد ہے کہ زمین زمیندار کی نہیں بلکہ خدا کی ہے اور خدا کی زمین کی نعمتوں سے خدا کے بندوں کو محروم رکھنا

بمنزلۂ کفر ہے ۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

باطن الارض ﷲ ظاہر است
ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است

اور اگر دہقان کو کھیت سے روزی میسر نہ آئے تو اقبال دہقان کو اجازت دیتا ہے کہ وہ اس کھیت کے ہر گوشۂ گندم کو جلا دے ۔

جن خوش نصیب حضرات کو علامہ کی صحبت میں بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا ہے ، وہ اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ مرحوم اکثر فرمایا کرتے تھے کہ جس اقتصادی انقلاب کے لیے روس کو اتنا خون بہانا پڑا اگر مسلمان چاہیں تو اپنے ہاں ایک قطرۂ خون بہائے بغیر اسلامی تعلیمات کی مدد سے اس طرح کا انقلاب لا سکتے ہیں ۔ علامہ فرماتے تھے کہ اسلامی قانون قاضی کو حکم دیتا ہے کہ اگر وہ دیکھے کہ کوئی شخص اپنی جائداد کو ضائع کر رہا ہے تو وہ اسے اپنی تحویل میں لے سکتا ہے ۔ مرحوم کی رائے تھی کہ اگر ضرورت پڑے تو اسی طرح اسلامی حکومت بھی مفاد عمومی کے پیش نظر افراد کی شخصی املاک کو ضبط کر کے ان کی آمدنیوں کو رفاہ عامہ پر صرف کر سکتی ہے کیونکہ بقول علامہ ان سب چیزوں کا اصل مالک تو خدا ہے اور بندوں کو صرف ان سے استفادہ کا حق دیا گیا ہے ، اور ظاہر ہے اگر ان سے ایک استفادہ کرے اور ہزاروں محروم رہیں تو یہ صحیح استفادہ نہیں ہو گا ، اور جو نظام اس طرح کی بے انصافی اور جمہور کی محرومی کو جائز سمجھتا ہے وہ اسلامی نظام نہیں ہو سکتا ۔

اقبال زندگی بھر مسلمانوں کو اسی اسلام کی دعوت دیتے رہے اور انھوں نے اپنے اشعار میں اسی حقیقت کو مسلمانوں کے ذہن

نشین کرنے کی کوشش کی کہ اب سلطانی جمہور کا زمانہ آ رہا ہے ، اس دور میں تمام نقش کہن مٹانے پڑیں گے اور اگر بدقسمتی سے اسلام کے حرم کو مسلمانوں نے مرمر کی سلوں سے آراستہ کر رکھا ہے تو اس حرم کی جگہ بھی مٹی کا ایک اور حرم بنانا پڑے گا کیونکہ یہ زمانہ غریبوں کا ہے اور اس میں فرشتوں کو خدائے تعالیٰ کی طرف سے یہ فرمان مل چکا ہے ؎

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو

اس نئے زمانے کو وجود میں لانے کے لیے اقبال نے مسلمانوں کے سامنے دو چیزیں پیش کی ہیں : ایک یہ کہ وہ اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھیں اور دوسرے یہ کہ جو کچھ ان کی ضرورتوں سے بچے اسے مفاد عامہ پر صرف کریں ۔ موصوف فرماتے ہیں کہ یہ دوگنہ نظام عملی نور قرآن کا حاصل ہے اور اسی سے نئی زندگی کی تعمیر ہو سکتی ہے ۔ اس ضمن میں اقبال کے اشعار یہ ہیں ؎

با مسلماں گفت جاں بر کف بنہ
ہرچہ از حاجت فزوں داری بدہ
آفریدی شرح و آئینے وگر
اندکے با نور قرآنش نگر

اب جہاں تک ہمارا تعلق ہے خدا گواہ ہے کہ ہمیں انسانی اخوت اور اقتصادی مساوات کے سلسلے میں جو بھی روشنی ملی ہے وہ قرآن کریم ، سنت نبوی اور اس عہد کے سب سے بڑے اسلامی شاعر علامہ اقبال مرحوم کے کلام سے ملی ہے اور ہمارا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی میں پورا ایمان ہے کہ فاقہ انسان کو کفر کی طرف لے جانے کا موجب ہوتا ہے ، اس لیے

ہمارے نزدیک اسلامی حکومت کا اولین فرض ہے کہ وہ اپنی رعایا کے نان و نفقہ کی کفیل ہو اور اس راہ میں اگر اسے انفرادی ملکیت کے بعض حقوق کو فروگذاشت بھی کرنا پڑے تو اس میں مطلق کوئی حرج نہیں۔

ہمارا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اسلام اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ بڑے بڑے زمیندار ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہیں اور مزارع ان کے لیے کام کریں اور آخر میں مزارع تو بھوکے مریں اور زمیندار گلچھرے اڑائیں۔ حضرت امام ابو حنیفہؓ نے اس قسم کی مزارعت یعنی بٹائی کو شرعاً ناجائز قرار دیا ہے۔

ہم اپنی آنکھوں سے یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ اگر ہمارے موجودہ کارفرماؤں نے اسلام کے ان احکام پر عمل نہ کیا اور ان کے دور خسروی میں مسلمان عوام اسی طرح پستے چلے آئے تو اس کا نتیجہ خود ان کے لیے، ان کی اس قوم، اس ملک اور اس نئی آزاد سلطنت کے لیے اچھا نہیں ہوگا۔ یہ خود بھی تباہ ہوں گے اور ہمیں بھی تباہ کریں گے۔ اس لیے ہم اسلام کے، اپنی قوم کے اور پاکستان کے تحفظ کے لیے چاہتے ہیں کہ یہ لوگ موجودہ نظام کو بدلیں، اجارہ داریوں کو ختم کریں اور عوام کو ان کا حق دیں۔ ہمارا مطالبہ عین اسلام ہے منافی اسلام نہیں۔

(افتتاحیہ امروز ۲۸ مارچ ۱۹۴۸ء)

پالیسی پر مبنی یہ اداریہ بائیس سال قبل لکھا گیا تھا کیونکہ اس دور میں اس اخبار کی پالیسی واضح طور پر وہی تھی جو سطور بالا سے جھلکتی ہے۔

معاشرتی ادارے

معاشرتی اداریوں سے مراد ایسے اداریے ہیں جن کا مقصد

معاشرے کے عام افراد کی بہتری اور بھلائی ہو - جو لوگوں کے مصائب اور مشکلات ، ان کے حقوق ، ان پر زیادتیوں اور ان کی محرومیوں پر لکھے جائیں - اس قسم کے اداریے بھی خبروں پر مبنی ہو سکتے ہیں - اگر کسی علاقے میں بجلی کی رو میں تعطل پیدا ہونے اور لوگوں کو تکلیف پہنچنے کی خبر موصول ہو تو اس پر لکھا جانے والا اداریہ خبر پر مبنی ہونے کے باوجود معاشرتی اداریہ ہو گا ، کیونکہ اس کا مقصد لوگوں کی شکایت کا ازالہ اور بجلی کی رو میں تعطل پیدا کرنے کے ذمہ دار لوگوں پر تنقید ہے - اسی طرح کسی علاقے میں پانی کی نایابی ، کسی ضلع میں پل ٹوٹ جانے سے ٹریفک میں رکاوٹ پیدا ہونا ، کسی شہر میں جرائم کی وارداتوں میں اضافہ ، ٹریفک کا کوئی حادثہ ، آتشزدگی ، کسی جگہ پر کسی وبا کا پھوٹ پڑنا ، کسی تنظیم کی طرف سے صفائی کی صورت حال بہتر بنانے کا مطالبہ ، کسی محکمے میں بد عنوانیوں کا انکشاف ، یہ سب واقعات ایسے ہیں جن سے متعلق اداریے خبروں پر مبنی ہونے کے ساتھ ساتھ معاشرتی اداریے بھی ہوں گے ، کیونکہ اس قسم کے تمام اداریوں کا مقصد عوام کی مشکلات یا عوام کی مشکلات کے اسباب کا سد باب کرنا ہو گا -

۱ - ''قیمتوں میں کمی —— مسئلہ یا مشغلہ

ضلعی حکام روز مرہ کی ضروریات کی اشیا کے نرخوں میں کمی اور قیمتوں کو اعتدال کی سطح پر رکھنے کے لیے گاہے گاہے غور و فکر اور اقدامات کا اہتمام کرتے رہتے ہیں - اس مقصد سے کسی بھی شخص کو اختلاف و انکار نہیں ہوسکتا ، لیکن پچھلے تین چار سال کے تجربہ و مشاہدہ سے یہ بات ظاہر بلکہ ثابت ہوگئی ہے کہ مقامی حکام کی اس دلچسپی اور سرگرمی سے بہت خوشگوار توقعات تو پیدا ہو جاتی ہیں ، لیکن وہ شاذ و نادر ہی پوری ہوتی ہیں -

اس کی وجہ یہ نہیں کہ مقامی حکام کچھ کرنا نہیں چاہتے بلکہ یہ ہے کہ قیمتوں کا مسئلہ ملک گیر ہے اور ان کے معاملے میں ضلعی حکام عملاً بے بس ہیں ۔ لیکن وہ اس بنیادی حقیقت کا برملا احساس و اعتراف کرنا اپنے منصبی اختیار و وقار کے منافی سمجھتے ہیں ۔ اس لیے بار بار ناکام ثابت ہونے کے باوجود وہ اپنی ناکامی اور بے بسی کا برملا اعتراف مناسب نہیں سمجھتے ۔

اضلاع کی سطح پر قیمتوں میں کمی کے اقدامات کا آغاز ستمبر ۱۹۶۶ء میں اس وقت ہوا تھا جب سابق گورنر نے عوام کی شکایات سننے کا ایک نیا طریقہ رائج کیا تھا ۔ لیکن بعد میں جب ان پر یہ ظاہر ہوگیا کہ محض شکایات وصول کر لینے سے حق تلفی کے ازالہ کا اہتمام نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے لیے بڑی محنت و توجہ کی ضرورت ہے تو پھر انھوں نے اس معاملے میں کوئی مزید دلچسپی ظاہر نہ کی ۔ لیکن ان کے گورنر بننے کے بعد ابتدائی دور میں قیمتوں میں کمی کے لیے ضلعی کمیٹیاں بنانے کا جو تجربہ شروع ہوا تھا ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ضلعی حکام نے اسے باقاعدہ مشغلے کے طور پر اختیار کر لیا ہے اور ہر تیسرے چوتھے ماہ اس محاذ پر کچھ نہ کچھ سرگرمی ان کے لیے معمول کے مطابق کارروائی کا حصہ بن کر رہ گئی ہے ۔

ان گزارشات کی ضرورت صوبائی دارالحکومت میں ایک مرتبہ پھر آٹا ، گوشت ، لکڑی ، دالوں اور بعض دوسری اشیا کی قیمتوں میں کمی کی حاکمانہ مساعی سے محسوس ہوئی ہے ۔ اس مرتبہ یہ سرگرمی کچھ زیادہ وسیع پیمانے پر دکھائی جا رہی ہے ۔ مثلاً پہلے چند علاقائی کمیٹیوں کا قیام عمل میں لایا گیا جن کے بارے میں یہ تاثر دیا گیا کہ ان کے ارکان اپنے اپنے علاقوں میں نرخوں پر نظر رکھیں گے اور انھیں اعتدال کی سطح پر رکھنے کے لیے

تاجروں اور دکانداروں پر اپنا اخلاق اثر و رسوخ استعمال کریں گے ۔ یہ سلسلہ ہفتہ عشرہ سے جاری ہے لیکن کسی خوف تردید کے بغیر کہا جا سکتا ہے کہ اس دوران میں شاید ہی کسی بنیادی ضرورت کے نرخوں میں کمی ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ، یہ سلسلہ ــ یا مقامی حکام کا مشغلہ ــ کئی سال سے جاری ہے ، لیکن محدودالاثر یا الل ٹپ ہونے کے باعث اس کا کوئی ٹھوس ، خوش‌گوار اور دیر پا نتیجہ برآمد نہیں ہوتا ۔ قیمتوں میں کمی کا ٹھوس آغاز اس وقت ہوگا جب مرکزی حکومت اپنی صنعتی و تجارتی پالیسی میں زر مبادلہ کی بچت کی بجائے پیداوار بڑھانے اور مناسب نرخوں پر اشیائے ضرورت کی بہم رسانی کو بنیادی اہمیت دے گی ۔ اس وقت ہر نیا صنعتی ادارہ اس خوش‌گوار اعلان کے ساتھ آغاز کار کرتا ہے کہ وہ زر مبادلہ کی اتنی بچت کا ضامن ہوگا ۔ زر مبادلہ کی بچت اپنی جگہ اہم ہے لیکن صنعتی ترقی کا عوامی معیار یہ ہے کہ عوام کو اپنی ضرورت کی اشیا مناسب نرخوں پر ملتی ہیں یا نہیں ۔ جب مرکزی حکومت اپنی صنعتی و تجارتی پالیسی میں عوام کے مفاد کو ترجیح دے گی تو پھر ہر صوبائی حکومت بھی اپنے دائرۂ کار میں اسے اساسی اصول قرار دے گی اور اس کے بعد جب مقامی حکام نرخوں میں کمی کرانے میں دلچسپی لیں گے تو پھر ان کی یہ سرگرمی کار بے خیر ثابت نہیں ہوگی ۔ ہر کام کو سرانجام دینے کا طریقہ اور سلیقہ ہوتا ہے اور قیمتوں میں کمی کے مسئلے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے ۔ اصولی تقاضوں کو نظر انداز کرکے جو سرگرمی دکھائی جائے گی وہ مشغلہ تو ثابت ہو سکتی ہے ، اس سے مسئلہ حل کرنے میں مدد نہیں ملے گی ۔"

(نوائے وقت ۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۶۹ء)

۲ - ''اغوا کی روز افزوں وارداتیں

اغوا کے پہلے مجرم کو سزائے موت ملنے کے بعد یہ توقع کی جاتی تھی کہ اس انسانیت سوز جرم کا ارتکاب کرنے والے لوگ قانون کی گرفت سے خائف ہو کر اپنی معاشرت دشمن سرگرمیاں ترک کر دیں گے - لیکن گزشتہ چند ہفتوں کے اندر بچوں اور بچیوں کو اغوا کرنے کی وارداتیں جس تعداد میں ہوئی ہیں اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ لعنت اپنی پوری سنگینی کے ساتھ بدستور موجود ہے اور اس کا قلع قمع کرنے کے لیے ہمہ جہت جد و جہد کی ضرورت ہے -

کم سن بچوں اور بچیوں کا اغوا محض امن و قانون کے تحفظ کا مسئلہ نہیں ہے ، یہ در حقیقت ایک بہت بڑا معاشرتی مسئلہ بھی ہے - اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں ایسے اداروں کا شدید فقدان ہے جو یتیم ، غریب اور بے آسرا بچوں کی دستگیری اور سرپرستی کر سکیں - اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ملک میں ایسے بہت سے جعلی ادارے قائم ہوگئے ہیں جو کہنے کے لیے تو والدین کے سائے سے محروم بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال کے دعویدار ہیں لیکن درحقیقت وہ بردہ فروشی میں مصروف ہیں یا بچوں سے بھیک منگواتے ہیں اور ان کے ذریعے جتنی آمدنی ہوتی ہے اس سے گلچھرے اڑاتے ہیں -

نام نہاد یتیم خانے چلانے اور بچوں کا کاروبار کرنے والے لوگوں نے اپنے جال اس چالاکی کے ساتھ پھیلائے ہیں کہ انہیں یقین ہے کہ آسانی سے ان کی گرفت ناممکن ہے - اس کی ذمہ داری بڑی حد تک پولیس پر عائد ہوتی ہے کیونکہ وہ آج تک بردہ فروشوں یا اغوا کنندگان کے کسی گروہ کا سراغ لگانے میں کامیاب نہیں ہو سکی - اغوا کے ملزم اب تک صرف اس طرح پکڑے

گئے ہیں کہ کوئی بچہ موقع پا کر ان کے چنگل سے نکل بھاگا ہے یا بعض بردہ فروش کسی بچے کو پکڑ کر لے جا رہے تھے اور اس نے شور مچا دیا جس پر ملزم لوگوں کے ہتھے چڑھ گئے۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اغوا کے بعد بچوں کو یا تو ملک سے باہر سمگل کر دیا جاتا ہے، ان سے بیگار کیمپ میں غلاموں کی طرح کام لیا جاتا ہے یا ان کے ہاتھ پیر توڑ کر ان سے بھیک منگوائی جاتی ہے۔ لڑکوں کو ہوٹلوں کے مالکوں اور دوسرے کاروبار کرنے والوں کے ہاتھ فروخت کر دیا جاتا ہے اور لڑکیاں شادی کے خواہش مندوں یا قحبہ خانہ چلانے والوں کے ہاتھ بھیڑ بکریوں کی طرح بیچ دی جاتی ہیں۔

یہ بڑی المناک صورت حال ہے اور اس کی اصلاح کے لیے ایک طرف تو پولیس کو غیر معمولی مستعدی اور فرض شناسی کا ثبوت دینا ہوگا، دوسری جانب ہمیں ایسے فلاحی ادارے قائم کرنا ہوں گے جن میں بے ہنر بچوں کی صحیح پرورش اور تربیت ہو سکے۔"

(اداریہ مشرق ۳ اکتوبر ۱۹۶۹ء)

۳ - "سڑکوں کی توڑ پھوڑ

عروس البلاد لاہور کے مختلف علاقوں میں میونسپل کارپوریشن، سوئی گیس اور واپڈا والوں نے اپنے اپنے کاموں کے سلسلے میں مصروف سڑکوں، اندرون شہر بازاروں، محلوں اور گلیوں میں کھدائی کر رکھی ہے۔ بعض جگہوں پر ظاہرا مرمت تو کی جا چکی ہے لیکن عملی اعتبار سے مرمت کا کام نہ ہونے کے برابر ہے۔ اب جب کہ برسات کا موسم شروع ہو چکا ہے کھدائی کے مراحل کو جلد سمیٹنے اور مرمت کے کام کو کسی تاخیر کے بغیر

نمٹانے کی ضرورت محتاج وضاحت نہیں - یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ جہاں شہریوں کو بارش میں ان دیکھے گڑھوں میں گر کر زخمی ہونے سے محفوظ رکھنا ان اداروں کی قانونی اور اخلاقی ذمہ داری ہے وہاں بروقت مرمت سے سڑکوں کی مزید اکھاڑ پچھاڑ روکنا بھی ان کا منصبی فرض ہے - ورنہ عام طور پر شہریوں کے احتجاج پر یہ ادارے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دینے کے لیے ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہرانے کی کوشش کرتے ہیں - یہ انداز فکر و عمل کسی صورت مستحسن نہیں - شہریوں کی تکالیف کا ازالہ بہرکیف ایک سر فہرست تمدنی مسئلہ ہے ، اس میں تغافل و تساہل کسی بھی شعبے کی طرف سے واجب نہیں ہونا چاہیے -

(شذرہ ندائے ملت ۲۳ جولائی ۱۹۶۹ء)

موضوعات کی منصوبہ بندی

اچھے اخبارات اداریوں کے لیے موضوعات کا انتخاب ایک منصوبے کے تحت کرتے ہیں - مثال کے طور پر ایک اخبار یہ طے کر لیتا ہے کہ وہ ایک ماہ میں چار سماجی اداریے لکھے گا ، چار پالیسی پر مبنی اداریے لکھے جائیں گے اور باقی تمام اداریے خبروں پر مبنی ہوں گے - اس منصوبہ بندی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے تمام مقاصد کی تکمیل بطریق احسن کر لیتا ہے - وہ نہ تو سماجی یا خبر پر مبنی اداریے میں پالیسی کو داخل کرتا ہے نہ پالیسی پر مبنی اداریے کو خبر پر مبنی یا سماجی اداریہ میں خلط ملط کرکے اس کا اثر کم کرتا ہے - ممکن ہے کہ بعض اوقات اس منصوبے پر عمل نہ ہو سکے کیونکہ کوئی غیر متوقع واقعہ کسی بھی وقت پیش آ سکتا ہے اور خبروں کے صفحات کی طرح اداراتی صفحے کو بھی وقت اور حالات سے ہم آہنگ رہنا ہوتا ہے تاہم اس قسم کی منصوبہ بندی سے اداریہ نویس کا کام واضح اور آسان ہو جاتا ہے -

خصوصی اداریے

جہاں تک خصوصی اداریوں کا تعلق ہے وہ باقی تینوں اقسام

سے عموماً مختلف ہوتے ہیں ۔ یہ اداریے اہم قومی ایام ، قومی شخصیتوں کی سالگرہوں ، برسیوں ، اہم قومی یا مذہبی تقاریب وغیرہ کے موقع پر لکھے جاتے ہیں ۔ مثلاً ہمارے یہاں یوم استقلال یا یوم قرارداد پاکستان ، عیدین ، حج بیت اللہ ، محرم ، قائد اعظم اور علامہ اقبال کی برسی یا ایام پیدائش پر جو اداریے لکھے جاتے ہیں وہ اسی ذیل میں آتے ہیں ۔ یہ اداریے بھی ایک اعتبار سے خبروں پر مبنی یا حالات سے ہم آہنگ قرار دیے جا سکتے ہیں اس لیے کہ وہ اسی وقت لکھے جاتے ہیں جب اہم قومی دن آتا ہے مگر ان کا مقصد خبر پر مبنی اداریے کی طرح خبر کا تجزیہ یا اس پر تبصرہ کرنا نہیں ہوتا بلکہ متعلقہ یوم کی اہمیت ، اس سے حاصل ہونے والی تعلیم یا اس یوم کا فلسفہ قارئین کے ذہن نشین کرانا ہوتا ہے ۔ شخصیتوں سے متعلق لکھے جانے والے اداریوں کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ متعلقہ شخصیت کے کارناموں ، کردار یا نظریات پر روشنی ڈال کر قارئین کی رہنمائی کا اہتمام کیا جائے ۔ اس قسم کے اداریوں کو کسی خاص ہیئت کا پابند نہیں کیا جا سکتا ، کیونکہ ان میں منطق یا استدلال ، اعداد و شمار اور معلومات پر انحصار کرنے یا قارئین کے ذہنوں سے اپیل کرنے کی بجائے جذبے اور عقل دونوں سے اپیل کی جاتی ہے ۔ اور بعض اوقات یہ اپیل صرف جذبات سے ہوتی ہے ۔ مگر ان اداریوں کو بھی حالات سے ہم آہنگ بنایا جاتا ہے یعنی اس وقت کے حالات ، رجحانات ، نظریات اور لوگوں کے اعمال و افعال کو سامنے رکھ کر بتایا جاتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ متعلقہ شخصیت کی آرزو ، فکر یا متعلقہ یوم کے تقدس اور مقصد سے ہم آہنگ ہے یا نہیں اور اگر نہیں تو متعلقہ شخصیت یا یوم کے فلسفے کو سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کی جاتی ہے ۔

خصوصی اداریوں کی مثالیں

۱ - ''تاریخ آزادی کا یادگار دن

''اور کیا یہ لوگ کبھی زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں اور انہیں ان لوگوں کا انجام نظر نہیں آتا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں - وہ ان سے زیادہ طاقتور تھے - انہوں نے زمین کو خوب ادھیڑا تھا اور اسے اتنا آباد کیا تھا جتنا انہوں نے نہیں کیا ہے - ان کے پاس ان کے رسول روشن نشانیاں لے کر آئے تھے - پھر اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا بلکہ وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے - آخر جن لوگوں نے برائیاں کی تھیں، ان کا انجام برا ہوا - اس لیے کہ انہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا تھا اور وہ ان کا مذاق اڑاتے تھے -''

(سورہ الروم - القران)

آج ہم قیام پاکستان کی ------ سالگرہ منا رہے ہیں - ۱۴ - اگست ہمارے لیے اس حاکم الحاکمین کی بارگاہ میں اظہار تشکر کا دن ہے جس نے قیام پاکستان کے لیے ہماری دعاؤں کو شرف قبولیت بخشا تھا -

آج ہم اس پرچم کو سلامی دے رہے ہیں جسے پندرہ برس قبل ملت کے جاں نثار اپنے زخمی ہاتھوں سے بلند کیے ہوئے تھے - آج ہم ان امیدوں ، آرزوؤں ، ولولوں اور حوصلوں کی یاد منا رہے ہیں ، جو آگ اور خون کے طوفانوں میں ہماری سب سے بڑی پونجی تھے -

ہمارا پندرہ سالہ ماضی انسانیت کے ماضی کی تاریخ سے الگ نہیں، اور انسانیت کے ماضی کی تاریخ بار بار اس امر کی گواہی دیتی ہے کہ قانون قدرت میں اقوام و ملل کے عروج و زوال کے راستے متعین ہیں - اس کے صفحات الٹ کر ہم ان اقوام کی داستانیں پڑھ

چکے ہیں جو ہم سے زیادہ طاقت ور تھیں لیکن جب انہوں نے گمراہی کا راستہ اختیار کیا تو ان کی عقل ، دانش ، ان کی ہوشیاری اور چالاکی اور ان کے مادی وسائل انہیں تباہی سے نہ بچا سکے ۔ ماضی کی تاریخ کے صفحات ان تہی دست اور کمزور اقوام کے تذکروں سے بھی خالی نہیں جنہیں قدرت نے عزم و یقین کی نعمتوں سے نوازا اور وہ گمنامی کے پردوں سے نکل کر اطراف عالم پر چھا گئیں ۔

خارجی اسباب یا اتفاقی حادثات قوموں کی تقدیر پر قادر نہیں ۔ وہ صرف اپنی اندرونی توانائی کے بل بوتے پر زندہ رہتی ہیں اور اندرونی کمزوری کے باعث ہلاک ہو جاتی ہیں ۔ وہ درخت جس کی جڑیں تندرست ہوں بنجر اور سنگلاخ زمین میں بھی زندہ رہنے کے اسباب تلاش کر لیتا ہے ۔ وہ گرم اور سرد ہواؤں کا مقابلہ کرتا ہے اور اس کے لیے ہر خزاں کے بعد ایک بہار ہوتی ہے ۔ لیکن وہ پودا جس کی جڑوں میں کیڑے لگے ہوئے ہوں ۔ انتہائی زرخیز اور شاداب زمین میں بھی پروان نہیں چڑھتا — مالیوں کی نگہداشت ، پانی اور کھاد کی فراوانی اسے زندگی کا حسن و جمال عطا نہیں کر سکتی ۔ سیلاب کا ایک ریلا یا آندھی کا ایک جھونکا اسے اکھاڑ کر پھینک دیتا ہے اور اسے بیرونی سہاروں سے کھڑا کرنے کی تدبیریں بے نتیجہ ثابت ہوتی ہیں ۔

آج ہمارے لیے یہ سوچنے کا دن ہے کہ اگر ہم ایک زندہ ، متحرک ، تندرست و توانا قوم ہیں تو پاکستان ہمیں زندگی کی ہر وہ نعمت عطا کر سکتا ہے جو ایک سعادت مند — راست باز غیور اور خود دار قوم اپنے وطن کی خاک سے حاصل کر سکتی ہے ۔ لیکن اگر ہم یقین اور عمل کی نعمتوں سے محروم ہو چکے ہیں ، ہماری اجتماعی سیرت اور کردار کی بنیادیں ہل چکی ہیں تو ہماری

مثال اس درخت کی سی ہے جس کی جڑوں میں دیمک لگ گئی ہو۔ سیاسی مصلحتیں ، بین الاقوامی سودے بازیاں اور ہنگامی تدبیریں ، ہمارے لیے وقتی سہارے تو ثابت ہو سکتے ہیں لیکن یہ ہمیں پروقار زندگی کی حقیقی راحتیں عطا نہیں کر سکتے۔

پاکستان کے لیے ہماری جد و جہد کسی سیاسی مصلحت کے تابع نہ تھی اور نہ اسے کسی حادثے نے جنم دیا تھا بلکہ یہ اس اجتماعی شعور کا ماحصل ہے جو ہماری روح کی گہرائیوں سے بیدار ہوا تھا ۔

یہ اس قافلے کی منزل تھی جس نے برسوں بھیانک تاریکیوں میں بھٹکنے کے بعد بالآخر اسلام کی روشنی میں اپنے مستقبل کا راستہ متعین کیا تھا ۔ یہ ان قربانیوں کا صلہ ہے جو صرف اسلام کے نام پر دی گئی تھیں ۔

ہم نے ایک اسلامی ریاست کی تشکیل کا عہد کیا تھا اور قدرت ہمیں اس مقدس عہد کو پورا کرنے کا موقع دینا چاہتی تھی ۔ پھر ایک عظیم نصب العین کے حصول کی جد و جہد کے ہر مرحلے پر تائید ربانی ہمارے ساتھ تھی ۔ ہماری دعائیں مستجاب ہوئیں ۔ ہماری قربانیوں کو شرف قبولیت بخشا گیا ۔ ہمیں غلامی کی لعنت سے نجات ملی اور ہم آزاد اقوام کی صف میں کھڑے ہو گئے ۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ہمارے اندرونی اور بیرونی مسائل ایک ایسی قوم کے مسائل تھے جس نے اللہ اور اس کے بندوں کے سامنے ایک اسلامی ریاست کے قیام کی ذمہ داری قبول کی تھی اور تشکر اور احسان مندی کا تقاضا یہی تھا کہ ہم پوری دیانتداری اور خلوص کے ساتھ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتے ۔ اگر ہم نے ایک سعادت مند قوم کی طرح اپنے وعدوں کا

پاس کیا ہے تو آج ہم فخر سے سر اونچا کر سکتے ہیں - ہم اس سے بڑے انعامات کے لیے ہاتھ پھیلا سکتے ہیں اور ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ وہ حاکم مطلق جس نے ہم جیسے تہی دستوں کو اپنے دین کا پرچم بلند کرنے کے لیے منتخب کیا ہے ہمیں مایوس نہیں کرے گا - لیکن اگر ہم اس سلسلے میں کسی کوتاہی کے مرتکب ہوئے ہیں تو ہمیں یہ دعا مانگنی چاہیے کہ اللہ ہماری کمزوریوں اور ہماری لغزشوں اور کوتاہیوں سے درگزر کرے اور ہمیں گمراہی کا راستہ اختیار کرنے والی مغضوب قوموں کی صف میں کھڑا ہونے سے بچائے -

جن قوموں نے اپنی ناشکرگزاری یا بد عہدی کے باعث ذلت اور رسوائی کا راستہ اختیار کیا ، ان میں بنی اسرائیل کا نام سرفہرست ہے - وہ برسوں سے مصریوں کے آہنی استبداد کی چکی میں پس رہے تھے لیکن غلامی کے بدترین ادوار میں بھی انہوں نے فراعنہ کا مذہب یا مصریوں کی تہذیب قبول نہیں کی تھی - اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود وہ بت پرستی کی طرف مائل نہ ہوئے - پھر خدا نے موسٰی علیہ السلام کو ان کی رہنمائی کے لیے بھیجا اور وہ انہیں ظلم و استبداد کے اس جہنم سے نکال کر صحرائے سینا میں لے آئے - وہ غلام تھے اور آزاد ہوگئے ، وہ بھوکے تھے اور ان کے لیے من و سلوٰی بھیجا گیا - لیکن آزادی کا سانس لیتے ہی یہ ناشکرگزار امت اس قوم کی نقالی پر اتر آئی جس کے مذہب اور اخلاق کو وہ غلامی کے ایام میں انتہائی نفرت کی نگاہوں سے دیکھتی تھی - مصری بچھڑے کی پوجا کرتے تھے ، چنانچہ انہوں نے بھی اپنے خدا اور اس کے نبیؑ سے منہ موڑ کر بچھڑے کو اپنا معبود بنا لیا - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تمام فسق و فجور جس کے لیے اہل مصر بدنام تھے ، بنی اسرائیل کے رگ و پے میں سرایت کر گیا - یہ اس خدا کے ساتھ بدعہدی تھی جس کا

رحم و کرم مصائب کے ایام میں ان کا سب سے آخری سہارا تھا ۔ یہ اس نبی ؑ کی نافرمانی تھی جو ان کے پاس روشن نشانیاں لے کر آیا تھا اور جس نے انھیں ایک بدترین غلامی سے نجات دلائی تھی ۔ بنی اسرائیل نے اپنے اوپر ظلم کیا تھا ، انھوں نے راستہ وہ چھوڑ دیا تھا جس پر چلنے میں ان کی سلامتی کا راز تھا ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ چالیس سال تک صحرائے سینا میں خاک چھانتے رہے ۔

آج ہمارے لیے یہ سوچنے کا دن ہے کہ آزادی حاصل کرنے کے بعد ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا ہے ۔ ہم نے کس حد تک اپنے یقین اور عمل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہم ایک سعادت مند اور شکرگزار قوم ہیں ۔ ہماری خواہشات اور ہمارے اعمال کس حد تک اس دین کے تقاضوں کے تابع ہیں جس کی سربلندی کے لیے ہم نے پاکستان حاصل کیا ہے ۔ ہمارے لیے سلامتی کا راستہ کیا ہے اور ماضی میں اگر ہم نے اس راستے سے انحراف کیا ہے تو اس سے کیا نتائج برآمد ہوئے ہیں ؟ ہم بار بار ماضی کے ان حالات پر تبصرہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے جن کے باعث ہمارا ملی وجود خطرے میں پڑ گیا تھا ۔ اگر ہم حقیقت پسندی سے کام لیں تو اس مسئلے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں ۔ یہ اندوہناک حالات ہماری قیادت کے ان دعویداروں نے پیدا کیے تھے جنھوں نے اسلام کو اپنی پسند اور ناپسند کا مسئلہ بنا لیا تھا ۔ ماضی کے تلخ تجربات سے اگر ہم کوئی سبق حاصل کر سکتے ہیں تو وہ یہ ہے کہ پاکستان کی تعمیر کے لیے اسلام کے سوا کوئی اور اساس تلاش کرنا ہمارے لیے خودکشی کے مترادف ہوگا ۔ اگر پاکستان ایک جسم ہے تو اسلام اس کی روح ہے اور کوئی جسم اپنی روح کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا اور اسلام سے ہماری مراد صرف محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسلام

ہے - یہی وہ بنیاد ہے جس پر پاکستان کی عمارت کھڑی رہ سکتی ہے - یہی وہ ریڑھ کی ہڈی ہے جس کے ساتھ ہمارا وجود قائم ہے ، اور یہی وہ سانچہ ہے جس کے اندر ہم پاکستانی ملت کی سیرت و کردار ڈھال سکتے ہیں - یہی وہ قوت ہے جس نے گروہی ، نسلی اور علاقائی حد بندیاں توڑ کر ہمیں ایک قوم بنا دیا تھا - یہی وہ حصار ہے جو ہمیں بیرونی خطرات سے پناہ دے سکتا ہے اور یہی وہ تلوار ہے جس کی کاٹ ہماری عزت اور بقا کے دشمنوں کے عزائم متزلزل کر سکتی ہے -

وہ قوم جو اندرونی توانائی سے محروم ہو ، دوسروں کی نقال بن کر زندہ نہیں رہ سکتی اور ہماری اندرونی توانائی کا راز دین اسلام کے ساتھ وابستگی میں مضمر ہے - ہم ان قوموں کی تقلید نہیں کر سکتے جن کے اجتماعی شعور نے صدیوں کے نسلی ، جغرافیائی اور تہذیبی رشتوں کی آغوش میں جنم لیا ہے - ہمیں صرف اسلام کا رشتہ ایک ملت بناتا ہے اور ہمارے لیے اسلام سے منحرف ہونا اپنے ملی وجود سے منحرف ہونے کے مترادف ہے -

اسلام کے جادۂ مستقیم سے بھٹک کر ہمارے ذہنی حصار میں جو شگاف پیدا ہوں گے وہ پاکستان کے ان بد خواہوں کے لیے مورچوں کا کام دیں گے جو برصغیر ہند میں ایک نظریاتی مملکت کے قیام کو اپنی شکست سمجھتے ہیں - پھر یہ لوگ خواہ بھارت کے برہمنی سامراج کے آلۂ کار ہوں اور خواہ اشتراکی الحاد کا ہراول دستہ ہوں ، بہر حال اتنا ضرور جانتے ہیں کہ جب تک پاکستان کے ملی حصار کی اخلاق اور روحانی بنیادیں متزلزل نہیں ہوتیں اور جب تک نسلی اور علاقائی عصبیتیں ہماری قومی وحدت کو پارہ پارہ نہیں کرتیں انھیں ناپاک مقاصد میں کامیابی نہیں ہو سکتی - ان حالات میں اپنی ہیئت اجتماعیہ کو اسلام کی بنیان مرصوص پر قائم

رکھنا ہمارے لیے پسند یا ناپسند کا مسئلہ نہیں بلکہ موت و حیات کا مسئلہ ہے۔

رات جتنی تاریک ہو اسی قدر روشنی کی ضرورت ہوتی ہے اور ہم جس رات کے مسافر ہیں اس کی بھیانک تاریکیاں اس امر کی متقاضی ہیں کہ ہم عزم و یقین کی وہ قندیلیں بلند رکھیں جن کی روشنی میں ہم آج سے چودہ برس قبل پاکستان کی منزل مقصود تک پہنچے تھے۔

جس قوم نے چودہ برس قبل برطانیہ کے گورے سامراج سے نجات حاصل کی تھی، وہ آج بھارت کے برہمنی سامراج کے کالے عفریت کا سامنا کر رہی ہے۔ کشمیر میں ہمارے ۴۰ لاکھ بھائی انسانی تاریخ کے بدترین استبداد کی چکی میں پس رہے ہیں۔ یہ دور ہماری آزمائش کا دور ہے۔

ہمارے مادی وسائل محدود ہیں۔ ہم ان اقوام کے دوش بدوش کھڑے نہیں ہو سکتے جنہیں اپنے جنگی اسلحوں کی برتری پر ناز ہے۔ لیکن تاریخ ہمارے سامنے ان اقوام کی مثال پیش کرتی ہے جو ہم سے زیادہ تہی دست تھیں اور جن کے دشمن ہمارے دشمنوں سے زیادہ طاقتور اور مغرور تھے۔ لیکن جب یہی قومیں کسی اخلاق قوت کا سہارا لے کر سلامتی کی راہ پر گامزن ہوئیں تو قدرت نے ان کا عزم و یقین دیکھ کر ان پر اپنے انعامات کے دروازے کھول دیے اور ان کی سطوت و جلال نے ظلم کے ایوانوں پر لرزہ طاری کر دیا۔

اگر ہم ایک سعادت مند اور احسان شناس قوم ہیں تو ۱۴ اگست ہمارے لیے اس بارگاہ کے سامنے دعاؤں اور مناجاتوں کا دن ہے جہاں سے کمزوروں کو توانائی اور تہی دستوں کو زندگی کے اسباب و وسائل عطا ہوتے ہیں۔ آج ہماری دعا یہ ہونی چاہیے

کہ پروردگار ہمیں بصیرت دے کہ ہم اپنے لیے سلامتی کا راستہ پہچان سکیں اور ہمیں ہمت دے کہ ہم اس مملکت کی تعمیر کے لیے اپنی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکیں ۔ آمین !'' (کوہستان ۱۴ اگست ۱۹۶۲ء)

۲ - ''مادر ملت کی یاد میں

خاتون پاکستان مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح کی دوسری برسی آج ملک کے طول و عرض میں منائی جا رہی ہے ۔ مادر ملت محض بانی پاکستان حضرت قائد اعظم کی ہمشیرہ ہی نہیں ، انہوں نے قوم کی خاطر وہ وہ قربانیاں دیں اور وہ وہ احسانات کیے جن کا بدلہ رہتی دنیا تک نہیں چکایا جا سکتا ۔ قائد اعظم کی وفات کے بعد محترمہ فاطمہ جناح کا کردار ابھر کر سامنے آیا اور جب کبھی کسی بھی وابستہ' اقتدار نے نظریہ' پاکستان کے بنیادی اصولوں اور عوامی مفاد کے خلاف کسی بھی قسم کے اقدام کا ارادہ ظاہر کیا مادر ملت نے اسے فوراً ٹوک دیا ۔ اس طرح انہوں نے ارباب حکومت کے احتساب اور اسلام و جمہوریت کے محافظ و نگہبان کا لازوال کردار ادا کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الخ''
(ندائے ملت - ۹ جولائی ۱۹۶۹ء)

جنگ، اور اداریے

اہم قومی ، تاریخی یا مذہبی ایام اور ممتاز شخصیتوں کے یوم ولادت یا یوم وفات کے علاوہ بھی خصوصی اداریے لکھے جا سکتے ہیں ۔ کسی قوم پر ایسا وقت بھی آ سکتا ہے جب اداریہ نویسی کے معروف اصولوں کو نظرانداز کرکے کسی خاص مقصد کی تکمیل کے لیے اداریے لکھے جاتے ہیں اور ان میں موقع کی مناسبت سے زبان استعمال کی جاتی ہے ۔ مثال کے طور پر ۱۹۶۵ء

میں بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تھا ؛ یہ وقت ایسا نہ تھا کہ دلیل اور منطق کے ساتھ قارئین کو کچھ سمجھانے کی کوشش کی جاتی ۔ اس وقت اخبارات کا قومی فرض یہ تھا کہ وہ قوم کو متحد کرنے اور سیسہ پلائی دیوار بنانے کے لیے جد و جہد کریں تاکہ وہ اپنے وطن، اپنی آبرو اور آزادی کی حفاظت کے لیے سربکف میدان عمل میں نکل آئے ۔

پہلے زمانے کی جنگیں فوجوں تک محدود رہتی تھیں ، اب جنگیں عوامی اور قومی سطح پر لڑی جاتی ہیں ، یعنی کارخانوں میں ، کھیتوں میں ، دفتروں میں بھی ہنگامی بنیادوں پر کام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ چنانچہ اخبارات اور دوسرے ذرائع ابلاغ الفاظ اور آواز کے محاذ پر جنگ لڑتے ہیں ۔ ایسے وقت میں اخبارات کی اشاعت بڑھ جاتی ہے اس لیے کہ ہر شخص جنگ یا بحران سے متعلق تفصیلات سے باخبر ہونا چاہتا ہے ۔ چنانچہ اخبارات کے ادارتی صفحات قوم کی صحیح رہنمائی کرنے اور عوام میں جذبہ و حوصلہ پیدا کرنے کا اہم کام انجام دیتے ہیں ۔ ایسے وقت میں مسائل کے منطقی تجزیے اور بحث و استدلال کی بجائے جذبہ و جوش سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ چنانچہ بحرانی ادوار میں اداریے عموماً جذباتی نوعیت کے ہو جاتے ہیں اور ہونے بھی چاہییں ۔ جنگ یا کسی اور قسم کے بحران میں اہم ترین تقاضا یہ ہوتا ہے کہ قوم و ملک آزمائش میں پورے اتریں ۔ چنانچہ ان کو اس آزمائش پر پورا اترنے کے قابل بنانے کے لیے مؤثر ابلاغ کا ہر حربہ استعمال کیا جائے ۔ چنانچہ بحرانی یا ہنگامی حالات میں بھی خصوصی اداریے لکھے جاتے ہیں ۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران میں تمام پاکستانی اخبارات نے خصوصی اداریے لکھے ۔ بھارت کا حملہ شروع ہوتے ہی اخبارات کی کایا پلٹ گئی ۔ ہمارے اخبارات قومی تقاضوں کے پیش نظر ابلاغ عام کے محاذ پر سپاہیوں کی طرح ڈٹ گئے اور ان کے اداریوں کے

موضوعات اس قسم کے ہوگئے : 'اب جو ہو سو ہو' 'دنداں شکن جواب' 'ہم حق پر ہیں' 'پوری قوم تیار ہے' 'دنیا کا ضمیر ہمارے ساتھ ہے' 'پوری قوم کو ہنگامی حالات کے لیے تیار کیجیے' 'دشمن کو کچل دو' 'قدم بڑھائے چلو' 'ہم اکیلے نہیں' 'جنگ جاری ہے۔'

ذیل میں ان دنوں کے اداریوں کے چند اقتباسات دیے جاتے ہیں ۔

روزنامہ مشرق (لاہور) نے ''دشمن کو کچل دو'' کے زیر عنوان اداریے میں لکھا :

''بھارت سے جنگ شروع ہو چکی ہے ۔ اس کا آغاز پاکستان نے نہیں کیا ۔ یہ ہمارے اوپر مسلط کی گئی ہے ۔ لیکن ہم نے دشمن کا چیلنج قبول کر لیا ہے ۔ ایسے حالات میں ایک زندہ ، خود دار اور آبرو مند قوم کے لیے صرف ایک ہی راستہ ہوتا ہے : اپنی آزادی کے لیے سربکف ہو کر میدان عمل میں مجاہدانہ شان سے نکل آنے کا راستہ ، سرزمین وطن کی حفاظت کے لیے اپنی آن پر اپنی جان قربان کر دینے کا راستہ ، اپنے ملک کی عزت و ناموس کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دینے کا راستہ ۔

آج پوری قوم فرد واحد کی طرح متحد ہو کر اس راستے پر ثابت قدمی اور اولوالعزمی کے ساتھ گامزن ہے ۔ وہ اپنے مقدس وطن کی سلامتی اور سالمیت کے لیے پہلے ہی مر مٹنے کے جذبے سے سرشار تھی ، صدر ایوب نے اس میں ایک نیا عزم ، ایک نیا ولولہ اور ایک نیا جوش و خروش پیدا کر دیا ہے ۔ آج تمام ملک ان کی اس جرأت افروز دعوت عمل سے گونج رہا ہے :

''فتح ہمیشہ حق کی ہوتی ہے ۔ مردانہ وار آگے بڑھو اور دشمن

پر ٹوٹ پڑو! خدا تمھارا حامی و ناصر ہے۔''

''ہمارا مقابلہ ایک عیار اور بدطینت دشمن سے ہے۔ اس نے لاہور کے محاذ پر تین جانب سے اچانک حملہ کرنے کی کوشش کی۔ غالباً وہ مسٹر لال بہادر شاستری کی تازہ ترین دھمکی کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہتا تھا جس میں انھوں نے کہا تھا کہ بھارت اپنی جنگی حکمت عملی پر نظر ثانی کرے گا۔ لیکن ہمارے جانباز جوان مکمل طور پر مستعد اور ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھے، انھوں نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ جوابی حملے کیے اور دشمن کا منہ پھیر دیا۔

اب تک تمام معرکوں میں بھارت کی فضائی اور بری افواج کو مادی برتری حاصل رہی ہے لیکن ان کے فوجی ساز و سامان کی فراوانی اور حملہ آوروں کی نفری ان کے کچھ کام نہ آئی۔ ہر معرکے میں خدا کے فضل و کرم سے پاکستان کا پلہ بھاری رہا۔ ہماری بری اور فضائی افواج نے ہر بار دشمن کے چھکے چھڑا دیے۔ انھوں نے جس چوکسی، جانبازی اور فن جنگ میں مہارت کا ثبوت دیا ہے، اس پر وہ ہم سب کی پر خلوص مبارکباد کی مستحق ہیں۔ یہ ان کی نہیں پوری قوم کی فتح مندی ہے۔ اس پر ہمارا سر فخر سے اونچا ہوگیا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ وہ پاکستان کا پرچم اسی طرح بلند رکھیں گی۔''

(مشرق لاہور - ۸ ستمبر ۱۹۶۵ء)

روزنامہ نوائے وقت لاہور نے ۷ ستمبر ۱۹۶۵ء کی اشاعت میں ''ہنگامی حالات'' کے زیر عنوان اداریے میں لکھا

''صدر پاکستان نے ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا ہے، اور ڈیفینس آف پاکستان رولز نافذ کر دیے ہیں۔ بھارت نے کشمیر

میں شکست سے دوچار ہو کر پاکستان کے خلاف جارحانہ کارروائی کا جو آغاز کیا ہے یہ اقدامات اس سے پیدا شدہ صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کیے گئے ہیں۔ کشمیر میں اعلان کیے بغیر جنگ دراصل پاکستان و بھارت میں جنگ کے مترادف تھی اور جس تیزی سے صورت حال بدل رہی ہے، اس کے پیش نظر پاکستان و بھارت میں وسیع تر جنگ خلاف توقع نہیں رہی تھی - - - - - بہر حال ہمیں اس امر کی پوری توقع ہے کہ اہل پاکستان اس آزمائش کے مرحلے میں ثابت قدمی اور حوصلہ مندی کا پرچم اور زیادہ سربلند کریں گے۔ دشمن نے پاکستان کے خلاف جارحانہ کارروائی کشمیر میں جنگ ہارنے کے بعد کی ہے۔ انشاء اللہ العزیز دشمن کو کشمیر کی طرح ہر محاذ پر دندان شکن جواب ملے گا اور بھارت کے حکمرانوں نے مرتے مرتے پاکستان کے خلاف جو کارروائی کی ہے وہ بھارت کے لیے مزید تباہ کن ثابت ہوگی - - -۔"

نوائے وقت ہی نے جنگ بندی کے بعد ۲۴ ستمبر ۶۵ کو 'شیر دل عساکر پاکستان کے نام' اداریے میں لکھا:

"شیر دل عساکر پاکستان کو سلام! جنہوں نے ایمان کی دولت سے سرشار ہو کر اپنے مقدس وطن کی آزادی و سلامتی پر کوئی آنچ نہ آنے دینے کے پاکیزہ وارفع نصب العین کی خاطر دفاع پاکستان اور آزادی کشمیر کے جہاد عظیم میں عہد آفریں حصہ لیا۔ اپنے خون سے اسلام کی تاریخ میں سنہرے باب کا اضافہ کیا اور حملہ آور دشمن کی ۱۸ سالہ جنگی تیاریوں کو اللہ تعالیٰ کی نصرت سے صرف سترہ دن میں ملیا میٹ کر دیا، اس قرآنی ارشاد کی عملی تعبیر پیش کر دی:
بہت دفعہ ایسا ہوا ہے کہ تھوڑی جمعیت والوں نے کثیر جمعیت پر غلبہ پا لیا۔ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے جنہوں نے اپنے

تمام ہم وطنوں کی جان ، مال اور آبرو کی حفاظت کرنے کا فرض اس شان سے ادا کیا کہ پاکستان کا ہر شہری ان کی بے مثل شجاعت اور جذبہٴ شہادت کی تعریف میں رطب اللسان ہے اور ہر پاکستانی اپنے دل کی گہرائیوں سے ان کی سلامتی اور کامیابی کے لیے بارگاہ رب العزت میں انتہائی عاجزی سے دست بدعا ہے ؎

بہ آن گروہ کہ از ساغر وفا مستند
سلام ما برسانید ہر کجا ہستند''

روزنامہ امروز نے ۷ ستمبر ۱۹۶۵ء کو صفحہٴ اول پر 'فتح ہماری ہے' کے زیر عنوان ایک خصوصی اداریے میں لکھا :

''ہندوستانی حکمرانوں نے ہماری غیرت اور حمیت کو للکارا ہے۔ انہوں نے پاک سرزمین پر اپنے ناپاک قدم رکھنے کی جرأت کی ہے مگر وہ کم ظرف اور مکار حملہ آور ثابت ہوئے ہیں۔ انہوں نے اخلاق اور قانون کے تمام آداب بالائے طاق رکھ دیے اور اعلان جنگ کیے بغیر بین الاقوامی سرحد پار کی۔

پاکستانی فوج کے جرأت مند جوانوں نے حملہ آوروں کو منہ توڑ جواب دیا ہے۔ ہندوستانی فوج اپنی روایات کے مطابق راہ فرار اختیار کر رہی ہے اور وہ دن دور نہیں ہے جب ہندوستانی سپاہی اور عوام یہ محسوس کر لیں گے کہ ان کے تعصب زدہ اور جنگ پسند حکمرانوں نے کس جہنم میں جھونک دیا۔

پاکستان ہماری عزت اور ہماری زندگی ہے۔ اس کی ایک ایک انچ زمین مقدس ہے اور اس کے ایک ایک حصے کی حفاظت کے لیے ہم بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار ہیں۔ یہ وقت نعروں کا نہیں عمل کا ہے۔ گفتار کا نہیں کردار کا ہے۔ آئیے ہم سب مل کر اپنا اپنا فرض جرأت ، استقامت اور سکون سے ادا کریں اور دشمن پر

ثابت کر دیں کہ ہم ایک ہیں اور آزمائش کی گھڑی میں ہم سے بڑھ کر کوئی قوم جرأت مند ، ثابت قدم اور فرض شناس نہیں ہے۔''

۱۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو امروز نے 'آزادی کا تحفظ ـــ سب کا فرض' کے زیر عنوان اداریے میں لکھا :

''پاکستان اپنی آزادی اور سالمیت کے تحفظ کے لیے حملہ آور ہندوستان کے خلاف نبرد آزما ہے ۔ ہماری افواج نے جس پامردی ، جرأت ، مہارت اور استقامت سے دشمن کے حملوں کو روکا اور پسپا کیا ہے تاریخ اسے ہمیشہ یاد رکھے گی ' اور شجاعت و مردانگی کے باب میں پاکستان کے جری اور جاں نثار جوانوں کا نام ہمیشہ احترام سے لے گی ۔ جنگ کا دائرہ پھیل رہا ہے ۔ آزمائش کا دور طول پکڑ سکتا ہے ۔ ہمیں بزدل اور مکار دشمن پر یہ بات روز روشن کی طرح واضح کر دینی ہے کہ پاکستان قائم و دائم رہنے کے لیے عالم وجود میں آیا ہے ۔ کوئی بھی ملک اسے مکر و فریب سے ، سازش سے ، یا جنگی طاقت سے زک نہیں پہنچا سکتا ہے ۔

تاجروں پر واجب ہے کہ انھوں نے اشیائے ضرورت کی مناسب داموں پر فراہمی کا جو روشن ریکارڈ قائم کیا ہے اسے برقرار رکھیں ۔ صنعت کاروں اور مزدوروں پر لازم ہے کہ وہ پیداوار میں اضافے کی رفتار کو مزید بڑھائیں ۔ اسی طرح ہر شعبے میں کام کرنے والے ہر شخص کا یہ قومی فرض ہے کہ وہ اپنے فرائض پوری تندہی اور ذمہ داری سے ادا کرے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔''

اور

اللہ کی راہ میں اس وقت تک جہاد کرو کہ فتنہ باقی نہ

رہے۔ (قرآن حکیم) ۱۲ ستمبر ۱۹۶۵ء

''ظالموں کا یوم حساب

بھارت نے جن عزائم کے ساتھ پاکستان کے خلاف جنگ کی ابتدا کی تھی وہ چھٹے روز ہی مغربی پاکستان کی سرحدوں کے پار دم توڑ رہے ہیں۔ واہگہ، فیروز پور، اکھنور، سیالکوٹ، جوڑیاں اور دوسرے محاذوں پر بھارت کی پسپائی ان لوگوں کے لیے غیر متوقع نہیں جو ہندو فاشزم کی تاریخ سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتے ہیں۔ برہمنی سامراج کے علمبرداروں کا پورا ماضی اس حقیقت کی گواہی دیتا ہے کہ جب انہیں اپنے مد مقابل کے کمزور ہونے کا یقین ہوتا ہے تو وہ نازیوں اور فسطائیوں سے کہیں زیادہ جنگجو بن جاتے ہیں۔ لیکن جب بھی کسی نے ضرب کے مقابلے میں ضرب لگائی تو ان کی بڑی سے بڑی افواج بکریوں کے ریوڑ ثابت ہوئیں۔ سکندر اعظم سے لے کر احمد شاہ ابدالی کے زمانے تک ہندوستان کی تاریخ کسی ایسی جنگ کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ جب ہندو نے کسی میدان میں ایک بار شکست کھانے کے بعد دوبارہ کسی قابل ذکر قوت کا مظاہرہ کیا ہو۔

''وہ جہلم کے کنارے یونانیوں کے ہاتھ سے شکست کھاتے ہیں تو سکندر اعظم کے لیے بیاس تک کا راستہ صاف ہو جاتا ہے۔ محمد بن قاسم اپنے مٹھی بھر مجاہدوں کے ساتھ دیبل، برہمن آباد اور ملتان کے میدانوں میں ان کا غرور توڑتا ہے تو انہیں صدیوں تک سر اٹھانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ محمود غزنوی کی فتوحات کے سیلاب کی پہلی لہر سرزمین پنجاب میں داخل ہوتی ہے تو اس کے بعد کالنجر، قنوج اور سومنات تک اس کے راستے صاف ہو جاتے ہیں،

اور پھر تقریباً آٹھ صدیاں ہندو کے دل میں ملک گیری کی ہوس پیدا نہیں ہوتی ۔ اس کے بعد جب دلی میں مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہوتا ہے اور ہندوستان کے مسلمان اپنی حیات اجتماعیہ کے تقاضوں سے غافل ہو جاتے ہیں تو ہندو سامراج کا عفریت اپنی پوری ہولناکیوں کے ساتھ نمودار ہوتا ہے ۔ پھر قدرت کی طرف سے مسلمانوں کی دعاؤں کا جواب آتا ہے ۔ احمد شاہ ابدالی پانی پت کے میدان میں اس عظیم لشکر کو شکست دیتا ہے جو ہندو سامراج کی سرحدیں کابل اور قندھار سے آگے لے جانا چاہتا تھا ۔ یہ ایک اور دس کا مقابلہ تھا ، لیکن ایک وہ تھا جسے اللہ کی نصرت پر بھروسہ تھا ؛ جسے غازی کی زندگی اور شہید کی موت سے محبت تھی ، اور دس وہ تھے جو صرف تعداد اور مالی وسائل پر بھروسہ رکھتے تھے ؛ جنہیں صرف بھاگتے ہوئے دشمن پر وار کرنا اور وار کرنے والے دشمن کے آگے بھاگنا سکھایا گیا تھا ۔ پانی پت کے میدان میں احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں ہندو جارحیت کی عبرتناک شکست نے ایک بار پھر انسانی تاریخ کی اس صداقت کی گواہی دی تھی کہ جب مسلمان کا سینہ نور ایمان سے منور ہوتا ہے اور وہ میدان جنگ میں موت سے پنجہ لڑانے کے لیے آگے بڑھتا ہے تو فتوحات اس کے قدم چومتی ہیں ۔ جب وہ دشمن کی تلواروں کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو جاتا ہے تو جنگ کے فیصلے ہمیشہ اس کے مقدس خون کی روشنائی سے لکھے جاتے ہیں ۔ وہ آگ کے شعلوں کی طرف لپکتا ہے تو اسے اپنی آزادی کے سدا بہار نخلستان دکھائی دیتے ہیں ۔ چھ دن قبل ہندوستان کے وزیر جنگ نے بھارت کی پارلیمنٹ میں یہ اعلان کیا تھا کہ ہم نے لاہور پر حملہ کر دیا ہے تو راجہ داہر ، جے پال ، سیندھیا اور نانا فرنویس کے جانشین مسرت سے تالیاں بجا رہے تھے ۔ لیکن تاریخ کی یہ حقیقت ان کی نگاہوں سے پوشیدہ تھی کہ پاکستان میں محمد بن قاسم ،

محمود غزنوی اور احمد شاہ ابدالی کی روح آج بھی زندہ ہے۔ بھارتی جارحیت کے آغاز کے چھٹے روز پاکستان کے مجاہدین کی کارگزاری کے نتائج دیکھ کر ہم پورے یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ بھارت کا یوم حساب شروع ہو چکا ہے۔ وہ غرور جس نے محمد بن قاسم، محمود غزنوی اور احمد شاہ ابدالی کے فرزندوں کی غیرت کو للکارا تھا خاک میں مل رہا ہے۔ ہمارے طارق اور خالد اس اژدہے کے جبڑے چیر رہے ہیں جو اٹھارہ برس سے کشمیر کی وادیوں میں پھنکار رہا تھا۔ پاکستان کے سپاہیو! ملت تمہاری شکر گزار ہے۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو! ۔ بڑھے چلو بڑھے چلو!"

(کوہستان لاہور)

اس انداز کے اداریے صرف پاکستانی اخبارات میں نہیں لکھے جاتے، بلکہ دوسرے ملکوں کے اخبارات بھی یہی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر دوسری عالمگیر جنگ کے دوران ۵ مارچ ۱۹۴۲ء کو مندرجہ ذیل اداریہ امریکہ کے ہارورڈ نیوز پیپرز کے مختلف زبانوں میں شائع ہونے والے اخبارات میں چھپا۔

"جاگو! امریکیو جاگو
بہت دیر ہو چکی ہے

قوم کو جو سنگین خطرہ درپیش ہے اس کا مقابلہ کرنے کے لیے اسے پوری طرح ہوشیار ہو جانا چاہیے۔

قوم کو یہ احساس ہونا چاہیے کہ گزشتہ تین ماہ کی جنگ میں ہم بہت بڑی شکست کی ذلت اٹھا چکے ہیں۔ اندیشہ ہے کہ امریکہ اور اس کے اتحادی یہ جنگ ہار جائیں اور ان کا حشر وہی ہو جو فرانس کا ہوا۔ اگر حالات یہی رہے تو یہ اندیشہ درست

ثابت ہو سکتا ہے۔ کیا قوم کو اس کا احساس ہے؟

اس کا امکان ہے کہ جاپانی افواج اپنے وسائل کی بنا پر ہندوستانیوں کو دھکیلیں اور جرمن افواج مشرق قریب کو روندتی ہوئی جاپانی افواج سے جا ملیں اور اس طرح دونوں کے اشتراک سے ایک ناقابل تسخیر فوج بن جائے۔ کیا قوم کو اس خطرے کا احساس ہے؟

قوم کو اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے کہ ابتدا میں خواہ ہمیں شکستیں ہوتی رہیں، آخری اور فیصلہ کن فتح ہماری ہوگی۔ امریکہ اپنی سرخروئی اور بقا کے لیے تبھی سرتوڑ کوشش کر سکتا ہے جب وہ موجودہ خطرات کو پوری طرح محسوس کر لے۔ خدا نخواستہ ہمیں یہ احساس فرانس کی طرح بعد از وقت ہو۔

ناظم پیداوار ڈونالڈ نیلسن نے اپیل کی ہے کہ دن رات کام کرکے صنعتی پیداوار میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کیا جائے۔ کیا ہم ایسا کر سکتے ہیں؟ ہم اس وقت تک ایسا نہیں کر سکتے:

* جب تک ہم اپنی موجودہ نفسیات کو تبدیل نہیں کرتے۔ جب تک ہم ”کم سے کم کام زیادہ سے زیادہ اجرت“ کے انداز فکر کو ترک نہیں کرتے۔

* جب تک ہم زیادہ پیداوار کی بجائے زیادہ معاوضہ کا خیال ذہن سے نہیں نکالتے۔

* جب تک ہمارے زراعت پیشہ سیاست دان ضروریات کی چیزوں میں اضافہ کرنے کی بجائے زیادہ قیمت حاصل کرنے کی تگ و دو ختم نہیں کرتے۔

* جب تک کساد بازاری پر قابو پانے کے لیے قائم شدہ

سرکاری ادارے کساد بازاری کے خاتمے کے باوجود وہ زر اندوزی بند نہیں کرتے جس کو اسلحہ بندی کے کام میں لایا جا سکتا ہے ۔

* جب تک وفاقی اخباری ادارے ان سرگرمیوں کی تشہیر اور فروغ بند نہیں کرتے جن کی اس وقت ضرورت ہے نہ فائدہ ۔

* جب تک کانگرس کے ارکان دریاؤں اور نہروں کے متعلق بیکار منصوبوں پر بحث کرنے اور ٹھیکوں اور کارخانوں کا خیال چھوڑ کر محکمہ دفاع کے افسروں کی باتوں پر توجہ نہیں کرتے ۔

* جب تک ان منصوبوں کو ترک نہیں کیا جاتا جن کی نہ تو ضرورت ہے اور جن کی تکمیل کے لیے نہ تو کارکن ملتے ہیں ۔

* جب تک سی ۔ سی ۔ سی اور این ۔ وائی ۔ اے ایس انجمنیں ان نوجوانوں کے نام پر بے تحاشا روپیہ کھانا بند نہیں کرتیں جنہیں اس وقت ثقافت اور سیر و تفریح کے جھمیلوں کو ترک کرکے مسلح افواج یا جنگی فیکٹریوں میں موجود ہونا چاہیے ۔

* جب تک ہڑتالوں کا سلسلہ بند کرکے دفاعی ضروریات کے سامان کی پیداوار بڑھائی نہیں جاتی ۔

* جب تک بند مکانوں اور فیکٹریوں کو کھلوا کر پیداوار زندگی یا موت کے اصول کے تحت حاصل نہیں کی جاتی ۔

* جب تک فی ہفتہ چالیس گھنٹے کام کی صورت میں اتوار کو کام کرنے کا دگنا معاوضہ مانگنا بند نہیں کیا جاتا ۔

* جب تک فوجی ضروریات اور جنگی سامان تیار کرنے والے کارخانوں میں بھرتی کی رفتار تیز کرنے کے لیے دلالی اور رشوت ختم نہیں کی جاتی ۔

* جب تک نارمنڈی اور دوسرے بحری جنگی جہازوں کے لیے بھرتی پر جرائم پیشہ لوگوں کے گروہوں کی اجارہ داری ختم نہیں ہوتی ۔

* جب تک پانچویں کالم سے تعلق رکھنے والوں کی حوصلہ شکنی نہیں ہوتی اور دفاعی لحاظ سے اہم علاقوں میں دشمن کے حلیفوں کی آمد و رفت بند نہیں ہوتی ۔

* جب تک کہ عوام کو ہوائی اور دوسرے خفیہ حملوں سے حفاظت کے طریقے سکھانے کا اہم کام سماجی سرگرمیوں جیسے بے مقصد کام سے الگ نہیں کیا جاتا ۔

* جب تک مختلف با اثر گروہ فائدوں ، انعامات اور پنشنوں میں اضافے کے مطالبات کا سلسلہ بند نہیں کرتے ۔

غرض پیداوار اس وقت تک نہیں بڑھ سکتی جب تک :

اول ۔ ہمیں خطرے کی سنگینی کا احساس نہ ہو

دوم ۔ ان مطالبات پر قابو نہ پائیں کہ :

اوقات کار کم کرو ، اجرتوں میں اضافہ کرو ، نفع بڑھاؤ ، زائد کام کا معاوضہ بڑھاؤ ، پنشنوں میں اضافہ کرو ، فصلوں پر نفع زیادہ دو ، سہولتوں میں اضافہ کرو ، جمع دولت میں حصہ دار بناؤ ، تلے ہوئے انڈے دو ، یہ دو اور وہ دو ۔

فرانس میں بھی 'مجھے دو' اور 'ہمیں دو' کی صدائیں گونجتی تو ہیں ۔ یہ صدائیں گونجتی رہیں حتٰی کہ جرمن فوجیں پیرس کے قریب پہنچ گئیں ۔ اس وقت ہر فرانسیسی کام کرنے کے لیے دیوانہ وار لپکا مگر پانی سر سے گزر چکا تھا ۔ آج فرانس میں اس قسم کا کوئی مطالبہ سنائی نہیں دیتا ۔ البتہ ایسی صدائیں بلند ہوتی ہیں : ''خدا کے لیے میرے بچے کے لیے روٹی کا ٹکڑا دو ۔ مجھے سر چھپانے کی جگہ دے دو ۔ مجھے موت ہی دے دو ۔''

یورپ میں موت کا نقارہ بج رہا ہے ۔ اس کی تھاپ بلند سے

بلند ہوتی جاری ہے ۔ لندن پر موت کی افسردگی مسلط ہے ۔ ڈوور اور مڈلینڈ دھواں ہیں لیکن ہم پھر بھی سوئے ہوئے ہیں ۔

یہ نیند کیسی ، یہ موت کی سی مدہوشی کیوں ؟ موت ہماری طرف دوڑی آ رہی ہے ۔ کیا ہم ابھی تک بے خبر ہیں ؟ نہیں ۔ یہ بے خبری نہیں ہے ۔ ہر تار برق اور ریڈیو کے ہر نشریے میں ہمیں مرتی ہوئی دنیا کی دبی ہوئی ہچکیاں سنائی دیتی ہیں ۔

پھر ہم جاگتے کیوں نہیں ؟ ہم غیر جانبداری کا کمزور اور بے فائدہ لبادہ کیوں اتار نہیں پھینکتے ؟ ہم میدان جنگ میں جانے سے کیوں گریزاں ہیں ؟ کیا عزت کی موت ذلت کی زندگی سے بہتر نہیں [۳] ؟"

اس اداریے میں الفاظ و مطالب کی تکرار ، سوالات اور جذبات کے ذریعے مطلوبہ اثر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

اپنی تمام وسعت کے باوجود ، موضوعات زمان و مکان کی قید سے آزاد نہیں ہوتے ، اس لیے موضوع کے اعتبار سے اداریوں کی چاہے جتنی قسمیں ہوں ، وہ حالات سے بہر حال ہم آہنگ ہوتے ہیں ۔ علاوہ ازیں خبروں پر مبنی اداریے یا سماجی ، جماعتی اور خصوصی اداریے سیاسی بھی ہو سکتے ہیں ، اقتصادی بھی ، وضاحتی بھی ، استدلالی بھی ، تعریفی بھی اور تنقیدی بھی ۔

قارئین کی دلچسپی کے لحاظ سے اداریے کی قسمیں

قارئین کی دلچسپی کے لحاظ سے بھی اداریے کی کئی قسمیں ہو سکتی ہیں ۔ اس دور میں اداریوں کے موضوعات میں جو وسعت

پیدا ہوتی ہے وہ ان کی افادیت اور ان میں قارئین کی دلچسپی پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ قارئین کی دلچسپی کا انحصار موضوع کی اہمیت اور ہمہ گیری پر ہوتا ہے۔ اس دور میں اداریے ثانوی اہمیت کے موضوعات پر بھی لکھے جاتے ہیں اور ان میں ایسے مقامی یا علاقائی مسائل پر بھی بحث کی جاتی ہے جو قارئین کے تمام حلقوں کے لیے دلچسپی کا باعث نہیں ہوتے۔ اس بنا پر قارئین کی دلچسپی کے لحاظ سے بھی اداریے کی قسمیں مقرر ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ مقامی دلچسپی کے حامل اداریے

۲۔ علاقائی دلچسپی کے حامل اداریے

۳۔ قومی یا وسیع تر دلچسپی کے حامل اداریے

۴۔ بین الاقوامی یا وسیع ترین دلچسپی کے حامل اداریے

وضاحت

اس دور میں ہر بڑا شہر ایک دنیا کی حیثیت رکھتا ہے جس کے اپنے گوناگوں مسائل ہوتے ہیں۔ چنانچہ اخبارات جن مقامات سے شائع ہوتے ہیں وہاں کے مقامی مسائل کو بھی اپنے ادارتی کالموں میں زیر بحث لاتے ہیں۔ اس لیے کہ مقامی مسائل اخبار کے ہزاروں قارئین کے مسائل ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر لاہور سے شائع ہونے والے اخبارات لاہور کے مسائل پر بھی اداریے لکھتے رہتے ہیں۔ یہ اداریے عموماً مقامی دلچسپی کے حامل ہوتے ہیں اور لاہور سے باہر کے قارئین کے لیے ان میں دلچسپی نہیں ہوتی۔ اسی طرح اخبارات علاقائی مسائل و امور پر بھی اداریے لکھتے ہیں۔ مثلاً لاہور ہی کے اخبارات دوسرے اضلاع یا مقامات کے مسائل کو بھی ادارتی کالموں میں زیر بحث لاتے ہیں۔ اس قسم کے اداریے متعلقہ علاقوں کے لوگوں کے لیے تو دلچسپی کے حامل ہوتے ہیں

مگر تمام قارئین کے لیے ان میں دلچسپی کا سامان نہیں ہوتا ۔ چنانچہ اداریے کی یہ قسم علاقائی دلچسپی کی حامل ہوتی ہے ۔ قومی نوعیت کے مسائل سے متعلق اداریے وسیع تر دلچسپی کے حامل ہوتے ہیں ، کیوں کہ ان مسائل کا تعلق پوری قوم یا ملک سے ہوتا ہے اور ان کی نوعیت مقامی یا علاقائی نہیں ہوتی ۔ بین الاقوامی مسائل و امور سے متعلق اداریے وسیع ترین دلچسپی کے حامل ہوتے ہیں ، کیوں کہ اس نوع کے اداریوں میں ان مسائل پر تبصرہ کیا جاتا ہے جو ایک سے زیادہ ملکوں بلکہ بعض اوقات تمام دنیا کے انسانوں سے تعلق رکھتے ہیں ۔

مثالیں

۱ ۔ مقامی دلچسپی کا حامل اداریہ

صارفین اور حکومت

کراچی میں اشیائے صرف کی قیمتوں کو مناسب سطح پر رکھنے کے لیے مقامی انتظامیہ اور متعلقہ محکموں کی جانب سے مختلف فیصلے اور اقدامات کیے گئے ہیں ۔ ان فیصلوں پر دیانتداری اور سختی سے عمل درآمد کیا گیا تو اس کے نتائج یقیناً حوصلہ افزا ہوں گے ۔ راشن کی دکانوں پر اکتالیس پیسے فی سیر کے حساب سے آٹے کی فروخت شروع کر دی گئی ہے ۔ جب کہ پچھلے چند ہفتوں سے کھلے بازار میں ایسا ہی آٹا ۹ آنے سیر بکتا رہا ہے ۔ انتظامیہ نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ اس سلسلے میں ہر قسم کی بد عنوانی کی روک تھام کے لیے ضروری اقدام کر لیے گئے ہیں ۔ اس کے علاوہ قیمتوں میں استحکام کی کمیٹی نے بھی چند اہم فیصلے کیے ہیں ۔ اس نے تمام نجی و نیم سرکاری اداروں اور محلوں میں ارزاں نرخوں کی دکانیں کھولنے کا پروگرام بنا لیا ہے

جہاں دودھ ، آٹا ، گھی ، سبزی ، کپڑا اور ایسی ہی دوسری اشیا مناسب نرخوں پر فراہم کی جائیں گی - کے ڈی اے ، ریلوے اور کے ایم سی سے بھی کہا گیا ہے کہ وہ اپنے ملازمین کے لیے سٹور قائم کریں - اس کے علاوہ بنیادی ضرورت کی اشیا کی رسد میں باقاعدگی پیدا کرنے کے لیے صارفین کی ایک تنظیم قائم کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا ہے جو قیمتوں میں اضافے کے علاوہ ملاوٹ کی روک تھام کی بھی کارروائیاں کرے گی - ان اقدامات سے مہنگائی میں مزید اضافہ کو روکنے میں بلا شبہ بڑی مدد ملے گی اور صارفین کو اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے ایک پلیٹ فارم مل جائے گا لیکن ان احتیاطی تدابیر کے ساتھ ہی اشیائے صرف کی قیمتوں میں حالیہ اضافے کا فوری سد باب بھی نہایت ضروری ہوگا جو غریب اور متوسط طبقے کے لیے ناقابل برداشت ہو گیا ہے - - - -

حکومت نے ہمیشہ سختی سے گریز کیا ہے لیکن اب مزید رعایت اور نرمی کی کوئی گنجائش نہیں رہی ہے - اس مرحلے پر منافع خوروں کو جتنی ڈھیل دی جائے گی اشیائے صرف کی قلت اور مہنگائی پر قابو پانا اتنا ہی پیچیدہ اور دشوار ہوتا جائے گا - ہم نہیں سمجھتے کہ موجودہ حکومت اس مسئلے کو اس حد تک سنگین ہو جانے کا موقع دے گی -

(حریت - ۵ - اکتوبر ۱۹۶۹ء)

۲ - ''ذمہ داری کس کی ہے ؟

احمد پور شرقیہ کی تحصیل کونسل کے اجلاس میں مقامی زمینداروں کو بجلی کی کم سپلائی کے سوال پر ایس ڈی او واپڈا نے بتایا کہ یہ کمی ٹرانسفارمر جلنے کا نتیجہ ہے - ایس ڈی او موصوف نے یہ انکشاف بھی کیا کہ اس صورت حال پر ڈیڑھ ماہ تک قابو نہیں پایا جا سکے گا - اس کا مطلب یہ ہوا کہ

اس علاقے میں نجی، صنعتی اور زرعی مقاصد کے لیے ڈیڑھ
ماہ تک بجلی کافی مقدار میں میسر نہیں آئے گی ۔ یہ فیصلہ
کرنا مشکل نہیں ہے کہ بجلی کی کمی کی وجہ سے مقامی آبادی
کو کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا ۔ خاص طور پر اس لیے
بھی کہ اس سال مسلسل خشک سالی کی وجہ سے بارانی علاقوں
میں گیہوں کی فصل پہلے ہی خراب ہو چکی ہے اور مزید چند دن
بارش نہ ہوئی تو بارانی علاقوں کی فصل کے کلیتاً ضائع ہو جانے
کا خطرہ ہے ۔ اس کے بعد ان علاقوں کی حالت بھی کچھ زیادہ
اچھی نہیں ہے جہاں نہری پانی آب پاشی کے لیے استعمال ہوتا ہے ،
اس لیے کہ گذشتہ چند ہفتوں سے بوجوہ نہروں میں بھی پانی کم
ہے اور بارش نہ ہو تو نہروں میں پانی کم ہو ہی جاتا ہے ۔
ایسے حالات میں کاشت کاروں کا انحصار ٹیوب ویلوں سے حاصل
ہونے والے پانی پر زیادہ ہوتا ہے ۔ بدقسمتی سے صوبے کے بیشتر
علاقوں میں بجلی کی غیر متوازن بہم رسانی یا واپڈا کے شعبۂ برقیات
کی بد انتظامی کی وجہ سے یہ ذریعہ بھی لائق اعتماد نہیں رہا ۔ جیسا
کہ احمد پور شرقیہ کی متذکرہ خبر میں بتایا گیا ہے کہ متعلقہ
حکام نے ڈیڑھ ماہ تک اصلاح احوال کے سلسلے میں معذوری کا
اظہار تو کر دیا ہے مگر یہ نہیں بتایا کہ صارفین کے اس نقصان
کا کون ذمہ دار ہے ۔ ٹرانسفارمر لگانا ، ان کی دیکھ بھال کرنا یا
جل جانے کی صورت میں انہیں تبدیل کرنا صارفین کی نہیں ، واپڈا
کے اہل کاروں کی ذمہ داری ہے ۔ محض بیان دینے اور معذوری
ظاہر کرنے سے مطلوبہ مقاصد حاصل نہیں ہوتے ۔ تحصیل کونسل
کے اجلاس میں کونسل کے چیئرمین نے متعلقہ حکام کی توجہ بجا
طور پر اس مسئلے کی طرف مبذول کرائی ہے ۔ ان کی اس رائے سے
اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ بجلی کی سپلائی بند ہونے سے صنعت
کاروں اور کارخانہ داروں کو تو وقتی طور پر نقصان پہنچتا ہے

لیکن کاشت کار وقت پر فصل کو سیراب نہ کر سکیں تو ان کی چھ ماہ کی محنت رائگاں ہو جاتی ہے ------ امروز لاہور

۳ - مستحن فیصلہ

کمشنر ملتان ڈویژن کے اس اقدام پر صوبے کے زرعی حلقوں میں یقیناً اطمینان و مسرت کا اظہار کیا جائے گا کہ انہوں نے اپنے ڈویژن میں زرعی زمین کے ان دس ہزار الاٹیوں کو زیر کاشت زمین کے ملکیتی حقوق دے دیے ہیں جو امداد باہمی کی کواپریٹو فارمنگ سوسائٹیوں کے ذریعے سرکاری زمینوں پر بیس سال سے محض مزارعین کی حیثیت سے کاشت کرتے چلے آئے تھے - کمشنر ملتان نے محکمہ امداد باہمی اور محکمہ مال کے متعلقہ افسروں کو دو ماہ پہلے ہدایت کی تھی کہ وہ ایسے مزارعین کے حقوق ملکیت کے بارے میں پڑتال کریں - زمین کی قیمت کے تعین اور اس کی ادائگی کے لیے طویل المیعاد اقساط مقرر کرکے حقوق ملکیت ان کے نام منتقل کریں - چنانچہ ملتان اور ساہیوال کے ضلعوں میں ایک سو بتیس دیہات میں یہ پڑتال مکمل ہونے کے بعد دس ہزار الاٹی مزارعین کو حقوق ملکیت دے دیے گئے ہیں اور وہ معاملہ خوش اسلوبی سے طے ہو گیا جو نہ صرف بیس برس سے معرض التوا میں پڑا ہوا تھا بلکہ جس کی وجہ سے کاشتکاروں میں مستقبل کا اعتماد اور کارکردگی کا معیار بھی متاثر ہوتا تھا -

قومی یا وسیع تر دلچسپی کے حامل اداریے

۱ - ہم کیا کریں ؟

حریت میں ''دیوان عام'' کے کالموں میں ایک دردمند پاکستانی کا مراسلہ شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے ''ہم کیا کریں'' کے عنوان سے ایک بہت اہم اور توجہ طلب سوال اٹھایا

ہے ۔ مراسلہ نگار نے پاکستان کے اندرونی اور بیرونی دنیا کے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ گلہ کیا ہے کہ ایک قوم کی حیثیت سے اب کوئی منزل ہمارے سامنے نہیں رہی ۔ حالات سلجھنے کے بجائے روز بروز الجھتے جا رہے ہیں، اور حالت یہ ہے کہ : ''اب ہم نہ مسلمان ہیں نہ پاکستانی ، بلکہ خود پرست ہیں ۔ باتوں کے غازی ہیں اور کردار کے معاملے میں صفر ۔''

یہ خط پاکستان کے ان لاکھوں شہریوں کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے جو پاکستان بننے سے پہلے پیدا ہوئے ، اور جنھوں نے حالات کی ستم ظریفی سے مجبور ہو کر نہیں بلکہ پورے عقل و شعور کے ساتھ اپنی ایک علیحدہ مملکت کے مطالبے کی حمایت کی تھی ۔ یہ لوگ آج بجا طور پر حیران ، اداس اور ششدر ہیں ، اس لیے کہ انھوں نے پاکستان کے بارے میں جو خواب دیکھے تھے وہ ابھی تک اپنی تعبیر کے منتظر ہیں ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاں تک مادی ترقی کا تعلق ہے پاکستان نے اپنے وسائل کے اعتبار سے قابل رشک ترقی کی ہے۔ لیکن ترقی کا اندازہ صرف اینٹ پتھر کی عمارتوں اور ملوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد ہی سے تو نہیں کیا جاتا ، اس کے لیے ذہنی ، فکری اور تہذیبی نمو اور فروغ بھی اتنا ہی ضروری ہے اور اس میدان میں ہم جتنے انتشار کا شکار ہیں وہ ہر ایک اچھی طرح جانتا ہے ۔

وطن عزیز کے قیام کے ۲۲ برس بعد بھی یہ قوم ایک آئین سے محروم ہے اور اکابر قوم اس بارے میں دست و گریباں ہیں کہ اس آئین کی اساس کیا ہوگی ؟ نظریۂ پاکستان جو دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کے قیام کی بنیاد بنا اس کی صحیح تعبیر اور تشریح کیا ہے ، اور ملکی معیشت کو کن خطوط پر

استوار کیا جائے کہ دولت کی منصفانہ تقسیم اور ہر ایک کے لیے یکساں مواقع کی فراہمی ممکن ہو سکے ۔

وہ لوگ جو اس بارے میں عوام کی رہنمائی کر سکتے ہیں بیان بازی میں مصروف ہیں اور بیچارے عوام حیرت سے ایک ایک کا منہ تک رہے ہیں کہ وہ ان میں سے کس کی بات کو صحیح سمجھیں اور کس کے پیچھے چلیں ۔ اس کا جواب جن حضرات پر فرض ہے ہمیں امید ہے کہ وہ ہماری مشکل ضرور آسان کریں گے ۔
(حریت ۱۴ - اکتوبر ۱۹۶۹ء)

۲ - اردو ــ تحریک پاکستان کی زبان

پاکستان میں علاقائی اور قومی زبانوں کے مسئلے نے جو سنگین صورت اختیار کرلی ہے اس کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اس میں عصبیت و عناد کا رنگ آ گیا ہے ۔ رنج تو اس بات کا ہے کہ علاقائی زبانوں کی حمایت و محبت اردو سے دشمنی کی صورت اختیار کرتی جا رہی ہے ۔ انگریزی کو تو برداشت کیا جا سکتا ہے اور اسے سینے سے لگایا جا سکتا ہے لیکن اردو کو ایک شجر ممنوعہ قرار دیا جا رہا ہے ۔ یہ صورتحال صرف افسوسناک ہی نہیں بلکہ ایک قومی المیہ ہے ۔ اگر کوئی قوم اپنے سب سے قیمتی ورثے اور اثاثے ہی کو تحقیر کی نظروں سے دیکھنا شروع کردے اور اٹھا کر پھینک دینا چاہے تو اسے ایک المیے کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے ۔ اردو مشرق و مغربی پاکستان میں بسنے والے تمام باشندوں کی ایک مشترکہ میراث ہے ۔ اس کے ساتھ ایک ایسا تاریخی و تہذیبی پس منظر وابستہ ہے جو ہم میں یکجہتی و یگانگت اور قومی فخر و انفرادیت کا احساس پیدا کرتا ہے ۔ اس زبان سے کٹنے کا مطلب آئندہ نسلوں کو اس عظیم پس منظر سے بیگانہ و بے تعلق بنانے کے مترادف ہے ۔ اردو زبان کا نہ صرف

تحریک پاکستان سے گہرا تعلق ہے بلکہ عربی اور فارسی کا گنجینہ اور امین ہونے کے اعتبار سے یہ ہمارے تہذیبی و تاریخی رشتوں کو ماضی میں بہت دور تک پہنچا دیتی ہے۔ علامہ ابن حسن جارچوی نے کراچی میں ایک انطار پارٹی سے خطاب کرتے ہوئے اردو زبان کی اسی امتیازی حیثیت کی جانب متوجہ کیا ہے جسے آج ذہنوں سے محو کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ انھوں نے کہا : ''اردو تحریک پاکستان کی زبان ہے۔ برصغیر کی زبان اردو تھی ، اس تحریک کا پیغام اردو ہی کے ذریعے پہنچایا جا سکتا تھا ، اس لیے قائد اعظم کو بھی اردو زبان سیکھنی پڑی تھی۔ اردو علاقائی زبان نہیں ہے اور نہ اس کا سیاست سے کوئی تعلق ہے۔ اگر اردو نہ ہوتی تو مسلمانوں کے لیے الگ وطن بھی نہ بن سکتا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ نظریہ' پاکستان کو سمجھانے اور تحریک پاکستان کے پیغام کو اس برصغیر کے گوشے گوشے تک پہنچانے میں اردو نے ایک زبردست کردار ادا کیا تھا کیونکہ خیالات کی ترجمانی اور ایک دوسرے کی بات سمجھنے کا بھی ایک مشترکہ ذریعہ تھا۔ اردو کا یہ ایک ایسا بھاری احسان ہے جس کے نیچے پاکستان اور اس کے عوام ہمیشہ دبے رہیں گے۔ اس سے عناد اور بغض رکھنا احسان فراموشی کے مترادف ہے۔ آج بھی اردو ہی ہمارے درمیان بڑا واسطہ بنی ہوئی ہے۔ یہ پاکستان کی ایک علاقائی زبان نہیں بلکہ پورے برصغیر کے مسلمانوں کی زبان ہے۔ آئندہ نسلوں کو اردو کے اس مرتبہ و مقام سے واقف کرانا ہم سب کا فرض ہے۔ اسلام کے بعد اگر کوئی چیز ہماری قومی وحدت کو مضبوط بنا سکتی ہے تو وہ اردو ہی ہے ؛ اس لیے اب ہم کو تمام علاقائی زبانوں کی ترویج کے ساتھ اردو کی قدرو منزلات کو بلند کرنے کے لیے مل کر کام کرنا چاہیے۔

(شذرہ جنگ ۲۸ نومبر ۱۹۶۹ء)

بین الاقوامی یا وسیع ترین دلچسپی کے حامل اداریے

جراثیمی جنگ، زہریلی گیس

جنوبی ویٹنام میں امریکی فوجیوں کے ہاتھوں سینکڑوں نہتے ویٹ نامی مردوں، عورتوں اور بچوں کے قتل عام کے انکشاف، ایک امریکن فوجی افسر کے اعتراف، اور اس قتل عام کے احکام جاری کرنے والے فوجی افسر کے خلاف کورٹ مارشل کی ہیجان انگیز اور سنسنی خیز خبروں سے پیدا ہونے والے بحران کے درمیان صدر امریکہ نے ایک ایسا اہم اور دور رس اعلان کیا ہے جس نے ساری دنیا کی توجہ کو ایک دوسرے سنگین مسئلے کی طرف مبذول کر دیا ہے۔ جیسا کہ ''جنگ'' کی کل کی اشاعت میں اسی صفحہ پر شائع ہونے والے ایک مضمون میں بتایا گیا تھا، امریکہ نے ۱۹۲۵ء کے جینوا کنونشن کی اس اہم ترین شق کی ابھی تک توثیق نہیں کی تھی جس کا تعلق جراثیمی اور کیمیائی جنگ کو خلاف قانون قرار دینے سے تھا۔ مگر صدر نکسن نے اب اعلان کر دیا ہے کہ امریکہ جراثیمی اسلحے کو جنگ میں استعمال نہیں کرے گا۔ اس اعلان کا مطلب یہ ہے کہ امریکہ نے جراثیمی جنگ سے گریز کرنے کا حتمی وعدہ کیا ہے اور اس نے جراثیمی اسلحے کا جو اربوں ڈالر مالیت کا ذخیرہ کر رکھا تھا اسے صدر نکسن کے اعلان کے مطابق اب تباہ کر دیا جائے گا۔ ظاہر ہے صدر امریکہ کے اس اعلان کا ساری دنیا میں خیر مقدم کیا جائے گا کیونکہ ۱۹۲۵ء سے اب تک امریکہ کی طرف سے جینوا کنونشن کی توثیق نہ ہونے اور جراثیمی اسلحہ کے زبردست ذخائر کی موجودگی سے ساری دنیا لرزہ براندام تھی اور اس بات کا خطرہ موجود تھا کہ امریکہ کسی وقت بھی جنگی حالات سے تنگ آکر جراثیمی اسلحہ کے استعمال سے بنی نوع انسان کی تباہی اور بربادی کا باعث بن سکتا ہے، کیونکہ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم کے امریکی حملوں کی یاد ابھی تک دنیا کے دل و دماغ سے محو

نہیں ہوئی ۔ صدر نکسن کے اعلان میں گو واضح طور پر کہا گیا ہے کہ امریکہ جراثیمی اور کیمیائی اسلحہ استعمال نہیں کرے گا اور یہ کہ حکومت امریکہ بہت جلد ۱۹۲۵ء کے جنیوا کنونشن کی توثیق کر دے گی ۔ لیکن ان کے اعلان میں ایک زبردست ابہام پایا جاتا ہے جو ان کے بیان کی صداقت کو شک و شبہ میں ڈالنے کا باعث بن سکتا ہے ۔ امریکہ کے سربراہ اعلیٰ نے جو الفاظ اس اعلان کے سلسلے میں استعمال کیے ہیں وہ یہ ہیں کہ امریکہ جراثیمی اور کیمیائی جنگ شروع کرنے میں پہل نہیں کرے گا ۔ اس ایک جملے سے ان کے اس بیان کی نفی ہو جاتی ہے کہ انھوں نے جراثیمی اسلحہ تباہ کر دینے کے احکام جاری کر دیے ہیں ۔ جراثیمی اسلحہ میں زہریلی گیسوں کا نام سر فہرست آتا ہے اور امریکہ پر بارہا یہ الزام لگایا جا چکا ہے کہ اس نے جنوبی ویٹ نام کی جنگ میں کئی مرحلوں پر ویٹ کانگ گوریلوں کے خلاف زہریلی گیس استعمال کی ہے لیکن اب صدر نکسن کے بیان پر لندن اور واشنگٹن میں ماہرین نے جو تبصرے کیے ہیں ان میں کہا گیا ہے کہ وہ گیسیں جراثیمی اور کیمیائی جنگ کے زمرے میں نہیں آتیں جنوبی ویٹ نام میں استعمال کیا جاتا رہا ہے ۔ واشنگٹن میں ایک ترجمان نے دعویٰ کیا ہے کہ ویٹ نام میں کوئی مہلک گیس نہیں چھوڑی گئی بلکہ اکثر آنسو گیس استعمال کی گئی ہے جس کے مضر اثرات سے بچنے کی آسان ترین ترکیب یہ ہے کہ لوگ اس علاقے سے بھاگ جائیں جہاں اس گیس کا زور ہو ۔ بظاہر یہ تشریح قابل قبول معلوم ہوتی ہے لیکن صدر نکسن نے جراثیمی اور کیمیائی جنگ میں پہل نہ کرنے کی جو بات کہی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ ان زہر آلود اسلحہ اور گیسوں کے ذخائر کو مکمل طور پر تباہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا ۔ تاہم واشنگٹن میں اس کی وضاحت ایک ترجمان نے اس طرح کی ہے کہ امریکہ جراثیمی اور کیمیائی اسلحہ اور گیسوں کے جان لیوا اثرات

کے خلاف دفاع کرنے والی گیسوں ، آلات اور دیگر اسلحہ کی تیاری کا سلسلہ برابر جاری رکھے گا جس کو حملے کی بجائے دفاع کا ایک مؤثر ذریعہ قرار دیا گیا ہے - پچھلے کچھ دنوں سے اقوام متحدہ میں کمیونسٹ ممالک کی طرف سے یہ پرزور مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ جراثیمی جنگ کو خلاف قانون قرار دیا جائے۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو صدر نکسن کا اعلان بڑا بروقت ہے اور امید ہے اس سے عالمی سطح پر جراثیمی جنگ کے خلاف معاہدے کو عملی صورت دینے میں یقیناً بہت مدد ملے گی -''

(جنگ ۲۸ نومبر ۱۹۶۹ء)

ادارے کی اس تقسیم کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر مقامی یا ہر علاقائی نوعیت کے اداریے میں دوسرے علاقوں کے قارئین کی کی دلچسپی کا سامان ہرگز نہیں ہوتا - اگر مقامی یا علاقائی نوعیت کوئی مسئلہ عام انسانی دلچسپی کا حامل ہوگا تو وہ تمام قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہو سکتا ہے - مثال کے طور پر کسی علاقے میں رونما ہونے والے خوفناک حادثے ، جرم ، بدعنوانی ، اہم تقریب کے انعقاد وغیرہ پر لکھا ہوا اداریہ دوسرے علاقوں کے قارئین کے لیے بھی دلچسپی کا حامل ہوگا -

اسلوب کے لحاظ سے اداریے کی قسمیں

اسلوب کے لحاظ سے اداریوں کی عموماً تین قسمیں ہوتی ہیں :

۱ - جذباتی

۲ - منطقی و استدلالی

۳ - جذباتی اور منطقی کا امتزاج

یہ دور منطقی اور استدلالی اداریوں کا ہے - ان اداریوں میں قارئین کے جذبات کی بجائے ذہن سے اپیل کی جاتی ہے اور حالات و

واقعات کا مدلل تجزیہ کرکے قارئین کو قائل کیا جاتا ہے ۔ چنانچہ جب ذہن سے اپیل کرنی ہو تو وہی ذرائع استعمال کیے جا سکتے ہیں جو ذہن کو متاثر کر سکیں ۔ ان میں سب سے بڑا ذریعہ دلیل اور منطق ہے ۔ اس کے باوجود جب جذباتی انداز کے اداریے لکھنا ضروری ہو جاتا ہے تو اس موقع پر قارئین کے جذبات سے اپیل کرکے انھیں متاثر اور آمادۂ عمل کرنا مقصود ہوتا ہے ۔ اس قسم کے اداریوں میں ایک تو ایسے نعرے ، تلمیحات اور الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں جو قارئین کے دل پر گھرا اثر ڈال سکتے ہوں ، دوسرے زبان کو بھی پرزور بنایا جاتا ہے ۔ تیسری قسم کے اداریے میں منطق اور جذبہ دونوں سے کام لیا جاتا ہے ۔ بھرپور اثر پیدا کرنے میں اداریوں کی یہی قسم کامیاب ہوتی ہے ۔ انسان صرف ذہن یا صرف جذبات سے عبارت نہیں ہے ۔ اس کے پاس ذہن بھی ہوتا ہے اور جذبات بھی ۔ اس لیے ایسی بات زیادہ مؤثر ہو سکتی ہے جو دل و دماغ دونوں کو مطمئن کر دے ۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی وقت صرف ذہن سے اپیل کرنا زیادہ ضروری ہوتا ہے اور کسی وقت صرف جذبات سے اپیل کرنا ۔

یہ دور صاحب طرز اداریہ نویسوں کا نہیں ہے ۔ اب بہت کم اداریہ نویس منفرد اسلوب بیان رکھتے ہیں ۔ اب اداریوں کے اسلوب کا تعلق زیادہ‌تر موضوع اور وقت سے ہوتا ہے ۔ اداریہ نویس کا فرض ہے کہ وہ موضوع کی نوعیت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق زبان استعمال کرے اور اسلوب کو وقت سے ہم آہنگ بنائے ۔

اداریوں کی جو مثالیں اوپر دی گئی ہیں ان میں سے خصوصی اداریے جذباتی اداریوں کی مثال ہیں ۔ خبر یا پالیسی پر مبنی اداریے منطقی اور استدلالی ہیں ۔ معاشرتی اداریے جذبات اور منطق کا امتزاج ہیں ۔ ارل انگلش اور کلیرنس ہیچ (Clarence Hatch) مرتبین

Scholastic Journalism نے معنویت کے لحاظ سے اداریے کی قسمیں مقرر کی ہیں جو حسب ذیل ہیں :

۱ - وضاحتی اداریہ

اس قسم کے اداریے میں کسی واقعے ، نئے نظریے یا صورت حال کی اہمیت یا مفہوم کو واضح کیا جاتا ہے - اس میں مسائل و امور کا تعین کیا جاتا ہے - اشخاص یا عناصر و عوامل کا تعین و تشخص کیا جاتا ہے - تاریخی اور جغرافیائی پس منظر فراہم کیا جاتا ہے - افراد کی سرگرمیوں کے محرکات اور مقاصد کا جائزہ لیا جاتا ہے یا مختلف سرگرمیوں اور لائحہ ہائے عمل کے عواقب اور نتائج پر روشنی ڈالی جاتی ہے -

۲ - تنقیدی اداریہ

اس قسم کے اداریے میں 'مسئلہ' کے اچھے اور برے پہلوؤں کی نشاندہی کی جاتی ہے اور اس کا حل تجویز کیا جاتا ہے - اس نوع کے اداریے کا مقصد قاری کو متاثر کرکے قائل کرنا ہوتا ہے ، اس لیے اس میں سائنسی انداز میں مسئلے کا تعین کرکے متعلقہ حقائق کی روشنی میں مسئلے کا حل پیش کیا جاتا ہے -

۳ - تعریفی اداریہ

اس نوع کے اداریے میں افراد ، اداروں تنظیموں یا ان کی کارکردگی ، کارناموں ، پروگراموں وغیرہ کی تعریف کی جاتی ہے اور ان کی خدمات کا ذکر کیا جاتا ہے -

معنویت کے لحاظ سے اداریے کی یہ 'قسمیں' اصل میں پہلے بیان شدہ قسموں سے الگ نہیں ہیں - پالیسی پر مبنی اداریہ ، خبر پر مبنی اداریہ ، معاشرتی اداریہ یا خصوصی اداریہ وضاحتی یا تنقیدی یا تعریفی بھی ہو سکتا ہے - ارل انگلش اور کلیرنس ہیچ کی مقرر

کردہ 'اقسام' کو حتمی طور پر الگ اقسام تسلیم نہیں کیا جا سکتا ۔

سوالات

۱ ۔ اداریوں کی مختلف اقسام بیان کیجیے اور ہر 'قسم' کی خصوصیات پر روشنی ڈالیے ۔

۲ ۔ اداریے کو مقررہ قسم کے مطابق رکھنا کیوں ضروری ہے ؟ مختلف اقسام کے باہم خلط ملط ہونے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے ؟

۳ ۔ معاشرتی اداریہ اور پالیسی پر مبنی اداریے کا فرق مثالوں سے واضح کیجیے ۔

۴ ۔ ''بیشتر اداریے خبروں پر مبنی ہوتے ہیں'' تبصرہ کیجیے ۔

۵ ۔ خصوصی اداریے کب اور کیوں لکھے جاتے ہیں ؟ مدلل جواب دیجیے ۔

۶ ۔ جنگ یا بحران کے زمانے میں اداریہ کیا کردار ادا کرتا ہے ؟

۷ ۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں ہمارے اردو اخبارات نے کس قسم کے اداریے لکھے ؟ جواب کو مثالوں سے واضح کیجیے ۔

۸ ۔ اسلوب کے لحاظ سے اداریے کی قسمیں بیان کیجیے ۔

۹ ۔ قارئین کی دلچسپی کے نقطۂ نظر سے اداریے کی قسموں پر روشنی ڈالیے ۔

حوالہ جات

1, S. Natrajan, "A History of the Press in India," Asia Publishnig House 1962 – p. 121 -

2. Waldrop Gayle A., "Editor and Editorial Writer.'

پانچواں باب

اداریہ کی ہیئت

اداریے کی کوئی مخصوص ہیئت نہیں ہوتی - اداریہ ایک طرح کا مضمون یا مقالہ ہوتا ہے اور مضمون کی ہیئت کے لیے کوئی کلیہ مقرر نہیں کیا جا سکتا - لیکن عام طور پر اداریے کی ہیئت ترکیبی حسب ذیل ہوتی ہے :

۱ - عنوان
۲ - حقائق اور واقعات کا اختصار کے ساتھ بیان
۳ - وضاحت یا تجزیہ و تبصرہ یا بحث اور دلائل
۴ - فیصلہ ، نتیجہ یا رائے

اداریہ خواہ کسی بھی موضوع پر لکھا جائے اس کا آغاز ہمیشہ یہ بتانے سے کیا جاتا ہے کہ معاملہ یا مسئلہ کیا ہے اور وہ کون سے حقائق اور واقعات ہیں جنھوں نے اداریہ نویس کو قلم اٹھانے پر مجبور کیا ہے - اگر کوئی خبر موضوع بحث ہے تو ایک دو سطروں میں اس کا خلاصہ پیش کر دیا جاتا ہے - ذیل میں ہمارے یہاں کے اخبارات میں شائع شدہ چند اداریوں کے ابتدائیوں کی مثالیں دی جاتی ہیں ۔

ا ۔ ''گندم کی نئی پالیسی :

زرعی پالیسی کے متعلق گورنر کی مقرر کردہ کمیٹی ۔' آئندہ فصل ربیع کے لیے گندم کی پیداواری حد ۵۷ لاکھ ٹن مقرر کر دی ہے اور گندم کے کم سے کم نرخ بھی مقرر کر دیے ہیں ۔''

ب ۔ ''بات چیت کا ڈھونگ :

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں مسئلہ' کشمیر اور بھارت میں مسلم کش فسادات سے متعلق پاکستانی وزیر خارجہ کی تقریر کے جواب میں بھارت کے وزیر خارجہ نے ایک دفعہ پھر پاکستان کے ساتھ بات چیت کی پیشکش کی ہے ۔''

ج ۔ ''ملاوٹ کا روگ :

ایک جائزے کے مطابق صوبائی دارالحکومت میں کھانے پینے کی اشیا میں مضر صحت اجزا کی ملاوٹ کا رجحان فروغ پذیر ہے ۔ اس جائزے میں اعداد و شمار سے واضح کیا گیا ہے کہ سب سے زیادہ آمیزش دودھ ، گرم مصالحہ ، گھی اور کھلی چائے میں ہوتی ہے ۔''

اداریے کے آغاز میں اس طرح کے 'حقائق' بیان کرنے سے قارئین پر واضح ہو جاتا ہے کہ معاملہ کیا ہے اور کس موضوع پر بحث کی جا رہی ہے ۔ اس طرح گویا اداریے سے قارئین کا تعارف ہو جاتا ہے ۔ اداریہ نویس خبر یا واقعے کو بنیاد بنا کر اس کی توضیح و توجیہہ کرنے ، اس سے متعلق پس منظر اور مزید معلومات بیان کرنے ، دلائل سے اپنا نقطہ' نظر واضح کرنے اور کوئی فیصلہ دینے کے قابل ہو جاتا ہے ۔

بعض اوقات اداریہ کسی خبر یا واقعے کی بنیاد پر نہیں لکھا جاتا بلکہ کسی معروف حقیقت کو موضوع بنا کر اظہار خیال

کیا جاتا ہے اور اصلاح و تعمیر کی راہیں ہموار کی جاتی ہیں ۔ اس طرح کے موضوعات میں ''قومی کردار کے تقاضے''، ''بڑھتی ہوئی رشوت ستانی''، ''بے روزگاری''، ''کچھ تو سوچیے''، ''ہم کدھر جا رہے ہیں'' وغیرہ شامل ہو سکتے ہیں ۔ ایسے اداریے کا آغاز بھی کسی واضح حقیقت کی نشاندہی سے کیا جائے گا ۔ مثلاً قومی کردار کی اصلاح و تعمیر کے موضوع پر ایک اداریے کا آغاز کچھ اس طرح کیا جا سکتا ہے :

''قوم افراد معاشرہ سے علیحدہ نہیں ہوتی ۔ ہمارے یہاں یہ رسم عام ہو چکی ہے کہ ہم سب معاشرے کی برائیوں اور خرابیوں کے لیے دوسروں کو تو مورد الزام ٹھہراتے ہیں لیکن خود اپنی خرابیوں اور خامیوں پر کسی کی نظر نہیں جاتی ۔ ہر شخص دوسروں پر دشنام طرازی اور الزام تراشی میں مصروف نظر آتا ہے لیکن کسی میں اتنی اخلاق جرأت نہیں ہے کہ وہ برملا اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرے ۔''

خبری اداریوں کے واقعاتی حقائق کے بیان کی طرح یہ اداریہ بھی ایک واضح حقیقت کے بیان سے شروع کیا گیا ہے ۔ اس حقیقت کی نشاندہی کے بعد ایسے اداریے میں اس کی مزید وضاحت اور بعد میں اصلاح کے لیے تجاویز پیش کی جا سکتی ہیں ۔

اداریوں کی ایک قسم ایسی بھی ہے جن کا آغاز کسی حقیقت کے بیان کی بجائے آئندہ کے کسی خطرے یا کسی خوش آئند واقعے کی پیش گوئی سے ہوتا ہے ۔ مثلاً ''تدبر سے کام لیجیے'' کے زیر عنوان ایک ایسے اداریے کا آغاز اس طرح ہوا ہے :

''باخبر حلقوں میں آج کل یہ افواہ بڑی عام ہے کہ مختلف اقتصادی اور فنی امور میں مشورے کے لیے حکومت ایک ہزار بیرونی مشیروں کی امداد حاصل کرنے کی تجویز پر غور

کر رہی ہے -''

اسی طرح 'ایک اور خطرہ' کے عنوان سے ایسے ہی ایک دوسرے اداریے کا آغاز ان الفاظ میں کیا گیا ہے :

''گزشتہ سال ہزاروں بھارتی مسلمانوں کو شہید اور ان کے مکانوں کو نذرآتش کرنے کے بعد اب پھر بھارتی جن سنگھی نئے سرے سے فرقہ وارانہ فسادات شروع کرنے کے منصوبے بنارہے ہیں - اس امر کا واضح ثبوت بھارتی اخبارات میں شائع ہونے والے جن سنگھی لیڈروں کے وہ بیانات ہیں جن میں کھلم کھلا مسلمانوں کے خلاف نفرت و حقارت کا زہر اگلا جا رہا ہے -''

یہ ابتدائی حصہ جس میں حقائق اور واقعات (statement of facts) بیان کیے جاتے ہیں ، اداریے میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو کسی خبر میں اس کے ابتدائیہ (intro) کی ہوتی ہے - آغاز میں حقائق کے مطالعے سے قارئین کے ذہن میں واضح ہو جاتا ہے کہ اداریے کے لیے کس واقعے کو بنیاد بنایا گیا ہے -

وضاحت

حقائق اور واقعات بیان کرنے کے بعد اداریے میں ان کی وضاحت کی جاتی ہے - ضرورت ہو تو واقعات کا پس منظر بیان کیا جاتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ پس منظر پر تفصیل سے بحث کی جائے - عام طور پر اس کی جانب اشارے کافی ہوتے ہیں - اس کے علاوہ اداریے میں وہ حقائق بھی بیان کیے جاتے ہیں جو عام خبروں میں موجود نہیں ہوتے بلکہ اداریہ نویس انہیں تحقیق و جستجو کے بعد معلوم کرتا ہے اور بعض اوقات وہ قاری کے لیے ایک انکشاف کی حیثیت رکھتے ہیں - یہ مرحلہ بحسن و خوبی طے کرنے کے لیے طویل مشق ، عمیق مطالعے اور سوجھ بوجھ کی

ضرورت ہوتی ہے ۔ وضاحت کے بعد اداریہ نویس آخر میں اپنا فیصلہ یا رائے ظاہر کرتا ہے ۔

مثالیں

افسروں پر عوام کا اعتماد

آغاز ۔ واقعہ کا بیان :

''مغربی پاکستان کے گورنر نے حیدرآباد میں سرکاری افسروں کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے ان پر زور دیا ہے کہ وہ ہر شخص سے منصفانہ برتاؤ کریں ۔ معاملات کا غیر جانبدارانہ تصفیہ کریں اور اس سلسلے میں کوئی دباؤ یا ترغیب قبول نہ کریں کیونکہ صرف اسی طرح افسروں پر عوام کا کھویا ہوا اعتماد بحال ہو سکتا ہے ۔''

وضاحت پس منظر :

''ہمیں غیر ملکی حکمرانوں سے جو انتظامی ڈھانچا ورثے میں ملا ہے اس کی سب سے نمایاں خصوصیت یا خرابی یہ ہے کہ اس میں عوام اور حکام کو دو بالکل علیحدہ علیحدہ خانوں میں بانٹ دیا گیا ہے ۔ گزشتہ بائیس سال میں ان دونوں کے درمیان فاصل دیوار کو اگرچہ گرانے یا اس کی بلندی کم کرنے کی متعدد کوششیں کی گئی ہیں لیکن کچھ عجیب اتفاق ہے کہ ہر کوشش کے ساتھ اس دیوار کی بلندی میں کچھ اضافہ ہی ہوتا گیا ۔ آخر ایسا کیوں ہے اور اس کا کیا علاج ہے ؟

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کسی ملک کی حکومت کو خوش اسلوبی سے چلانے کے لیے ایسے سرکاری ملازم اور افسر ناگزیر ہیں جو ضروری قابلیت اور صلاحیت سے بہرہ ور ہوں ، جن کی دانشمندی اور معاملہ فہمی پر اعتماد کیا جا سکتا

ہو ، جو دیانت دار اور فرض شناس ہوں اور جنہیں حکومت چلانے کے لیے تمام ضروری اختیارات حاصل ہوں ؛ اس کا مطلب یہ ہے کہ ملک میں دفتری نظام اور انہیں چلانے والے سرکاری افسروں کا وجود ناگزیر ہے ۔ ظاہر ہے کہ اس پر کسی اعتراض کی گنجائش بھی نہیں ہو سکتی ۔ عوام اور ان لوگوں کو جو اس ملک سے محبت رکھتے ہیں صرف یہ بات کھٹکتی ہے کہ سرکاری افسر اپنے اختیارات کو عام لوگوں کی خدمت کے لیے نہیں بلکہ بعض اوقات خود اپنی یا اپنے احباب و اعزا کی خدمت کے لیے استعمال کرتے ہیں ۔ اس سلسلے میں عام لوگوں کی خاص خاص شکائتیں حسب ذیل ہیں :

* سرکاری افسر نہ صرف عوام بلکہ خود اپنے ماتحتوں کا اعتماد حاصل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کرتے ۔

* ان کے لیے قواعد و ضوابط کسی مسئلے کے انسانی پہلوؤں سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں ۔

* ان کے سامنے کوئی مطمح نظر یا بلند نصب‌العین نہیں ہے ۔

* وہ ضابطہ پرستی اور سرخ فیتے کے دلدادہ ہیں ۔

* وہ نیک نیتی پر مبنی تنقید کو بھی عناد پر محمول کرتے ہیں ۔

* عوام میں گھلنے ملنے پر اپنے آپ کو ان کا حاکم بننے کو ترجیح دیتے ہیں ۔

یہ اور اسی طرح کی دوسری خرابیوں کی بار بار نشان دہی کی جا چکی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ دفتر شاہی کا بڑے سے بڑا حامی بھی ان کی موجودگی سے مکمل طور پر انکار نہیں کرے گا ، لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی ، اصل اور اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ آخر ان خرابیوں کو دور کس طرح کیا جائے ؟ اس

سلسلے میں بھی ہمارے سامنے متعدد کمیشنوں کی رپورٹیں اور لاتعداد ماہروں کی رائیں موجود ہیں ۔ اس کے علاوہ ہم دنیا کے دوسرے ملکوں کے تجربات سے بھی بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں ۔ لیکن عوام پر سرکاری افسروں کا اعتماد بحال کرنے کا کوئی منصوبہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک ان کے درمیان بعد اور بے اعتمادی کی موجودہ خلیج کو پر کرنے کی کوشش نہ کی جائے ۔

فیصلہ ۔ رائے :

یہ خلیج اسی طرح پر کی جا سکتی ہے کہ سرکاری ملازموں میں ، خواہ وہ اعلیٰ ہوں یا ادنیٰ ، چھوٹے ہوں یا بڑے، یہ احساس پیدا کیا جائے کہ وہ عوام کے حاکم نہیں بلکہ خادم ہیں ۔ اس کے لیے موجودہ انتظامی ڈھانچے میں بعض بنیادی تبدیلیوں کی شدید ضرورت ہے لیکن انسان میں حقیقی فرض شناسی پیدا کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے اس میں مواخذے کا خوف پیدا کیا جائے ۔ سرکاری اہلکاروں میں اعلیٰ حکام کے مواخذے کا خوف بھی پہلے سے کم ہو گیا ہے ۔ ظاہر ہے کہ اس کی ذمہ داری خود ارباب اختیار پر عائد ہوتی ہے ، اگر وہ اپنے ، ماتحتوں کی سختی سے نگرانی کریں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ اپنے فرائض دیانت داری کے ساتھ ادا نہ کریں ۔

موجودہ صورت یہ ہے کہ کسی سرکاری شعبے میں کوئی خرابی پیدا ہوتی ہے تو ہر اعلیٰ افسر اس کی ذمہ داری اپنے ماتحت پر منتقل کرنے کی کوشش کرتا ہے ، حالانکہ اصلاح احوال کی ضمانت اسی وقت حاصل کی جا سکتی ہے جب کسی اہلکار کی غلطی پر محض متعلقہ شخص کا مواخذہ نہ کیا جائے بلکہ اس سے اوپر کے افسر سے بھی باز پرس کی جائے کہ اس نے اپنے ماتحت

کی پوری طرح نگرانی کیوں نہیں کی ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حالات کی اصلاح کے لیے یہ ضروری ہے کہ اختیارات کی تقسیم اوپر سے نیچے کی طرف کی جائے اور ذمہ داری کا تعین نیچے سے اوپر کی جانب کیا جائے ۔ اس طرح نظم و نسق میں لامرکزیت پیدا کرنے کا مقصد بھی حاصل ہو جائے گا اور کسی سرکاری افسر میں اپنے فرائض سے پہلوتہی کرنے کی جرأت نہیں ہوگی کیونکہ اسے معلوم ہوگا کہ اس کا افسر اعالی اس کی نگرانی کر رہا ہے اور افسر اعالی بھی ہر وقت چوکنا رہے گا کہ اس کے ماتحت نے کوئی غلطی کی تو اس کے ماتحت کے علاوہ خود اس سے بھی باز پرس کی جائے گی ۔ اس طرح سرکاری افسروں میں ذمہ داری کا احساس بڑھے گا ۔ اور یہ توقع کرنے کی بجائے کہ عوام ان کے پاس جائیں وہ خود عوام کے پاس جانے اور ان کی شکایتیں دور کرنے کی کوشش کریں گے ۔ (اداریہ مشرق لاہور ۔ ۲۷ اکتوبر ۱۹۶۶ء)

۲ ۔ نفع اندوزوں کا محاسبہ کب ہوگا ؟

واقعہ کا بیان :

"گورنر مغربی پاکستان نے صوبائی حکام کو پھر ایک بار ہدایت کی ہے کہ روز افزوں گرانی کی مؤثر روک تھام اور چور بازاری کے مرتکب افراد کو سخت سزائیں دی جائیں ۔

وضاحت :

گرانی کے بارے میں یوں تو پچھلے کئی ماہ سے مسلسل یہ شکایت کی جا رہی ہے ، کہ اشیائے ضرورت کی قیمتیں مسلسل بڑھ رہی ہیں ، اور ان قیمتوں کو قابو میں لانے اور عام آدمی کی مشکلات کو کم کرنے کی کوئی کوشش تا حال مؤثر ثابت نہیں ہو سکی ہے ۔ لیکن رمضان المبارک کی آمد کے ساتھ ہی اشیائے خوردنی کی قیمتوں میں مزید اضافہ ہوگیا ہے ۔ گھی سوا نو روپے اور ساڑھے نو روپے سیر تک فروخت ہو رہا ہے ۔ صاف ستھری گندم چوبیس

روپے من مل رہی ہے ۔ سبزیاں روپے اور بارہ آنے سیر سے اوپر ہی ہیں ۔ اس سے کم کسی چیز کی قیمت نہیں رہی ۔ گوشت بدستور پانچ روپے سیر فروخت ہو رہا ہے ۔ دالیں سوا دو روپے سیر ہو چکی ہیں ۔ غرض وہ تمام اشیائے ضرورت جو روزمرہ کے ناگزیر استعمال کی چیزیں ہیں اتنی گراں ہو چکی ہیں کہ لوگوں کے لیے اپنے محدود وسائل میں اپنی کم سے کم ضروریات کی تکمیل بھی سخت دشوار ہو گئی ہے ۔

پس منظر :

صوبائی گورنر کی ہدایت پر اس سے قبل گرانی کی روک تھام کے لیے مقامی حکام نے صارفین کی کمیٹیوں کا منصوبہ تیار کیا ، لیکن یہ منصوبہ عملی سے زیادہ نظریاتی ہونے کی بنا پر نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکا اور گرانی میں کمی ہونے کے بجائے اضافہ ہو گیا ۔ گوشت کے بارے میں فیصلہ ہوا تھا کہ قیمت پانچ روپے سے گھٹا کر کر ساڑھے چار کر دی جائے گی ، لیکن اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کا کوئی اہتمام نہ کیا گیا ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ صورت حال نہ صرف جوں کی توں رہی بلکہ گراں فروشوں کے حوصلے بڑھ گئے ۔

اب پھر گورنر مغربی پاکستان نے صوبے کے دورے کے بعد حالات کو بچشم خود دیکھ کر اور ہر جگہ قیمتوں میں اضافہ کے رجحان کا جائزہ لینے کے بعد صوبائی حکام کو ہدایت کی ہے کہ گرانی کی روک تھام کی جائے ۔ اس مسئلے پر ان کالموں میں بارہا اظہار خیال کیا جا چکا ہے اور گرانی کی روک تھام کے لیے مختلف تجاویز بھی پیش کی جاتی رہی ہیں ۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ متعلقہ حکام محض زبانی جمع خرچ سے کام چلانے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ عملاً اس سلسلے میں کوئی مؤثر اقدام نہیں کیا گیا ۔

یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ اگر گرانی کے رجحان کے خاتمے کا تہیہ کرکے ان عناصر کا سختی سے محاسبہ شروع کر دیا جائے جو ہر چند دن کے بعد کسی نہ کسی چیز کی قیمت چڑھ کر نفع اندوزی کی ہوس پوری کرتے ہیں تاکہ قیمتوں میں فوری طور پر کمی واقع نہ ہو - آخر اس امر کا جواز کیا پیش کیا جا سکتا ہے کہ رمضان المبارک کی آمد کے ساتھ ہی تمام اشیائے خوردنی کی قیمتوں میں اضافہ ایک حق کے طور پر کر دیا جاتا ہے - کیا اس مہینے میں ان اشیا کی لاگت بڑھ جاتی ہے یا ان کی بیرون ملک برآمد شروع ہو جاتی ہے - ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی صورت نہیں ہوتی ، بات صرف اتنی ہوتی ہے کہ ان دنوں میں اشیائے ضرورت کی مانگ اور کھپت بڑھ جاتی ہے اور نفع اندوز آڑھتی اور تاجر لوگوں کی اس ضرورت اور مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتے اور من مانی قیمتیں وصول کرنے لگتے ہیں -

فیصلہ - رائے :

گراں فروشی کی روک تھام درحقیقت انتظامیہ کی فرض شناسی اور مستعدی کی سب سے بڑی آزمائش اور کسوٹی ہوتی ہے - کیونکہ یہ کام اس وقت تک عملاً ہو نہیں سکتا جب تک کہ متعلقہ حکام اور پولیس گراں فروشوں کی کڑی نگرانی اور مسلسل احتساب نہ کرے - ملک میں اس وقت عوامی اضطراب کا ایک بہت بڑا سبب روز افزوں گرانی ہے جس کی وجہ سے اجرتوں میں اضافے کی ضرورت اور مطالبے جنم لیتے ہیں اور عام آدمی گوناگوں پریشانیوں اور الجھنوں میں مبتلا ہوتا ہے - اگر روزمرہ استعمال کی اشیا سستی اور حسب ضرورت فراہم ہوں تو بہت سے مسائل خود بخود ختم ہو جاتے ہیں - ہم صوبائی گورنر ایر مارشل نور خاں کو بھی اس صورت حال کی طرف توجہ دلائیں گے کہ وہ انتظامیہ کے

تساہل اور اہم ترین عوامی مسئلے سے تغافل کا سختی سے احتساب کریں ، ورنہ انتظامیہ کی سہل انگاری گراں فروشی کے رجحان کو تقویت پہنچاتی رہے گی اور عوامی مشکلات اور پریشانیاں ختم ہونے یا کم ہونے کے بجائے برابر بڑھتی ہی چلی جائیں گی ۔'' (کوہستان ۱۷ نومبر ۱۹۶۹ء)

بعض اداریے ایسے ہوتے ہیں جو مکمل طور پر وضاحتی ہوتے ہیں اور جن میں فیصلہ ، تجویز یا رائے پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی ، جیسے :

جدہ کانفرنس

واقعہ :

''جدہ میں مسلمان ممالک کے وزرائے خارجہ نے مستقل سیکرٹریٹ قائم کرکے اسلامی اتحاد کا سنگ بنیاد رکھ دیا ہے ۔

وضاحت :

اس فیصلے سے چونکہ چند اہم ملک متفق نہیں تھے ، اس لیے اب اصل کام یہ ہے کہ سیکرٹریٹ کی کارکردگی اور کردار کے بارے میں وہ تمام شکوک و شبہات دور کر دیے جائیں جو بعض مسلمان رہنماؤں کے دل میں موجود ہیں ۔ یہ محض ایک غلط فہمی ہے کہ اسلامی سیکرٹریٹ عرب لیگ یا کسی بھی دوسری علاقائی تنظیم کا حریف ہوگا ۔ نئے ادارے کی کامیابی کا انحصار ہی اس پر ہے کہ باہمی تعاون کے لیے راستہ ہموار کرنے اور اپنے عمل اور کردار سے عرب لیگ ، افریقی اتحاد کی تنظیم ، مغرب کے اقتصادی تعاون کی تنظیم اور علاقائی تعاون برائے ترقی کی تنظیم کا حلیف بنے ۔ اسلامی سیکرٹریٹ ان اداروں کی قوت کا وسیلہ بن سکتا ہے ۔ ان کی اجتماعی قوت اور صلاحیت کا باعث نہیں بن سکتا ۔ موخرالذکر صورت میں اس کی اپنی قوت اور افادیت کم ہو جائے گی

اور اس کے دائرۂ عمل میں خاطر خواہ توسیع نہ ہو سکے گی ۔ پاکستان کے وزیر قومی امور نواب زادہ شیر علی نے ، جو اسلامی سیکرٹریٹ کی تجویز کے پر جوش محرک تھے ، شروع میں ہی واضح کر دیا تھا کہ مجوزہ ادارہ اسلامی اخوت ، یگانگت اور مسلمان ممالک کے جذبۂ اتحاد اور روابط کا مظہر ہوگا اور اقتصادی ، سائنسی ، ثقافتی اور روحانی شعبوں میں تعاون کا ایک وسیلہ بنے گا ۔ اس وضاحت کے بعد شبہات کی گنجائش برائے نام رہ گئی اور کانفرنس میں شریک ممالک کی غالب اکثریت نے سیکرٹریٹ کے قیام کی تائید کر دی ۔ جو ملک اس میں شریک نہیں ہوئے ، ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ بھی اس ادارے کی سودمند نوعیت اور اس کے ذریعے مفید تعاون کے عملی ثبوت دیکھ کر اس میں شریک ہو جائیں گے ۔ ان کی شرکت اس ادارے کی کامیابی کی بہت بڑی ضمانت اور سب سے روشن دلیل ہوگی ۔ موجودہ شکل میں بھی اس فیصلے کی اہمیت غیر معمولی ہے ۔ اسلامی سیکرٹریٹ کا قیام ایسی تمام قوتوں کی بہت بڑی شکست ہے جو اسلامی اتحاد اور مسلمان ممالک کے درمیان تعاون سے سخت خائف ہیں ۔ وہ اس کا حوالہ بھی نہیں سن سکتیں ۔ ان کا خوف بجا ہے کیونکہ یہ اتحاد فطری طور پر حریت پرور اور آزادی کی تحریکوں کا طرف دار ہی ہو سکتا ہے اور ان حقوق و مفادات کی حفاظت کے کام آسکتا ہے جو بعض قوتیں غصب کیے بیٹھی ہیں یا غصب کر لینے کی فکر میں ہیں ۔ ان قوتوں میں ہندوستان کا نام سر فہرست ہے ۔ اس نے ایک اطلاع کے مطابق عرب ممالک کو ہراساں کرنے کے لیے ''بلیک میل'' کے سفارتی حربے بھی آزمائے ۔ اس واقعے سے بھی ہندوستان کا حقیقی کردار کھل کر سامنے آجاتا ہے !

اس وقت ''اسرائیل'' کی جارحیت اور اس کے توسیعی عزائم سارے عالم اسلام کے لیے بہت بڑا خطرہ ہیں ۔ جدہ کانفرس میں اس

خطرے کا جائزہ لیا گیا اور اس عزم کا اعادہ کیا گیا کہ فلسطینی عوام کے جہاد آزادی میں ہر طرح سے امداد کی جائے گی ۔ اس ضمن میں یہ فیصلہ نہایت اہم ہے کہ تمام مسلمان ممالک اپنے ہاں فلسطینی محاذ آزادی کو دفاتر قائم کرنے کی سہولت دیں اور سارے عالم اسلام میں اکیس اگست کو یوم فلسطین منایا جائے۔ اس معاملے میں پاکستان کی پالیسی واضح اور قطعی ہے ۔ ہم ان تمام اقوام کی تائید کرتے ہیں جو حق خود اختیاری حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہیں اور اپنے ان عرب بھائیوں کے ساتھ ہیں جنھیں اسرائیلی جارحیت کے باعث نقصان اٹھانا پڑا ۔"

(امروز ۔ ۲۹ مارچ ۱۹۷۰ء)

فرض کیجیے بھاری مشینری تیار کرنے کا کوئی کارخانہ کام شروع کرتا ہے یا فولاد کا کارخانہ تعمیر و تکمیل کے مراحل طے کر لیتا ہے تو اس موقع پر جو اداریہ لکھا جائے گا اس میں تجاویز و آرا پیش کرنے ، دلائل ڈھونڈنے یا فیصلہ دینے کی ضرورت نہیں ہو گی ، بلکہ ایسا اداریہ مکمل طور پر وضاحتی ہوگا جس میں اس کارخانے کے پس منظر ، اس کی تعمیر میں پیش آنے والی مشکلات اور اس کی تکمیل میں تاخیر کے اسباب کا ذکر کرنے کے بعد بتایا جائے گا کہ اس کارخانے کی صلاحیت پیداوار کیا ہے ، اس میں کس نسبت سے سرکاری ، عوامی اور غیر ملکی سرمایہ لگایا گیا ہے ، کتنے افراد کو روزگار مہیا ہوگا ، اس میں صرف ملکی ماہر کام کریں گے یا چند غیر ملکی ماہروں کی خدمات بھی حاصل کرنا پڑیں گی ، اس کے لیے خام مال کہاں سے آئے گا ۔ یہ کارخانہ ملکی ضروریات کس حد تک پورا کر سکے گا ، کیا اس کی مصنوعات برآمد بھی کی جاسکیں گی ، اس کے ذریعے کتنے زرمبادلہ کی بچت ہوگی ، اور اس میں کام شروع ہونے کے بعد ملکی معیشت کے کس شعبے کو کتنا فائدہ پہنچے گا اور بحیثیت مجموعی اس کا قیام کس قدر

مفید ثابت ہوگا۔

اس نوعیت کا پورا اداریہ وضاحت اور پس منظر بیان کرنے کے لیے وقف ہوتا ہے۔ اس کے برعکس بعض اداریے ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں حقائق بیان کرنے کے بعد وضاحت کی ضرورت نہیں ہوتی اور خبر یا واقعے کی نشاندہی کے فوراً بعد اس پر اظہار خیال شروع کر دیا جاتا ہے۔ جیسے:

''صرف انتباہ کافی نہیں

واقعے کا بیان:

صدر مملکت اور مارشل لاء کے ناظم اعلیٰ جنرل آغا محمد یحییٰ خاں نے قوم کے نام اپنی نشری تقریر میں اسلام کے بنیادی اصولوں اور پاکستان کی سالمیت و نظریے کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے

رائے — فیصلہ:

حب وطن اور قومی درد سے سرشار حلقوں میں ان کا یقیناً خیر مقدم کیا جائے گا۔ ہم ان کالموں میں اسلامی اصولوں اور پاکستان کے اساسی نظریات کے فروغ اور تحفظ کی ضرورت و اہمیت کا اکثر ذکر کرتے رہتے ہیں اور ابھی گزشتہ روز (۲۷ جولائی) ہم نے ارباب اقتدار و اختیار، محب وطن عناصر اور اسلام کی سربلندی کے لیے کام کرنے والی قوتوں کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کرائی تھی کہ اگر اللہ اور رسول کے نام پر معرض وجود میں آنے والے پاکستان میں زیر زمین کمیونسٹوں کو ادبی، ثقافتی، سیاسی صحافتی، معاشرتی الغرض ہر محاذ سے پاکستان کے اساسی نظریات۔ اسلام اور جمہوریت ـــ پر وار کرنے کی کھلی چھٹی دے دی گئی، لا دینی قوتوں کو اسی طرح تقویت حاصل ہوتی رہی تو پھر وہ منحوس دن دور نہیں جب پاکستان کو ایک اسلامی مملکت بنانے

کا خواب (خدا نخواستہ) پریشان ہو کر رہ جائے گا - یہ امر باعث اطمینان و مسرت ہے کہ ہماری نحیف و ناتواں آواز رائگاں نہیں گئی اور صدر مملکت نے ملت کے احساسات و جذبات کا احترام کرتے ہوئے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ:

''اگر کوئی فرد ، گروہ یا جماعت اسلام کے بنیادی اصولوں اور پاکستان کی سالمیت و نظریہ کی منافی کوئی بات پھیلائے گی یا ہمارے عوام کے اتحاد و استحکام میں رخنے ڈالنے کی کوشش کرے گی تو وہ عوام اور ان کی مسلح افواج کے غیظ و غضب کو دعوت دے گی - ہم ایسے عناصر کے خلاف مؤثر کارروائی کریں گے - اس سلسلے میں کسی قسم کی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے - - - - -

''پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے - اس کی اساس اسلام اور جمہوریت ہے - پاکستان میں اسلامی اصولوں اور نظریات پر جلی و خفی وار کرنے ، کمیونسٹوں ، ملحدوں اور لادینیت کے پجاریوں کو کھل کھیلنے کی ہرگز اجازت نہیں ہونی چاہیے - ان کا پوری سختی سے احتساب و مواخذہ ہونا چاہیے - اگر وہ پیکنگ اور ماسکو ہی کو اپنا قبلہ و کعبہ سمجھنے میں فخر محسوس کرتے ہیں تو پھر پاکستان میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں ہونی چاہیے - انہیں اپنی 'سرخ جنت' مبارک ہو - وہ بیچارے سیدھے سادے مسلمانوں کو اپنے حال پر ہی چھوڑ دیں - اس مرحلے پر ہم ارباب اقتدار سے بھی یہ گزارش ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ ڈھیٹ عناصر محض انتباہ سے راہ راست پر نہیں آ سکتے ، ان کا پوری سختی سے محاسبہ کرنا چاہیے اور اس وقت کا انتظار نہیں کرنا چاہیے کہ کھل کر پاکستان پر وار کریں تو ان کی بیخ کنی کی جائے - یہ کھل کر وار کرنے اور لڑنے کے عادی ہی نہیں ، نہ یہ مردان

میدان ہیں نہ ہی ان کی نشاندہی ضروری ہے۔ اب یہ ہر کوئی جانتا ہے کہ یہ عناصر کون ہیں اور کہاں کہاں ہیں۔"

کسی اداریے کا کتنا حصہ توضیح و توجیہ ، وضاحت یا دلائل کے لیے اور کتنا فیصلہ یا رائے کے اظہار کے لیے وقف ہونا چاہیے ، اس کا انحصار اداریے کی نوعیت پر ہوتا ہے۔ تاہم کوشش یہ ہونی چاہیے کہ وضاحت یا بحث سیر حاصل تو ہو مگر غیر ضروری نہ ہو اور رائے مختصر اور جچی تلی ہو۔

تجزیہ اور تبصرہ

بعض اداریوں میں واقعے کے بیان کے بعد وضاحت کی بجائے واقعے کا تجزیہ اور اس پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔ اداریہ نویس حقائق اور واقعات کا تجزیہ کرتا ہے اور ان کے حسن و قبح پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس مرحلے میں دلائل پیش کرنے یا کوئی فیصلہ دینے کی بجائے مکمل غیر جانبداری سے کام لے کر قارئین کے سامنے کسی خاص واقعے کے امکانی اسباب اور اس کے متوقع نتائج بیان کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ وضاحت کے حصے کی طرح تجزیہ و تبصرہ کے حصے کی طوالت کا انحصار بھی اداریے کی نوعیت اور اداریہ نویس کی اپنی فکر اور پالیسی پر ہوتا ہے۔ جن اداریوں میں صرف وضاحت مقصود ہوتی ہے ان میں تجزیہ و تبصرہ کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ کسی مسئلے کے تمام پہلو قارئین کو دکھانے اور ان میں اچھے اور برے کے درمیان تمیز کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کی غرض سے بعض اداریوں کو صرف تجزیہ و تبصرہ کے لیے وقف کر دیا جاتا ہے۔ ایسے اداریوں کو صرف حقائق کے بیان ، مسئلے کی وضاحت پس منظر پر روشنی ڈالنے اور تجزیہ و تبصرہ تک محدود رکھا جاتا ہے، اور اداریہ نویس ان میں سے کسی ایک مؤقف کی تائید و حمایت کے لیے نہ تو اپنے دلائل دیتا ہے نہ اپنا فیصلہ پیش کرتا ہے۔

جن اداریوں میں اداریہ نویس اپنے دلائل پیش کرنے کے علاوہ فیصلہ بھی دیتا ہے ان میں تجزیہ و تبصرہ کی زیادہ گنجائش نہیں ہوتی ، کیونکہ ایسے اداریوں میں کسی مسئلے کے تمام پہلو واضح کرنے کی بجائے اداریہ نویس صرف اپنے مؤقف پر زور دیتا ہے اور اسے حقائق پر روشنی ڈالنے اور ان کا تجزیہ کرنے کے بعد اپنی بات صحیح تسلیم کرانے کے لیے دلائل ، آرا اور فیصلہ بھی دینا ہوتا ہے ۔ اس لیے جن اداریوں میں اداریہ نویس کسی ایک نقطہ نظر کے حق میں فیصلہ دیتا ہے ان میں تجزیہ و تبصرہ کا حصہ بے حد مختصر ہوتا ہے ، اور بعض اوقات ہوتا ہی نہیں ، کیونکہ ایسے اداریے میں مسئلے کا پوسٹ مارٹم کرکے ہر بات واضح کر دینے کی بجائے اداریہ نویس بعض پہلوؤں کو پوشیدہ بھی رکھنا چاہتا ہے اور اپنے مؤقف کو صحیح ثابت کرنے کے لیے یک طرفہ دلائل پیش کرتا ہے ۔

دلائل

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے ، حقائق کے بیان اور ان کی وضاحت کے بعد اداریہ نویس حقائق کا تجزیہ کرتا ہے ، پھر اپنا مؤقف پیش کرتا ہے اور اس مؤقف کی صداقت کے ثبوت میں اسے دلائل پیش کرنا ہوتے ہیں ۔ اداریے کا یہ حصہ اداریہ نویس کی ذہنی و فکری صلاحیتوں کے لیے ایک آزمائش بن جاتا ہے ۔ اپنے دلائل کو مضبوط بنانے کے لیے اداریہ نویس مستند حقائق ، معتبر اعداد و شمار اور مسلمہ اصول و قواعد پیش کرتا ہے ۔ اداریے کی کامیابی اور اثر پذیری کا تمام انحصار اسی حصے پر ہوتا ہے ۔ اداریہ نویس اپنے ذہن و شعور سے کام لے کر اس حصہ میں جتنے پر زور دلائل پیش کرے گا اور اس کے یہ دلائل جتنے وزنی اور منطقی ہوں گے ، اداریہ اتنا ہی مؤثر بن جائے گا ۔ اگر اس مرحلے میں صحیح اور مناسب دلائل پیش نہیں کیے جائیں گے تو قارئین

اداریہ نویس کی کسی رائے اور تجویز کو قابل اعتماد نہیں سمجھیں گے اور اداریہ نویس کے اس فیصلے کو تسلیم نہیں کریں گے جو اس نے اداریے میں دیا ہوگا ۔

در اصل اداریے کا یہی مرحلہ ایسا ہوتا ہے جہاں اداریہ نویس اپنی تمام ذہانت اور قابلیت کو کام میں لاتا ہے ۔ اس کی صلاحیت ، دانش مندی اور قوت استدلال کی آزمائش صحیح معنوں میں اسی حصہ میں ہوتی ہے ۔ اداریے میں دلائل کے حصے کو کامیاب بنانے کا انحصار ادریہ نویس کی فطری اور اکتسابی صلاحیتوں اور محنت پر ہوتا ہے ۔ لیکن اس مرحلے میں منطق کے ان بنیادی اصولوں کو پیش نظر رکھنا اور ان کی پابندی کرنا بھی ضروری ہے جو فکر کی اساس ہیں اور ہمیشہ انسان کی رہنمائی کرتے ہیں ۔

اداریے میں دلائل کا حصہ اگرچہ دوسرے حصوں سے زیادہ طویل ہوتا ہے لیکن گنجائش محدود ہونے کی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ ہر بات کم سے کم الفاظ میں جچے تلے انداز سے کی جائے ۔ صرف ٹھوس اور مؤثر دلائل پش کیے جائیں ۔ بے معنی مثالوں اور غیر ضروری قصے کہانیوں سے مکمل گریز کیا جائے ۔ اگر اداریے میں کسی مسئلے کی وضاحت اور اس کا پس منظر بیان کرنا مقصود ہو تو اس میں دلائل کا حصہ نہیں ہوتا ۔

نتیجہ اور فیصلہ

اگر کوئی فیصلہ سنا کر یا نتیجہ اخذ کرکے اداریہ شروع کیا جائے تو اس سے تحریر بے اثر ہو جاتی ہے ، کیونکہ فیصلہ دے دینے کے بعد مزید بحث کے دروازے بند ہو جاتے ہیں ۔ اگر شروع میں کسی مسئلے پر فیصلہ دے دیا جائے تو قاری کو اداریہ نویس کے انداز فکر کا علم ہو جاتا ہے اور اس کی تحریر کے مطالعے پر مزید وقت صرف کرنا بے معنی ہو جاتا ہے ۔ لیکں اداریے کی جو

ہیئت اوپر بیان کی گئی ہے اس کے مطابق ہر بات ترتیب اور سلیقے
سے کی جائے تو قاری اداریہ نویس کے ساتھ چلنے اور اس کے پیش
کیے ہوئے دلائل کا اثر قبول کرنے کے لیے خوشی سے تیار ہو جاتا
ہے ۔ اگر اداریے میں ٹھوس حقائق اور معقول دلائل پیش کیے گئے
ہوں تو قاری ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد خود بخود اس نتیجے
پر پہنچ جائے گا جہاں اداریہ نویس اسے پہنچانا چاہتا ہے ۔
اس طرح اداریے کے آخر میں اداریہ نویس کی طرف سے کوئی فیصلہ
دینا صرف رسمی سی بات ہو جائے گی کیونکہ یہ فیصلہ اس سے پہلے
قاری خود کر چکا ہوگا ۔ لیکن اداریہ نویس کی طرف سے فیصلے
اور نتیجے کے واضح اعلان کا یہ فائدہ ہوگا کہ اس کے بعد قاری
کے اپنے فیصلے کی تصدیق ہو جائے گی اور وہ اس کے دل میں پوری
طرح گھر کر لے گا ۔ وہ اداریہ نویس کی آواز کو اپنی آواز اور
اپنی آواز کو اداریہ نویس کی آواز سمجھے گا ۔ ہم آہنگی کا یہ
احساس اخبار سے قارئین کی وابستگی میں اضافہ کر دیتا ہے ۔

اداریے کے ابتدائی حصوں میں اگر مدلل اور مؤثر باتیں نہ
کہی جائیں تو قارئین پر اداریے کے آخری حصے کا اثر اداریہ نویس
کی خواہش کے برعکس بھی ہو سکتا ہے ۔ اداریہ نویس کی رائے
سے متاثر ہونے اور اس کے نقطہ' نظر کی حمایت کرنے کی بجائے اس
میں ایک طرح کی مزاحمت پیدا ہو جائے گی اور اس کے دل میں
لامحالہ یہ خیال پیدا ہو گا کہ کسی صلاحیت اور قابلیت کے بغیر
ہی اداریہ نویس نے اس کا فکری رہنما اور منصف بننے کی کوشش
کی تھی ۔

اداریے کا آخری حصہ جس میں فیصلہ یا نتیجہ بیان کیا جاتا ہے ،
بہت مختصر ہوتا ہے۔ اس کے خوب یا ناخوب ہونے کا انحصار اداریہ
کے ابتدائی حصوں پر ہوتا ہے ۔ لیکن اس مرحلے پر بھی اداریہ
نویس کو یہ خیال رکھنا چاہیے کہ آخر میں وہ بہت جچے تلے

انداز میں تمام بحث کا ماحصل اور اپنا واضح فیصلہ پیش کرے ۔ اداریے کے اس حصے کے لیے الفاظ کا انتخاب بہت موزوں اور دلنشیں ہونا چاہیے تا کہ قاری کسی تامل کے بغیر یقین کر لے کہ اداریہ نویس سو فیصد صحیح نتیجے پر پہنچا ہے اور اس سے اتفاق رائے کے سوا کوئی چارہ نہیں ۔

سوالات

۱ ۔ اداریے کی ہیئت کیا ہوتی ہے اور وہ کتنے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ؟

۲ ۔ اداریے کا آغاز کیسے ہوتا ہے ، اس کے پہلے حصے میں کون سی باتیں پیش کی جاتی ہیں ؟

۳ ۔ اداریے میں دلائل کے حصے کی اہمیت واضح کیجیے ؟

۴ ۔ وضاحت ، تجزیہ اور تبصرہ کا حصہ اداریے میں کس شکل میں پیش کیا جاتا ہے ؛ اس حصے کو اداریے میں کیا اہمیت حاصل ہوتی ہے ؟

۵ ۔ اداریے کا اختتام عام طور پر کیسے ہوتا ہے ، استدلالی قسم کے اداریوں کے آخر میں کون سی باتیں کس صورت میں پیش کی جاتی ہیں ؟

دوسرا حصہ

اردو اداریے کا ارتقا

پہلا دور

برصغیر پاک و ہند میں اردو اخبارات کا اجرا کسی فطری عمل کی بجائے خاص حالات کا مرہون منت تھا ۔ 'ایسٹ انڈیا کمپنی' فارسی کی بجائے اردو رائج کرنا چاہتی تھی ، اس لیے نہیں کہ اسے اردو سے محبت تھی ، بلکہ اس لیے کہ وہ فارسی کو مغلوں کے اقتدار کی نشانی اور برصغیر میں مسلمانوں کے تمدن اور علم و ادب کی علامت سمجھ کر ختم کرنا چاہتی تھی ۔ چنانچہ اردو کا پہلا ہفت روزہ اخبار "جام جہاں نما" ۱۸۲۳ء میں کلکتہ سے کمپنی ہی کی سرپرستی میں جاری ہوا ۔[1] مگر یہ اخبار ۲۳ جنوری ۱۸۲۸ء کو اس لیے بند ہو گیا کہ : "قدر شناس (یعنی انگریز) جن کی لطف گستری سے اس کاغذ نے رونق اور شہرت پائی ، اردو عبارت سے ذوق نہیں رکھتے ، اور اہل ہند جن کی زبان (اردو) ہے ، وے فارسی تحریر چاہتے ہیں[2] ۔" ایسٹ انڈیا کمپنی نے مقامی باشندوں کو "فارسی تحریر چاہنے" کی روش سے ہٹانے کے لیے ۱۸۳۰ء میں فارسی کی جگہ اردو کو سرکاری زبان قرار دے دیا ۔ پھر ۱۸۳۵ء میں چارلس مٹکاف نے اخبارات پر عائد پابندیاں نرم کر دیں ۔ اس کے بعد مقامی زبانوں میں جگہ جگہ

سے اخبارات نکلنے لگے ۔ چنانچہ کلکتے کی بجائے اردو کے اہم مرکز دہلی سے بھی اردو اخبارات جاری ہونے لگے ۔

۱۸۳۶ء میں مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے ''دہلی اخبار'' نکلا ۔ ۳ مئی ۱۹۴۰ء کو اس اخبار کا نام ''دہلی اردو اخبار'' رکھ دیا گیا ۔ ۱۸۳۷ء میں سر سید احمد خاں کے بھائی سید محمد خاں نے ''سیدالاخبار'' جاری کیا ۔ اسی سال ''خیرخواہ ہند'' کا اجرا ہوا ۔ ۱۸۴۳ء میں مولوی محمد باقر نے ایک اور اخبار ''مظہرالحق'' جاری کیا ۔ ۱۸۴۵ء میں مولوی کریم الدین نے ''کریم الاخبار'' نکلا ۔ اسی سال ''فوائد الناظرین'' اور ''قرآن السعدین'' وغیرہ منظر عام پر آئے ۔ دہلی ہی سے 'نور مشرق' اور 'نور مغربی' اور ''صادق الاخبار'' نام کے دو تین اخبار جاری ہوئے ۔ ۱۸۵۰ء میں لاہور سے ''کوہ نور'' کا اجرا ہوا ، اور ''کوہ نور'' کی تقلید میں لاہور سے ''دریائے نور'' اور ''لاہور گزٹ'' وغیرہ جاری ہوئے ۔ رفتہ رفتہ ملک کے تمام بڑے اور اہم شہروں سے اردو اخبارات جاری ہو گئے ۔

اردو اخبارات کی کامیابی کا راستہ ہموار ہوا ہی تھا کہ ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی شروع ہو گئی ۔ اس جنگ کی ناکامی مسلمانوں کے لیے بالخصوص تباہ کن ثابت ہوئی اور اس سے اردو صحافت کو بھی خاص زک پہنچی ۔ نٹراجن کے الفاظ میں : ''جنگ آزادی کے دوران میں اردو صحافت عملی طور پر ختم ہو گئی[۳] ۔'' ۱۸۵۳ء میں اردو زبان کے اخبارات کی تعداد ۳۵ تھی ، ۱۸۵۸ء کی فہرست میں صرف بارہ اخبارات رہ گئے ۔ ان میں سے چھ پہلے کے اخبار تھے اور چھ نئے ۔ بارہ اخباروں میں صرف ایک اخبار کی ادارت ایک مسلمان کے سپرد تھی[۳] ۔'' گویا ۱۸۵۷ء میں جو چھ اردو اخبارات بند ہونے سے بچ گئے وہ بھی ہندوؤں کے زیر انتظام

تھے اور حکومت کے حامی تھے ۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کو اردو صحافت کا پہلا دور ختم ہو گیا ہے ۔

ابتدائی اداریہ نویسی

پہلا اردو اخبار $\frac{20\times 30}{8}$ کے چار صفحات پر شائع ہوتا تھا ۔ اس میں کچھ خبریں اور انگریزی یا فارسی سے ترجمہ شدہ مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس میں نہ تو علیحدہ طور پر اداریہ چھپتا تھا اور نہ خبروں یا مضامین میں واضح ادارتی رائے موجود ہوتی تھی ، البتہ بعض خبروں میں ایڈیٹر یا خبر نویس اپنی رائے یا تاثرات شامل کر دیتا تھا ، مثلاً :

''اخبار کے کاغذ میں دیکھا گیا کہ برہان پور کے ملک میں دکن کے علاقے میں ایک برہمن رہتا تھا ۔ اتفاق سے وہ ایک دن کسی کام کے واسطے ایک جنگل میں جا نکلا ۔ اس کو اکیلا دیکھ کر ایک باگھ کئی دن کا بھوکا جو اپنی تھل میں پڑا ہوا تھا ، یک بارگی بجلی کی طرح تڑپ کر اس دکھیا برہمن پر گرا ۔ حقیقت میں چنڈال غریب برہمن کے خون کا پیاسا تھا اپنا کام کر گیا ۔ یہ خبر برہمن کے گھر پہنچی تو لوگ لاش کو جنگل سے اٹھا لائے ۔ اس کی بڈھی جورو نے بہتر برس کی عمر میں کہ ہاتھ پاؤں ہلانے کی طاقت نہیں ، کیا ہی مردانہ کام کیا کہ اپنے شوہر کی لاش کے ساتھ جل کر راکھ ہو گئی [۵] ۔''

اس خبر میں دو جملے (۱) حقیقت میں چنڈال غریب برہمن کے خون کا پیاسا تھا ، (۲) کیا ہی مردانہ کام کیا ۔ ایسے ہیں جو تبصرے یا رائے کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن یہ ادارتی رائے یا تبصرے کے زمرے میں نہیں آتے ۔

واضح صورتیں

'جام جہاں نما' کے بعد جاری ہونے والے اخبارات میں خبروں میں اداریٔ آرا یا تبصرے واضح صورت میں ملتے ہیں ۔ مثلاً :

''سنا گیا کہ ان دنوں گزر قاسم خاں میں مرزا نوشہ کے مکان سے اکثر نامی قمار باز پکڑے گئے ۔ مثل ہاشم خاں وغیرہ کے جو سابق بڑی علتوں میں دورہ تک سپرد ہوئے تھے، بڑا قمار ہوتا تھا ، لیکن بہ سبب رعب و کثرت یا کسی طرح سے کوئی تھانیدار دست انداز نہیں ہو سکتا تھا ۔ اب تھوڑے دن ہوئے یہ تھانیدار قوم سے سید اور بہت جری سنا جاتا ہے، مقرر ہوا ہے یہ مرزا نوشہ ایک شاعر نامی رئیس زادہ نواب شمس الدین قاتل ولیم فریزر کے قرابت قریبہ میں سے ہے ۔ یقین ہے کہ تھانیدار کے پاس بہت رئیسوں کی سعی و سفارش بھی آئی ہوگی ۔ لیکن اس نے دیانت کو کام فرمایا ۔ سب کو گرفتار کیا ، عدالت سے جرمانہ عالی قدر مراتب ہوا ۔ مرزا نوشہ پر سو روپے ، نہ ادا کریں تو چار مہینہ قید ۔ لیکن ان تھانیدار کی خدا خیر کرے دیانت کو تو کام فرمایا لیکن اس علاقے میں بہت رشتہ دار متمول اس رئیس کے ہیں ، کچھ تعجب نہیں کہ وقت بے وقت چوٹ پھوٹ کریں اور یہ دیانت ان کی وبال جان ہو ۔ حکام ایسے تھانیدار کو چاہیے کہ بہت عزیز رکھیں ۔ ایسا آدمی کم یاب ہوتا ہے[6] ۔''

خبر خاص دہلی

''گیارھویں تاریخ جنوری ۱۸۴۹ء کو شہزادہ دارا بخت بہادر ولیعہد سلطنت ہند نے اس جہان ناپائدار سے طرف عالم بقا کے نقارہ کوچ کا بجایا ، اور چراغ دہلی میں دفن کیے گئے ۔ شہنشاہ کو ان کے مرنے کا بہت غم و الم ہوا ۔ اب دیکھنا چاہیے ولیعہد کون ہوتا ہے ۔ سنتے ہیں یا تو مرزا

فخرالدین حسین بہادر یا مرزا جواں بخت بہادر ولیعہد ہوں گے - یقین ہے سرکار دولت مدار انگریزی ولیعہد ہونے میں کسی کے مانع نہ ہوں گے - واسطے کہ سرکار ابد پائیدار کمپنی بہادر کے ذریعہ سے سینکڑوں راجہ و راؤ و نواب وغیرہ مسند حکومت پر بیٹھے چین و آرام کرتے ہیں ، اور چونکہ خاندان تیمور بڑا نامور خاندان ہے تو اس خاندان کی بھی بدستور توقیر رہے گی۷ -'' (فوائد الناظرین دہلی ۱۸۴۹ء)

''کشمیر جنت نظیر

کشمیر میں بارش بہت ہوئی اور جاڑے کی نہایت شدت ہے - اور تاک فضل الٰہی سے بہت افراط ہے اور غلہ بھی بہ نسبت لاہور کی (کے) بہت ارزاں ہے - مگر شال باف وہاں کی گرانی محصول سے نالاں ؛ اور ایک اخبار انگریزی میں دیکھا گیا کہ مہاراجہ صاحب والیٔ ریاست محصول سابق سے دونا لیتے ہیں اور مال کو نصف قیمت پر خرید کر دور دور ملکوں میں بطور سوداگری کی (کے) بھیجتے ہیں اور جنس چاول کو بھی علیٰ ہذا القیاس - جب شال باف وہاں کے کچھ نالاں ہوئی (ہوئے) تو مہاراجہ نے ان کو سمجھایا اگر تم سیدھی طرح سے نہ مانو گی (گے) تو ہم لاٹ صاحب سے کہہ کر ایک کلکٹر انگریزی تم پر تعین کرا دیں گے تاکہ وہ انتظام تمہارا بخوبی کرے گا۸ -''

(ہفت روزہ کوہ نور ۱۸۵۰ء)

جرأت و بیباکی

اگرچہ جنگ آزادی کا آغاز مئی ۱۸۵۷ء میں میرٹھ سے ہوا تھا مگر اس طوفان کے اثرات بہت پہلے نظر آنے لگے تھے اور بعض اردو اخبارات جرأت کے ساتھ ان آثار کی نشاندہی کر رہے

تھے - یہ نشاندہی 'اداریوں' میں علیحدہ سے نہیں ہوتی تھی بلکہ خبریں ہی اس انداز سے دی جاتی تھیں کہ ان میں اظہار رائے غالب ہوتا تھا بعض خبریں تو کم و بیش اداریہ ہی معلوم ہوتی تھیں - مثلاً :

''لکھنؤ

لکھنؤ میں سنیچر آیا ہے ، چوروں نے ہنگامہ مچایا ہے ، جو سانحہ ہے عجائب ہے - آنکھ جھپکی پگڑی غائب ہے

میر صاحب زمانہ نازک ہے
دونوں ہاتھوں سے تھام لو دستار

جس دن سے سلطنت نہ رہی شہر بگڑا ، چوروں کی بن آئی ، کسی حالت میں نہ رہی - اس اندھیر پر ایک مثل یاد آئی کہ اندھے کی جورو کا خدا رکھوالا ہے - اس شہر میں اندھا دھندی ہے - - - اس نابینائی پر یہ حکومت اندھیر ہے ، صاف اندھے کے ہاتھ میں بٹیر ہے - روزانہ باتیں عجائب ہوتی ہیں - سوجھتا تو خاک نہیں ، ٹٹول ٹٹول کر چھڑیاں غائب ہوتی ہیں -''
(طلسم لکھنؤ - جنوری ۱۸۵۷ء)

''دربار ایران

تازہ بمبئی پیپر و صدورہ دفتر 'صادق الاخبار' سے منکشف ہوا کہ ایک روز شاہ ایران نے چند سرداران ہراتی اور کئی اراکین سلطنت کو دربار میں طلب کرکے در باب جنگ مشورت کی اور بعد غور و تامل ہر ایک نے یہی صلاح دی کہ آپ گورنمنٹ انگریزی سے لڑیے انشاءاللہ فتح پائیے گا ، کس لیے کہ ہرات آپ نے نہیں تسخیر کی بلکہ دروازۂ ہند پر جا پہنچے ، اور علاوہ بریں مرضی شاہ روس کی بھی یہی ہے کہ انگریزوں سے آپ لڑیں اور ہندوستان پر قبضہ کر لیں -

شاہ نے یہ کلام سن کر تسمیہ کہا کہ میں تم سے بہت خوش ہوں کہ برخلاف وزیر نمک حرام کے صلاح دیتے ہو۹ ۔ ''

(صادق الاخبار ۱۸۵۷ء)

حکومت اور حالات پر تنقید میں فارسی اخبارات اردو اخبارات سے بڑی آگے تھے ۔ چنانچہ جنگ آزادی شروع ہوتے ہی انگریزی اخبارات نے مطالبہ کیا کہ دیسی اخبارات کی اشاعت بند کر دی جائے ۔ مثلاً آگرے کے ہفت روزہ اخبار the mofussalite نے مارچ ۱۸۵۷ء میں دیسی اخباروں پر سنسر عائد کرنے کا مطالبہ کیا اور لاہور کے ''دی پنجابی'' نے ۲۸ مارچ ۱۸۵۷ء کے شمارے میں لکھا : ''ہماری توجہ لکھنؤ کے ایک ایسے دیسی اخبار کی طرف دلائی گئی ہے جو ہماری فوج میں پڑھا جاتا ہے اور اس نے بیرک پور کے ہنگاموں کی خبریں اس انداز سے پیش کی ہیں جس سے شرارت کا امکان ہے ۔'' اسی طرح بنگال کے روزنامہ ''بنگال ہرکارو'' نے اپریل ۱۸۵۷ء میں دیسی اخبارات پر پابندیاں لگانے کا مطالبہ کیا اور لکھا : ''بنگال ، بمبئی اور مدراس کے دیسی سپاہیوں میں ان کا بڑا اثر ہے ۔'' اردو اخبارات کی جس جرأت و بیباکی کو انگریزی اخبارات شرارت اور سرکشی گردانتے تھے اس کی مثالیں ملاحظہ ہوں :

''کول

سنا گیا ہے کہ چار کمپنیاں کول کی بھی انگریزوں کا منہ کالا کر کے حضور سلطانی میں آ حاضر ہوئیں ۔ یعنی جو انگریز پایا اسے موت کے گھر پہنچایا اور خزانہ خوب لٹایا ۔ تمام رعایا نے وہاں کی خوب لوٹا اور جو جس نے پایا خوب کمایا ۔ جس پلٹن کی سپاہ ہے اس پلٹن کا نام بہ جالیسر منسوب ہے باقی سپاہی بھی قریب انشاءاللہ آنے کو ہیں ''

''کانپور

کانپور کا حال بھی مثل سب جگہ کے سنا گیا ؛ جہاں انگریز پایا جاتا ہے ، مارا جاتا ہے[۱۰]۔''   (دہلی اردو اخبار)

اور

''۔۔۔ کہتے ہیں کہ اول چند سوار آئے اور دریا گنج کے انگریزوں کو مارتے ہوئے اور دو بنگلہ جلاتے ہوئے پیش اسپتال زیر قلعہ آئے اور چمن لال ڈاکٹر کو بھی دارالشفائے اصلی میں پہنچا دیا کہتے ہیں کہ بڑے صاحب و قلعہ دار و ڈاکٹر وغیرہ چند انگریز کلکتہ دروازے پر کھڑے ہوئے دوربین لگائے سڑک میرٹھ کا حال دریافت کر رہے تھے کہ دو سوار آئے۔ اس میں سے ایک نے تپنچہ اپنا جھاڑا اور ایک انگریز کو مار گرایا اور باقی جو بچ کر حسب تحریر مذکورالصدور دروازہ قلعہ میں آکر مارے گئے اور پھر اور سوار بھی آ پہنچے اور شہر میں غل ہو گیا کہ فلاں انگریز وہاں مارا گیا فلاں انگریز وہاں پڑا ہے۔

۔۔۔ اخبار کو معلوم ہوا ہے کہ پچیس تیس انگریز معہ زن و بچہ جو اندر بند تھے ان کو مارنے کو غازیان پلٹن سیڑھی وغیرہ کے وسیلے سے دیوار میگزین پر جانب فصیل شہر سے چڑھے۔ اندر سے محصورین نے بھی انھیں گولیاں ماریں اور اس اثنا میں دو فیر گراب کے شست باندھ کے محصورین نے مارے۔ مگر چونکہ افسر لوگ بجز قواعد و ضوابط مشاق و آزمودہ کار نہیں ہوتے لہذا ان سے کچھ چنداں کام نہ نکلا۔۔۔ سنا گیا ہے کہ ٹیلر صاحب پرنسپل مدرسہ بھی یہیں بند تھے۔ اس دن تک آب و دانہ باقی تھا ، اور کوئی دن دنیا کی ہوا کھانی تھی کہ دوسرے دن یوم سہ شنبہ قریب دوپہر اسی تھانے کے علاقے میں مارے گئے۔ یہ شخص مذہب عیسوی میں نہایت متعصب تھا اور اکثر ناواقف

لوگوں کو اغوا کیا کرتا تھا - چنانچہ ڈاکٹر چمن لال کا خون اسی کی گردن پر رہا ۔ عجیب شان ایزدی ہے کہ یہ شخص نہایت مالدار تھا ۔ قریب دو لاکھ کے روپیہ اس کا بنک کلکتہ و دہلی میں جمع تھا ، اور چند بنگلہ وغیرہ کرایہ کثیر کے چھاؤنی میں ۔ اور یہ روپیہ اس قدر سعی و کوشش سے جمع کیا تھا کہ صرف ڈیڑھ آنہ یا چار پیسے روز اپنی ذات کے صرف طعام میں لاتے تھے اور باقی سب داخل بنک ۔ دن رات میں جو وقت فرصت ہوتا اسے حساب کتاب زر بنک میں صرف کرتے تھے ۔ کپڑے بھی صرف ضرورتاً قابل جلسہ اہل جلسہ کے پہنتے تھے ۔ لیکن قابل عبرت ہے حال دنیائے دوں کا کہ باوجود اس زر کثیر کے دن بھر لاشہ برہنہ خاک و خون میں غلطاں پڑا رہا - دیکھنے والے کہتے تھے کہ فقیری لباس اس وقت تھا اور منہ پر خاک ملی ہوئی تھی[۱۱]''

''خبر دہلی

ہے دنیا عجب جائے ناپائدار
نہیں یاں کسی کو ہے اصلا قرار

دیکھو قدرت ، انگریزی قوم کی کہ جب خدا تعالیٰ نے اقبال ان کو عطا کیا تھا تو پورب سے پچھم و اتر وغیرہ ملک دور دور کے لڑے بھڑے ہاتھ لگ گئے۔ جس طرف علم جنگ اٹھایا وہاں کے راجہ بابو بادشاہ مارے ہیبت کے خواہان صلح ہوئے ۔ کسی نے مقابلہ نہ کیا ، اور اگر کیا بھی تو انھوں نے گھنٹہ ڈیڑھ پانچ چار گولیاں سیل کے چھوڑ کر اس مقام کو فتح کر لیا ۔ اور یہ بات گمان میں بھی نہ آتی تھی کہ ان سے کوئی لشکر غالب آئے گا اور عملداری انگریزی مدتوں کی پل بھر میں جاتی رہے گی ۔ بلکہ اب تو جو خیرخواہ نصاریٰ ہیں بہ نظر ظاہر ان کو گیا گزرا نہیں سمجھتے سو سارا باعث اس کا یہ معلوم دیتا ہے کہ ان کی کسی تواریخ

پر نظر نہیں ورنہ گردش فلکی کا حال معلوم ہے۔ ہمیشہ زمانہ کسی کا یکساں نہیں رہتا ؛ جو ہست ہے وہ نیست بھی ہے۔ اور یہ تو خداوند تعالیٰ کی ہندوستانیوں پر عنایت ہے کہ ان کو انہیں کی فوج سے غارت کرایا نہیں تو دیکھتے کہ ان کی بدنیتی اہل ہند کو کیا کیا مزے دکھاتی۔ اور یہ ہی بارہا ہوا ہے کہ فوج نے جس کو چاہا بادشاہ بنا دیا۔ انگریز کو یہاں کس نے بلایا تھا اور کس خاندان سے اختیار حکومت ملا ؟ گو اس عرصے میں وہ قوی ہو گئے تھے اور کسی کو خیال میں نہ لاتے تھے مگر خدا تعالیٰ تو قادر و توانا اور منصف ہے۔ گورے ہزاروں سب اطراف سے کھنچ کر آئے۔ فرنگیوں نے لاکھ تدبیر تسخیر دہلی کی مگر نہ گوروں کی شجاعت یہاں کام آئی اور نہ تقدیر کے آگے کچھ تدبیر پیش گئی۔ جہاں یہاں وہ کفار گاجر کی طرح کاٹے اور ہر ایک کھیت پر مولی کی طرح چھانٹے گئے۔ باقی جو قدرے قلیل میدان علی پور میں ہیں ان کو بھی عنقریب سن لیں گے کہ جاروب قہر الٰہی سے خس کم جہاں پاک ہوئے اور شاہ گیتی پناہ کا تسلط تمام ہندوستان پر ہو گیا[۱۲]۔'' (صادق الاخبار)

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی شروع ہوئی تو گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے اخبارات کی آزادی سلب کرنے کے لیے ایک نیا قانون نافذ کیا جو عرف عام میں (Gagging Act) گلا گھونٹنے والا قانون کہلاتا ہے۔ گورنر جنرل نے اس سلسلے میں ۱۳ جون ۱۸۵۷ء کو کہا تھا :

''اس بات کو لوگ نہ تو جانتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں کہ گزشتہ چند ہفتوں میں دیسی اخباروں نے خبریں شائع کرنے کی آڑ میں ہندوستانی باشندوں کے دلوں میں دلیرانہ حد تک بغاوت کے جذبات پیدا کر دیے ہیں۔ یہ کام بڑی مستعدی ، چالاکی اور عیاری کے ساتھ انجام دیا گیا ہے[۱۳]۔''

Gagging Act انگریزی اور دیسی دونوں قسم کے اخبارات کے لیے تھا ؛ اس پر انگریزی اخباروں نے احتجاج کیا اور اس قانون کا اطلاق صرف دیسی اخباروں تک محدود کرنے کا مطالبہ کیا انگریزی اخبارات کی دلیل یہ تھی کہ دیسی اخبارات غیر ذمہ دار ہیں - لاہور کرانیکل نے ۱۱ جولائی ۱۸۵۷ء کو لکھا کہ :

''دیسی اخبار سازش اور بغاوت میں مصروف ہیں لیکن یہ دلیل ناقص ہے کہ دیسی صحافت یا اس کے ایک جزو کی بغاوت پر اینگلو انڈین صحافت کو بھی قانون کی زنجیروں میں جکڑ لیا جائے۔'' جنگ آزادی کے دور میں کئی دیسی اخبارات بند کر دیے گئے -

اس دور کے اخبارات میں حسب ذیل خصوصیات ہوتی تھیں :

۱ - ابتدائی اردو اخبارات عموماً ہفت روزہ اور پندرہ روز ہوتے تھے - ان کا سائز چھوٹا اور صفحات عموماً چار ہوتے تھے - صفحہ اول پر اخبار کے نام کی تختی کے نیچے عموماً منظوم اشتہارات چھپتے تھے جن میں متعلقہ اخبار کی تعریف اور کوائف بیان کیے جاتے تھے - بعض اخبارات میں اشتہارات نثر میں چھپتے تھے - ان اخباروں کے مندرجات خبروں ، مضامین یا نظموں اور غزلوں تک محدود ہوتے تھے - ان مندرجات کے لیے الگ الگ صفحات مخصوص نہیں ہوتے تھے - خبر یا مضمون کے شروع میں مختصر اور سپاٹ سی سرخی دے دی جاتی تھی ، مثلاً لاہور کی خبر، ـــــــ وغیرہ سرخی کے نیچے سارا مواد ذیلی سرخیوں کے بغیر مسلسل چھاپا جاتا تھا - بعض اوقات پیراگراف بھی نہیں بنائے جاتے تھے -

۲ - ابتدائی اخبارات میں اداریے باقاعدہ یا علیحدہ نہیں چھپتے تھے البتہ مدیر یا خبر نویس جہاں مناسب اور ضروری سمجھتا خبر کے اندر یا آخر میں اپنی رائے دے دیتا - یہ رائے خبر

کا ایک حصہ ہوتی تھی ، شعوری رائے یا تبصرہ نہیں ہوتا تھا ۔ اس زمانے میں خبر نویسی کا انداز ہی یہی تھا یعنی خبر نویس خبر میں معروضیت پیش نظر رکھنے کے بجائے اہم واقعے کو اپنے تاثرات اور محسوسات سمیت تحریر کرتا تھا ۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کے الفاظ میں :

''صحافت کے ابتدائی دور میں اداریے باقاعدگی سے نہیں چھپتے تھے ۔ انگریزی اخباروں میں اداریے مضامین کی صورت میں بے ترتیبی سے خبروں کے درمیان چھاپ دیے جاتے تھے۔ فارسی اور اردو اخبارات میں یہ رواج تھا کہ جہاں کوئی ایسی خبر درج ہوئی جس پر تبصرہ ضروری نظر آیا وہیں خبر کے نیچے چند سطروں میں تبصرہ کردیا[۱۳]'' مگر کے سجن لال نے 'اردو اخبارات کی مختصر تاریخ' میں لکھا ہے کہ بعض اخبارات میں ادارتی تبصرہ ، تنقید اور گزشتہ برس کے واقعات کا جائزہ وغیرہ چھپتے تھے جیسے اخبارالحقائق اور عمدۃالاخبار میں ۔ مگر اس رائے سے بھی اس دور کے کسی اخبار میں اداریہ کے واضح اور الگ طور پر شائع کی نشاندہی نہیں ہوتی ۔

۳ ۔ ابتدائی اخبارات میں خبروں یا مضامین میں جو ادارتی آرا شامل ہوتی تھیں وہ بہت مختصر اور عموماً غیر مربوط ہوتی تھیں ۔ بعض اوقات یہ رائے ایک دو جملوں تک محدود ہوتی تھی مگر بعض صورتوں میں مفصل بھی ہوتی تھی ، یہ رائے عموماً منتشر اور غیر مربوط ہوتی تھی ۔ کیونکہ خبر نویس یا مضمون نگار ایک جگہ اپنی رائے ظاہر کرنے کی بجائے جگہ جگہ تبصرہ کی صورت میں ظاہر کرتا تھا ۔

۴ ۔ خبر نویس خبر لکھتے وقت کرداروں ، اشیا ، مقامات کا ذکر کرتے وقت مرکب توصیفی بکثرت استعمال کرتا تھا اور ان مرکبات کا استعمال ایک اعتبار سے خبر نویس کی رائے یا تبصرے

کا درجہ رکھتا تھا ۔

۵ ۔ جنگ آزادی سے قبل ہی حالات کے تحت کئی اردو اخبارات کا لب و لہجہ سخت ہو گیا تھا ۔ جنگ سے قبل اور جنگ کے دوران میں اردو اخباروں میں ''دہلی اردو اخبار'' اور ''صادق‌الاخبار'' نے انگریزوں پر سخت تنقید کی اور جنگ میں حصہ لینے والوں کا جوش و جذبہ بڑھایا ۔

۶ ۔ اداریوں کی ابتدائی صورتوں میں فنی امور کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا یعنی اس وقت اداریے کو ایک باقاعدہ ہیئت میں لکھنے اور زبان و بیان کے اصولوں کو پیش نظر رکھنے کا تصور موجود نہیں تھا ۔ اداریوں بلکہ اخبارات کے تمام مندرجات کی زبان اس دور کی مروجہ ادبی و علمی زبان سے مختلف نہیں ہوتی تھی ۔

دوسرا دور

جنگ آزادی ناکام ہوئی تو انگریزی اخبارات 'انتقام' انتقام' پکارنے لگے ۔ مارگریٹا بارنز کے الفاظ میں :

''اینگلو انڈین اخبارات کا لب و لہجہ انتہائی خوفناک تھا ۔ انگریزوں اور عیسائیوں کی طرف سے 'خونریزی اور غارت گری کا پر زور مطالبہ کیا گیا ۔ ہیبرٹ (Hebert) اور مارات (Marat) کے بے رحم اور سنگ دل اخبارات نے انقلاب فرانس کے دوران میں جو کچھ چھاپا تھا وہ اس کے مقابلے میں ہیچ تھا جو کلکتے کے بعض اخبارات نے جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد شائع کیا[۱۵] ۔''

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد کی فضا کیسی تھی ۔ اس فضا نے اردو صحافت کو بھی متاثر کیا ۔ نٹراجن رقم طراز ہے :

''اردو ادب کے مراکز لکھنؤ ، دہلی ، میرٹھ اور کان پور جنگ آزادی کی ہولناکیاں بہت قریب سے دیکھ چکے تھے اور اب ان میں سیاسی صحافت کا یارا نہیں تھا ۔ کلکتے میں انگریزی اور بنگالی نے فارسی اور اردو کو نکال باہر کیا تھا[۱۶] ۔''
بدر شکیب نے اس المیہ کا ذکر یوں کیا ہے :

''.... ہنگامہ خیز زمانے میں یا تو اکثر و بیشتر (اردو) اخبارات بند ہو گئے یا ملک کے بدلتے ہوئے حالات قانون اور دار و گیر کے خوف نے ان کے لہجے میں اعتدال پیدا کر دیا[۱۷] ۔
جنگ آزادی میں جو چند اردو اخبار محفوظ رہے وہ ہندوؤں کے زیر انتظام تھے ، اور جنگ کے بعد کے چند سالوں میں بھی غیر مسلموں نے اردو اخبارات جاری کیے ۔ ان اخبارات کا لب و لہجہ پہلے بھی خوشامدانہ تھا اور بعد میں بھی خوشامدانہ رہا ۔ ان اخبارات میں غیر سیاسی معاملات پر رائے زنی کی جاتی تھی اور وہ بھی باقاعدہ اداریوں میں نہیں ؛ بعض خبروں یا مضامین میں''رائے'' شامل ہوتی تھی ۔ جنگ آزادی کے بعد بھی طویل عرصے تک ان اخباروں کی روش یہی رہی ۔ مثلاً :

''خبر تاسف اثر

خبر جاں سوز ہے ، احوال ملال اندوز ہے ، مضمون اخبار کا حاصل یہ مطلب ہے ، جھوٹ اور سچ کا بار راقم اول کی گردن پر سب ہے ۔ ایک صاحب اخبار بمبئی کو فتح گڑھ سے یہ مرقوم ۲۳ اپریل کا خط ملا ہے ۔ اس کے راقم نے عجب حادثہ درد افزا کا حال لکھا ہے کہ دو کمسن لڑکے تخمیناً دس برس کی عمر کے سکول سے چھٹی پا کر راستے میں گولیاں کھیلتے ہوئے اپنے گھر جاتے تھے اور قضا بھی ان کو داؤ میں لا رہی تھی ۔ ایک قصاب خانہ خراب کے مکان کے پاس پہنچے ۔ ان کے جسم پر زیور

دیکھ کر اس قصائی شیطان کے بھائی کے دل میں بدی سمائی -
خوف خدا کا جھٹ پٹ بھول گیا ، معصوم کشی کے اوپر نیت لگائی -
ان کی گولیوں کو اٹھا کر اپنے گھر کے اندر پھینک دیں - چونکہ
وہ گولیاں ان بچوں کے دل لگی کی تھیں اٹھا لانے کو وہ اس ملعون
کے گھر میں گھس گئے- ان کے ساتھ فوراً وہ قصائی بھی گیا - دروازے
گھر کے بند کر لیے اور بچوں کو پکڑ کر ان کے منہ میں کپڑا
ٹھونسا اور دبا کر گلا گھونٹا - جس قدر گہنا تھا ، اس نے لے لیا ،
جان سے بھی مار لیا - بعد اس کے نطفۂ حرام نے ایک چھری لے کر
گائے بکری کی مثال دونوں کو حلال کیا ، بھولی صورتوں کو
خون سے لال کیا - والدین کے ناز پروردوں کو ایک دم میں
پائمال کیا - بہت برا حال کیا - گوشت سب نکال کر بازار میں
بھیجا اور ہڈیاں اپنے مکان کے پاس کسی خندق میں پھینکنے کو
اپنے ایک نوکر کو دیں - مگر خون ناحق ان بے گناہوں کا پوشیدہ
نہ ہو سکا - آخر گرفتار ہوا - اب اس کی تحقیقات ہوتی ہے - اس
ملعون کی چودہ برس کی ایک لڑکی ہے - اظہار لینے کے وقت اس
نے بیان کیا کہ بچوں کو حلال کرتے میں نے اپنے باپ کو بہت
عاجزی اور منت کے ساتھ نہایت منع کیا ، مگر اس پر بھی اس نے
تامل نہ کیا - اس اظہار کے بعد پھر انکار کرتی ہے اور کہتی ہے
کہ مجھ کو مارنے کے واسطے دھمکایا ، تب خوف کھا کر اپنی
مار بچانے کو اسی طرح بتایا تھا - اور ہڈیوں کو ڈاکٹر نے پہچانا
کہ آدمی کی استخواں ہے - ظاہر سب نشان ہے[۱۸] . . . .‘‘

چونکہ اس دور میں اینگلو انڈین اخبارات میں اداریے واضح
اور نمایاں صورت میں شائع ہونے لگے تھے ، اس لیے بعض اردو
اخبارات بعض خبروں ہی میں اپنی رائے شامل کرنے کے علاوہ
بعض معاملات و امور پر الگ طور پر اظہار رائے کرنے لگے -
یہ گویا اردو اخبارات میں اداریوں کی اولین ، الگ اور واضح

صورت تھی ۔ مثلاً :

''انتظامی عملہ

سرکار سے جو یہ حکم ہے کہ کوئی شخص اہل عملہ کلکٹری اور فوجداری اور دیوانی وغیرہ کے رشتہ دار جس سررشتہ میں وہ ہوں اس میں وہ متعین نہ رہیں اور ان کی تبدیلی غیر ضلع میں ہو جاوے ۔ یہ تجویز بہت مناسب اور مفید انتظام بھی ہے ۔ چنانچہ عملدرآمد اس حکم کا اکثر سررشتہ کلکٹری اور فوجداری میں ہو گیا ہے مگر سررشتہ پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ اور کمسٹریٹ اور عدالت دیوانی میں ہونا معلوم نہیں ہوتا ۔ اس میں بھی جس قدر جلدی ممکن ہووے اس کا بندوبست ہونا چاہیے ۔ علاوہ اس کی ایک اور بڑی خرابی سررشتہ مالی میں یہ ہو رہی ہے کہ ان کے عملہ دس دس اور پندرہ پندرہ برس سے ایک ہی جگہ تعینات ہیں اور ان میں جو بڑے عہدہ دار اور اہل عملہ ہیں ان کے ایک ہی سررشتہ میں عرصہ تک رہنے سے اس قدر نقصان رعایا کا ہے کہ جس کا بیان نہیں ہو سکتا[۱۹] ۔'' (اخبار عالم ۱۸۶۵ء)

مگر اس قسم کے اداریے نہ تو باقاعدہ چھپتے تھے نہ اخبار میں ان کے لیے جگہ مخصوص ہوتی تھی ۔ ان پر لفظ اداریہ بھی نہیں لکھا ہوتا تھا ۔ ان اخباروں میں اودھ اخبار بطور خاص قابل ذکر ہے جو منشی نول کشور نے ۱۸۵۶ء میں لکھنؤ سے ہفت روزہ کی صورت میں جاری کیا ۔ پہلے یہ چار صفحات پر مشتمل ہوتا تھا ، بعد ازاں چھ صفحات ہو گئے ؛ کچھ عرصہ بعد صفحات سولہ اور بالآخر اڑتالیس ہو گئے ۔ گارساں دتاسی کو یہ کہنا پڑا :

''میرے خیال میں اس سے زیادہ ضخیم اخبار ہندوستان بھر میں اور کوئی نہیں ۔'' (خطبات ۲ : ۵)

اودھ اخبار میں مولوی غلام محمد خاں تپش تلمیذ غالب ،

احمد حسن شوکت ، عبدالحلیم شرر ، سید امجد علی اشہری ، مرزا حیرت دہلوی ، پنڈت رتن ناتھ سرشار اور مولانا جالب دہلوی ایسے لوگ کام کرتے تھے - اس اخبار میں شروع میں اداریے کسی مقررہ جگہ پر شائع نہیں ہوتے تھے - لیکن ۱۸۷۷ء میں جب یہ روزنامہ ہو گیا تو اداریے عموماً صفحہ ۲ پر چھپنے لگے - بعض اوقات دوسرے صفحات پر بھی اداریے چھاپ دیے جاتے تھے - ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کے الفاظ میں :

''اودھ اخبار میں جو اداریے چھپتے تھے ان میں ایک طرف قومی مسائل پر بحث ہوتی تھی ، دوسری طرف عوام کی روزمرہ شکایات اور خواہشات منظر عام پر لائی جاتی تھیں[۲۰] -''

سرسید احمد خاں

اردو صحافت کے دوسرے دور کا حقیقی آغاز سرسید احمد خاں کے ''اخبار سائنٹفک سوسائٹی'' (علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ) کے اجرا سے ہوا - یہ اخبار پہلے ہفت روزہ تھا ، بعد ازاں سہ روزہ ہو گیا اور سرسید کی وفات کے بعد تک جاری رہا - یہ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا اور اس کا مقصد انگریزوں اور ہندوستانیوں دونوں کو متوجہ اور متاثر کرنا تھا - سرسید کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ مسلمان جب تک جدید علوم و فنون نہیں سیکھیں گے اس وقت تک ان کی حالت نہیں بدل سکتی اور جدید علوم و فنون سیکھنے کے لیے حکمرانوں یعنی انگریزوں کی زبان سیکھنا اور ان سے مصالحت کرنا ضروری ہے - چنانچہ وہ ایک طرف تو مسلمانوں میں بالخصوص اور ہندوستانیوں میں بالعموم یہ احساس پیدا کرنا چاہتے تھے کہ انھیں وقت کے تقاضوں کا ساتھ دینا چاہیے - دوسری طرف وہ انگریزوں کو ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کے احساسات اور ان کے مسائل و مصائب سے آگاہ کرنا چاہتے تھے - بعد ازاں سرسید نے اپنا رسالہ ، تہذیب الاخلاق، بھی

اسی مقصد کے تحت جاری کیا ، لیکن اس وقت وہ دوسری مختلف النوع قومی تحریکوں میں اس قدر مصروف ہو چکے تھے کہ سات سال بعد یہ رسالہ بند ہو گیا ۔

سرسید احمد خاں اپنے دور کے مسلم ، معاشرے اور اس کے طرز فکر و عمل میں انقلاب لانا چاہتے تھے ۔ چنانچہ انھوں نے مذہب ، معاشرت ، زبان اور ادب ، ہر چیز کی اصلاح کے لیے جد و جہد کی ۔ انھوں نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جاری کیا جسے ایک طرف خبروں کی صحت کے اعتبار سے بلند مقام پر پہنچایا تو دوسری طرف اپنے مدلل ، منطقی اور عام فہم اداریوں کے ذریعے اسے مقبول اور مؤثر بنایا ۔ سرسید احمد خاں سے پہلے باقاعدہ اداریہ نگاری مفقود تھی اور اداریوں کی جو صورتیں موجود تھیں وہ غیر مربوط اور غیر مؤثر تھیں ۔ سرسید احمد خاں نے اداریے کو صحیح معنوں میں اخبار کی روح بنایا ۔ ۱۸۷۰ء میں انھوں نے رسالہ ، تہذیب الاخلاق ، جاری کیا ۔ یہ رسالہ اپنے مضامین کی وجہ سے مقبول و مشہور ہوا ۔ زیادہ تر مضامین سرسید احمد خان خود لکھتے تھے ۔ اس طرح ان کے خیالات و افکار اور ان کے پیرایہ ہائے اظہار نے اردو زبان اور علم و ادب کو براہ راست اور اردو صحافت کو بالواسطہ متاثر کیا ۔ دوسرے لفظوں میں انھوں نے اردو اخبارات و جرائد کے ایک اہم حصے یعنی اداریوں کی مقصدیت ، نوعیت ، ہیئت اور پیش کش پر بہت صحت مند اثر ڈالا ۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سرسید احمد خاں کی ادارہ نویسی)

سر سید احمد خاں کے اخبارات کو سرکاری اور غیر سرکاری دونوں حلقوں میں وقعت اور مقبولیت ملی ۔ چنانچہ دوسرے

اخبارات نے بھی سر سید احمد کے اخبارات کا انداز اختیار کرنا شروع کیا ۔ انگریزی کے حامی ہونے کے باوجود سرسید نے انگریزوں پر کھل کر تنقید کی ۔ اس سے دوسرے اخباروں کو بھی آہستہ آہستہ سیاسی صحافت کی طرف آنے کا حوصلہ ہوا ۔ علاوہ ازیں زمانہ تیزی سے بدل رہا تھا اور دوسرے اخبارات بھی نئے تقاضوں کو سمجھنے لگے تھے ۔ چنانچہ دوسرے دور میں دوسرے اخبارات میں بھی اداریے واضح اور الگ طور پر چھپنے لگے ۔ اگرچہ بہت سے اخبارات میں باقاعدہ ادارتی صفحے موجود نہیں تھے اور نہ ان میں لفظ ''اداریہ'' استعمال ہوتا تھا ، تاہم ان اخباروں میں کہیں کہیں عنوانات کے تحت ادارتی تبصرہ دیا جاتا تھا ۔ مثلاً :

''یاران جلسہ میں مستانہ رقص

صاحب اخبار ''انڈین مرر'' رقمطراز ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کا تعلیم پا کر زیادہ تر عقلمند ہو جانا دور نہیں ہے ، کیوں کہ یہاں کے شہزادے اور نوجوانوں نے ناچنا شروع کیا ہے راقم موصوف کا قول ہے کہ جو ہمارے بہت بڑے دشمن ہیں وہ اب ہم پر انگشت نمائی نہ کر سکیں گے ، کیوں کہ ان کے سرداران نے بھی اب ناچنا شروع کر دیا ہے ۔ وہ کہتے ہیں ہم نے تعلیم انگریزی پائی اور گوشت کھانا ، شراب پینی تو سیکھی فقط ناچنا باقی تھا ، سو اب ناچنا سیکھیں گے ۔ ٹائمز لنڈن کا کارسپانڈنٹ بمبئی ٹائمز کو لکھتا ہے کہ دربی ولا ایک ناچ اور کھانا جو ایوان شاہی موسومہ بکنگھم میں ملکہ معظمہ کی طرف سے ہوا تھا ، اس میں ہندوستانی شہزادے خوب ناچے یعنی نواب نظام بنگال اور ان کے دونوں بیٹے ۔ نواب موصوف کا چھوٹا بیٹا جو پست قد ہے اس نے مارشس نٹلی کے ساتھ ناچنا چاہا جو ایک دراز قد عورت ہے ۔''
(اودھ اخبار ۲۱)

اودھ اخبار روزنامہ بنا تو اداریے اور بھی نکھری ہوئی صورت میں چھپنے لگے - مثلاً ۱۹ جنوری ۱۸۸۰ء کی اشاعت میں ''ڈاکٹری علاج'' کے زیر عنوان یہ اداریہ ادارتی صفحے پر شائع ہوا:

''پنجاب کے ایک مقام میں یہ واقعہ گزرا کہ ایک شریف کے یہاں لڑکا پیدا ہونے کو تھا - اس نے ایک اسسٹنٹ سرجن کو طلب کیا - اسسٹنٹ سرجن قبل اس کے کہ اس شریف کے مکان پر جائیں ، کہا کہ تاوقتیکہ ہم کو دس روپیہ نہ دیں ہم نہیں جا سکتے - اس پر اخبار ''رہبر ہند'' نے اپنی رائے دی ہے - چونکہ یہ خبر ایسی ہے کہ اس پر رائے دینا ضروری ہے ، لہذا ہم بھی اس باب میں کچھ لکھنا چاہتے ہیں -

ہمارے نزدیک جب کہ ہندوستانی ایک مدت کے بعد اس زمانے میں ڈاکٹر صاحبوں کے علاج کو پسند کرنے لگے ہیں اور انگریزی دوائیوں کے استعمال پر رجوع ہوئے ہیں تو پھر ایسے مواقع موجب سلب خواہشات سمجھے جائیں گے اور جو بات کہ بعد مدت حاصل ہو گئی ہے وہ جاتی رہے گی - اسسٹنٹ سرجن صاحب کو مناسب تھا کہ چلے جاتے اور حسب ضابطہ فیس طلب کرتے نہ کہ پہلے ہی سے طالب نہیں ہوتے - اس میں کچھ شک نہیں کہ اگر ہندوستان میں ایسے ہی چند معاملے پیش ہوں گے تو بیشک گورنمنٹ ہند کو اس جانب خیال کرنے کا موقع ملے گا اور اس وقت کوئی نہ کوئی ایسا انتظام ہوگا کہ جس سے ایسے افرار کا کامل سدباب ہو جائے گا -

یونانی حکیموں اور ویدوں کا یہ دستور ہے کہ اگر ان کو کوئی علاج کے واسطے طلب کرتا ہے تو حسب حیثیت جو چاہتا ہے وہ دے دیتا ہے - مگر پہلے ہی سے کوئی نہیں مانگتا اور اگر کسی

نے شاذ و نادر ایسا کیا تو وہ مستوجب انگشت نمائی ہے۔ ڈاکٹروں اور حکیموں کی طلبی میں صرف اس قدر فرق ہے کہ ڈاکٹر اپنے کام کی اجرت کا اظہار آپ بھی کرتے ہیں اور یونانی حکیم جن کے یہاں جاتا ہے۔ اس کی مرضی پر اس کی فیس اور نذر کی تعداد موقوف ہے، مناسب تو یہی ہے کہ بطریق حضرات ڈاکٹر حسب الطلب مثل حکیموں کی کارروائی پر متوجہ ہوں اور جن شکایتوں کا موقع ہندوستانیوں کو ملتا ہے وہ جاتا رہے۔ وکلا وغیرہ کی فیس کا قانون تو ایک مدت سے جاری ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحبان کی بے انتہا فیس بھی اگر کمی کے ساتھ قانوناً محدود کر دی جائے تو ہر شخص کو ان کے علاج سے فائدہ پہنچے۔''

''انگلستان کی حکمت عملی

یہ بات جو ہر متنفس کی زبان پر ہے کہ دربار انگلستان جو کام کرتا ہے مصلحت وقت کے گول مول معا پر کرتا ہے۔ اس کی مصلحت وقت ایک ایسا امر ہے کہ جس کا بھید وہی جانتا ہے۔ ظاہر اور بدیہی ہے کہ راجا اس کا قدیم ہمسایہ اور دلی دوست ہے، مگر سخت تعجب ہے کہ وہ ایسے وقت میں اس کی مدد نہیں کرتا۔ تجربہ کار لوگوں کی رائے ہے کہ اگر خدانخواستہ روس نے ترکی میں دخل پا لیا تو کچھ روز کے بعد وہ وہی حال انگلستان سے کرے گا۔''

(اخبار سفیر ہندوستان اشاعت ۱۸ اگست ۱۸۷۷ء صفحہ ۳ ۶ ۴)

ہفت روزہ اخبار ''مہرنیم روز'' بجنور صفحہ ۴ پر (بعض اوقات کسی اور صفحے پر) اخبار کے نام کی تختی کے نیچے اداریہ چھاپتا تھا۔ مثلاً: ''چونکہ مغربی علم و ادب متفق علیہ ہر دین و مذہب کے ہے اور اس کے نتیجے کی عمدگی ثابت اور متحقق اور بنظر غور دیکھا جاتا ہے کہ اکثر عوام اور بعض خواص بھی

(بھی) اس مرض بے تہذیبی اور ناموُدبی میں مبتلا ہیں اور بوجہ اس مرض مہلک کے بہت جانیں معرض تلف اور ذلت میں ہیں اور نتیجہ اس کا ان لوگوں کو بد ملتا ہے اور غیر مذہبی ان کی بدنامی کا ذریعہ ہو جاتی ہے اور کیوں نہ ہو کہ اطبائے روحانی اور علمائے ربانی کی کہ جنہوں نے اس مرض مہلک کے علاج اور تدبیریں لکھی ہیں برخلاف کرتے ہیں۔ لہٰذا ضرور ہوا کہ کچھ بیان اس کا قلم بند کیا جاوے۔ و ہو ہذا۔

کہ معنی ادب کے جو کلام قدما سے ثابت ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ قول و فعل ناپسندیدہ سے اپنااور اوروں کا حفظ مراتب کرنا اور اپنی ان کی آبرو کا خیال رکھنا۔ پس چاہیے کہ آدمی اپنی زبان کو اقوال نامہذب سے آلودہ نہ کرے۔"

(مہر نیم روز ۲۱ فروری ۱۸۸۱ء صفحہ ۴)

رفتہ رفتہ سب اخباروں نے ادارتی صفحات مخصوص کر لیے اور باقاعدہ اداریہ نویسی اختیار کر لی۔ مثال کے طور پر "نصرت الاخبار" دہلی میں صفحہ دو پر اخبار کے نام کی تختی کے نیچے اداریہ چھپتا تھا۔ ایک اداریہ ملاحظہ ہو:

"شاہی اشتہار جدید پر رائے

اخبار دہلی گزٹ کالم ۳ صفحہ ۲ مطبوعہ ۳۰ مئی ۱۸۷۷ء میں لکھا ہے کہ اشتہارات شاہی لنڈن گزٹ کے زائد پرچے میں طبع ہوا ہے جس میں ملکہ معظمہ نے اپنی تمام رعایا کو شریک کیا ہے کہ وہ جنگ روم اور روس میں بے طرفدار رہیں ورنہ بڑی نارضا مندی ہوگی۔ فقط۔

اس اشتہار سے لوگوں کے دلوں میں بڑا اضطراب پیدا ہوا ہے اور اکثر لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ اس کا اصل مطلب کیا ہوگا۔ لیکن ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ اشتہار میں جنگ روم و روس میں بے طرفدار رہنے کی ہدایت ہے۔ اس کا

صاف مطلب یہی ہے کہ رعایائے ملکہ معظمہ کو چاہیے کہ اس جنگ میں کسی کے شریک نہ ہوں اور چوں کہ رعایائے ملکہ معظمہ کو یہ ہدایت ہوئی ہے نہ یہ کہ رعایائے قیصر ہند کو تو اس سے مراد تمام اہل انگلستان ہیں نہ یہ کہ اہل ہندوستان ۔ لیکن اس اشتہار کو دیکھ کر مسلمانوں کا اضطراب بھی بے وجہ نہیں ہے ۔ غدر ۱۸۵۷ء کی آنتیں اب تک ایسی بد حواسی میں مبتلا رکھتی ہیں کہ ذرا سے خطرے میں بھی ہوش گم ہو جاتے ہیں اور دل قابو میں نہیں رہتا ۔ بقول کسے دودھ کا جلا چھاچہ (چھاچھ) پھونک پھونک کر پیتا ہے ۔ باوجود اس کے کسی مستقل و آزاد فرمانروا کو ہرگز واجب نہیں ہے کہ کوئی حکم اپنی طرف سے ایسا مہمل جاری کرے جس کا مطلب بیسیوں پہلو بدل سکتا ہو ۔ اگر دو فعلی بات کہنا ادنیٰ لوگوں کے لیے سخت عیب ہے تو کیا بادشاہوں کے لیے یہ سخت ترین عیب نہ سمجھا جائے گا ۔''

(نصرت الاخبار دہلی یکم جون ۱۸۷۷ء صفحہ ۲)

بعض اخبارات اداریے کو خبروں سے علیحدہ شائع نہیں کرتے تھے مگر خبر کا متن دے کر نیچے ذرا جلی خط میں اخبار کا نام دے کر رائے ظاہر کی جاتی تھی جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ متعلقہ اخبار نے اس خبر پر یہ رائے دی ہے ۔ مثلاً

''آسام کی پولیس میں تخفیف

ڈھاکہ کے کاغذ سے ''کوابلٹی'' کا ایک کارسپانڈنٹ لکھتا ہے کہ ان دنوں آسام میں پولیس کا نیا انتظام ہونے والا ہے جس سے پچاس ہزار روپے سالانہ کی بچت ہوگی ۔

لارنس گزٹ : اگرچہ ظاہراً پولیس کی تخفیف عام کی نظر میں بیجا معلوم ہوتی ہے مگر غور کرنے سے یہ نکتہ کھلتا ہے کہ کارندوں کی کثرت کاروبار کی قلت میں آرام طلبی پیدا کرتی ہے ۔

اور جب اہلکاروں کی کمی ہوئی اور کام کی زیادتی تو بیشک کام کے انجام میں ان کی سعی و کوشش بیشتر صرف ہوگی جس سے نتیجہ چستی ، چالاکی اور کارگزاری کا نکلے گا ۔ مگر میرے نزدیک جس قدر پولیس زائد میں تخفیف ہو اسی قدر تعلیم کے سررشتہ میں ترقی ہونی چاہیے ، اس لیے کہ پولیس جس طرح محافظ جان و مال ہے اسی طرح علم دور کرنے والا برائیوں و افعال کا ہے ۔''

(لارنس گزٹ میرٹھ ۱۹ فروری ۱۸۷۲ء صفحہ ۲۰)

اور

''قتل عمد

ایک نیلگر ساکن بھرت پور ضلع سیتا پور نے ایک طفل یازدہ سالہ کو بطمع کڑوں نقرہ کے ارہر کے کھیت میں لے جا کر بڑی بے رحمی اور سنگدلی سے ہلاک کیا اور کپڑے اور کڑے مقتول کے اتار لیے ۔ جب وہ اس لڑکے کو لیے جاتا تھا تو ایک شخص نے اس کو دیکھا تھا ۔ کچھ عرصے کے بعد ایک شخص نے اوس کھیت میں لاش کو دیکھ کر تھانہ میں اطلاع دی ۔ اہالیان پولیس نے تحقیقات شروع کی ۔ آخرکار اسی شخص سے پتا لگا جس نے اس شخص کو جاتے ہوئے دیکھا تھا ۔ مجرم گرفتار ہوا وقت تلاشی کڑے مقتول کے بھی اس کے گھر سے برآمد ہوئے ۔ عدالت ابتدائی سے تحقیقات ہو کر مقدمہ دورہ سپرد ہوا ۔

نورالانوار : ہزار افسوس کی بات ہے فرزند لخت جگر کو زیور پہنا کر قتل کرا دیں اور زندگی جاوید کی تدبیر نہ فرماویں کہ تعلیم و تربیت وہ پہناوا ہے کہ بڑھاپے تک اس کا حسن اور آرائش روز افزوں رہتا ہے ۔''

(نورالانوار ۱۴ مارچ ۱۸۷۴ء صفحہ ۸۲)

مزاحیہ صحافت

اس دور میں بہت سے مزاحیہ اور ظریفانہ اخبار بھی جاری ہوئے۔ ان میں نمایاں ترین اخبار ''اودھ پنچ'' تھا جو لندن پنچ کی تقلید اور انداز میں جاری ہوا تھا اور اس کو خوب عروج حاصل ہوا۔ یہ اخبار سرسید احمد خاں کے مکتب فکر کا بھی مخالف تھا، تاہم اس نے اپنے انداز میں سیاست کو ظرافت کا جامہ پہنا کر تنقید و تبصرہ کا حق ادا کیا۔ اس اخبار میں بھی اداریے کسی مخصوص صفحے یا جگہ پر شائع نہیں ہوتے تھے بلکہ ایڈیٹر جب اور جہاں مناسب سمجھتا اپنا تبصرہ ظریفانہ انداز میں لکھ کر چھاپ دیتا تھا۔ یہ تبصرے ایک طرح کے اداریے ہی تھے۔ ان کا انداز ملاحظہ ہو:

''مبارک وہ کالے جو ستائے جاتے ہیں کیونکہ آسمان کی راحتیں انہیں کے واسطے ہیں۔ مبارک وہ جو سول سروس کے لیے رنجیدہ ہیں کیونکہ سرکار سے زبانی تسلی دی جائے گی۔ مبارک وہ جو قحط کے بھوکے پیاسے ہیں کیونکہ پادریوں کی بدولت مسیحی مذہب سے مشرف ہوں گے۔ مبارک وہ جو سنگدل ہیں کیونکہ بعض خوشامدی اخبار رحم دل کہیں گے۔ مبارک وہ جو راستبازی کے لیے دھمکائے جاتے ہیں کیوں کہ ان کے سچائی کے درخت کی جڑ مضبوط ہو جائے گی۔''

(اودھ پنچ ۱۱ ستمبر ۱۸۷۷ء)

''دیسی بوجہ نقص طریقہ تعلیم سرکاری انیس سال کے سن تک سول سروس کا امتحان دینے کی کامل لیاقت نہیں رکھتے اور اس سول سروس کے ہیولے کو ہندوستان کی آب ہوا موافق نہیں لہٰذا یہ ولائتیوں کے لیے مخصوص ہے۔ چونکہ دیسیوں کا کم وزن ہوتا ہے اور کم وزن اور چھوٹا سر حماقت کی نشانی ہے،

لہٰذا دیسی احمق ہیں ، اس واسطے دیسیوں کی رائے قابل مضحکہ ہے - اور مضحکہ چونکہ ذلیل کرتا ہے لہٰذا دیسی ذلیل ہوگئے -''
(۲۸ اگست ۱۸۷۷ء

پرانی روش

اس دور میں بھی بعض اخبارات پرانی روش پر گامزن رہے یعنی وہ الگ اداریے شائع نہیں کرتے تھے بلکہ حسب سابق خبروں ہی میں تبصرہ شامل کردیتے تھے - مثلاً ''بنارس گزٹ'' کی ۱۷ جولائی ۱۸۸۲ع کی اشاعت میں صفحہ ۷ پر مندرجہ ذیل خبر مع تبصرہ ''خبر اعظم گڑھ'' کے زیر عنوان چھپی ہے :

''گرمی کیا پڑ رہی ہے قیامت کا نمونہ ہے - مخلوق مجبور واویلا مچا رہی ہے ، ہاتھ پاؤں مار رہی ہے - کچھ بس نہیں چلتا - آفتاب کی حدت ، گرمی کی شدت ، بارش کی کشش نے لوگوں کا دل پژمردہ کر رکھا ہے - سامان قحط سالی موجود ہے - خدا اپنا فضل و رحم کرے -''

''شبرات کے دن خوب پٹاپٹی ہوئی - افسوس ہندوستانیوں کی عقل کو ذرا ملاحظہ تو فرمائیے کہ کیسی متبرک شب کو کس کس قسم کے لہو و لعب میں صرف کرتے ہیں ، مفت کا روپیہ برباد کرتے ہیں - دولت کے پھونکنے کے مصداق گویا مثل اسی امر پر صادق آتی ہے - اجہل لوگ تو اس کو مذہبی رسم تصور کرتے ہیں حالانکہ دراصل یہ بات نہیں -''
(بنارس گزٹ - ۱۷ جولائی ۱۸۸۲ع صفحہ ۷)

ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو :

''مختلف واقعات

ہر کسے را بہر کارے ساختند ، درویش پاشا جو معاملہ مصر کی

اصلاح کو تشریف لے گئے تو اب سلطان کے حکم سے قسطنطنیہ واپس جا رہے ہیں۔ ہمارے نزدیک ان کا جانا ہی بیکار تھا۔ کیا معنی کہ دنیا کے کام درویشوں سے نکلنے لگیں تو حکمت عملی والے کیوں پوچھے جائیں؛ اس کے واسطے تو کوئی حکمت عملی پاشا، پولٹیکل پاشا چاہیے۔"

(بنارس گزٹ - ۲۶ - اگست ۱۸۸۲، صفحہ ۹ اور ۱۰)

دوسرے دور کے اردو اخبارات میں ہمیں اداریہ نویسی کے مندرجہ ذیل واضح رجحانات ملتے ہیں:

۱ - کچھ اخبارات نے ادارتی صفحات متعین کرلیے اور وہ اپنے ان صفحات پر باقاعدگی سے اداریے چھاپنے لگے - کچھ اخبارات نے اداریے الگ صفحات پر باقاعدہ چھاپنے کی بجائے خبروں میں تبصرہ شامل کرنے کا سابقہ طریقہ برقرار رکھا، مگر اس میں اتنی تبدیلی کردی کہ اوپر خبر دے کر نیچے اخبار کا نام ذرا جلی دے کر رائے شائع کر دیتے - گویا ان اخباروں میں بھی اداریے ایک اعتبار سے الگ اور نمایاں طور پر شائع ہوتے تھے - البتہ بعض اخبارات نے خبروں میں ہی تبصرہ شامل کرنے اور اسے نمایاں یا الگ کرکے نہ دینے کا طریقہ برقرار رکھا - مگر بحیثیت مجموعی اداریے الگ اور ممتاز ہو گئے -

۲ - بیشتر اداریے مختصر ہوتے تھے، طویل اداریے خال خال ہی ہوتے تھے - بیشتر اخبارات کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ مسائل پر اظہار رائے کریں -

۳ - اس دور میں بھی اداریوں نے فن یا ہیئت کی رو سے کوئی واضح اور متفق علیہ سانچا اختیار نہ کیا - اداریوں میں اظہار رائے میں انفرادی اسلوب تحریر غالب ہوتا تھا -

۴ - دوسرے دور کے آغاز میں اخبارات میں زیادہ تر غیر سیاسی موضوعات پر اداریے چھپتے تھے ، لیکن رفتہ رفتہ وہ سیاسی معاملات کی طرف آتے گئے اور بعض اخبارات سیاسی معاملات میں کھل کر اور جرأت سے اظہار رائے کرنے لگے کے سجن لال کے الفاظ میں :
''البرٹ بل کے سوال پر اردو اخبارات نے اپنے اداریوں، مضمونوں ، تبصروں اور کارٹونوں کے ذریعے رائے عامہ کی ترجمانی کی - انگریز اور انگریزی اخبارات اس بل کے سخت مخالف تھے۔'' اخبار ہزار داستان نے ۲۱ جولائی ۱۸۸۳ء کے اداریے میں لکھا : ''انگریزوں کی طرف سے البرٹ بل کی مخالفت سے یہ بات صاف ظاہر ہو گئی ہے کہ انگریز ہندوستانیوں کے ساتھ وہ سلوک برقرار رکھنا چاہتے ہیں جو غلاموں کے ساتھ کیا جاتا ہے -''
اسی طرح دبدبۂ سکندری نے ۲۸ مئی ۱۸۸۳ء کو لکھا :
''البرٹ بل کا مسئلہ ہندوستانیوں کے ساتھ انگریزوں کے گھٹیا برتاؤ کی زندہ مثال ہے -''

۵ - بعض اخبارات پہلے کوئی خبر یا واقعہ مختصر طور پر بیان کرکے اظہار رائے کرتے تھے لیکن بعض کسی پیش پا افتادہ مسئلے پر براہ راست لکھتے تھے اور تمہید یا پس منظر کے طور پر کوئی واقعہ بیان نہیں کرتے تھے -

۶ - اس دور میں زبان خاصی سلیس اور آسان استعمال ہوتی تھی - البتہ جملوں کی تراکیب وغیرہ کچھ گنجلک نظر آتی ہیں اور نسبتاً طویل جملے استعمال کرنے کا رجحان ملتا ہے -

۷ - سیاسی نوعیت کے اداریوں میں دو تین واضح باتیں ملتی ہیں : (۱) انگریز زیادتی کرتے ہیں ، یہاں تک کہ

ہندوستانیوں کو بعض اوقات اس طرح مار ڈالتے ہیں جیسے درندہ شکار مارتا ہے مگر ان سے کوئی پوچھ گچھ نہیں ہوتی - (۲) ہندوستانی انگریزی حکومت کے وفادار ہیں اور اپنے طرز عمل کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں مگر انگریز ان پر اعتماد نہیں کرتے - (۳) ہندوستانیوں کو اپنی مظلومی کا احساس ہے مگروہ بے بس ہیں اور کچھ کر نہیں سکتے -

۸ - اس دور میں اخبارات مختلف دھڑوں میں بٹے ہوئے تھے اور ادارتی تبصروں میں بھی ایک دوسرے کی خبر لیتے رہتے تھے - 'شمس الاخبار'، 'میو گزٹ'، 'نورافشاں' اور 'کوکب ہند' عیسائیت کے مبلغ تھے اور مسلمانوں پر کیچڑ اچھالتے تھے - مخبر صادق، نورالآفاق، قاسم الاخبار اور منشور محمدی اسلام اور مسلمانوں کے ترجمان تھے اور ترکی بہ ترکی جواب دیتے تھے - قاسم الاخبار، منشور محمدی، نورالآفاق اور نورالانوار سرسید کی سخت مخالفت کرتے تھے، لیکن پنجابی اخبار، مخبر صادق، دبدبہ سکندری اور اردو کرانیکل سرسید اور ان کی اصلاحی تحریک کے مؤید تھے - بعض اوقات کسی اخبار نویس پر حکام کی طرف سے مصیبت نازل ہوتی تو سب (مقامی) اخبار نویس متحد ہو جاتے - مثال کے طور پر لاہور کے اخبار، رفاہ عام، کے ایڈیٹر محمد علی چشتی کو باغیانہ مواد چھاپنے پر ایک ماہ قید اور جرمانے کی سزا ملی تو کئی اخبارات نے احتجاج کیا - اسی طرح بنارس گزٹ کے ایڈیٹر بابو گووند رگھوناتھ راؤ سیٹھی کو سزا ملی تو متعدد اخباروں نے احتجاج کیا -

تیسرا دور

روزانہ اخبارات اور ان کے ادارے

اردو کا پہلا روزانہ اخبار اردو گائیڈ ۱۸۵۸ء میں مولوی کبیرالدین احمد خان بہادر نے کلکتے سے جاری کیا تھا - یہ چار صفحات پر مشتمل ہوتا تھا اور اس میں خبریں اور دوسرا مواد دینے کا انداز وہی تھا جو ہفت روزہ یا پندرہ روزہ اخبارات کا تھا۔ ۱۸۷۴ء میں اودھ اخبار روزنامہ ہوا - یکم جنوری ۱۸۷۵ء کو تیسرا روزنامہ ''روزنامچہ پنجاب'' جاری ہوا - ۱۸۸۴ء میں لاہور سے ہفت روزہ 'شفیق ہند' کا اجرا ہوا - کچھ مدت بعد اس کے ضمیموں کے طور پر دو روزنامے ''نسیم صبح'' اور ''شام وصال'' جاری ہو گئے - پھر ''اخبار عام'' روزنامہ ہو گیا - ۱۸۸۸ع میں 'کوہ نور' بھی روزنامہ ہو گیا جس کے چند سال بعد روزانہ ''پیسہ اخبار'' جاری کیا گیا - کلکتے سے ۱۵ دسمبر ۱۸۸۵ع کو ایک روزنامہ ''آئینہ' نمائش'' جاری ہوا - ۲۶ اپریل ۱۸۸۵ع کو ''پیکر صبا'' اور یکم مئی ۱۸۸۵ء کو ''روزنامچہ' ملک'' کا اجرا ہوا - لکھنؤ میں 'اودھ اخبار' کے بعد یکم جنوری ۱۸۸۲ع کو ''روزنامچہ لکھنؤ'' شروع ہوا - ۱۱ جون ۱۸۸۵ع کو ''روزانہ'' شائع ہونے لگا - الہ آباد سے یکم نومبر ۱۸۷۷ع کو ''قیصرالھند'' کے روزانہ ایڈیشن کی اشاعت شروع کی گئی - یکم اکتوبر ۱۸۸۴ع کو ''روزنامچہ' عالم'' کا آغاز ہوا - حیدر آباد دکن سے جنوری ۱۸۸۴ع میں ایک روزانہ اخبار ''پیک آصفی'' جاری ہوا - ۱۸۸۸ع میں ''سفیر دکن'' کا اجرا ہوا - ۱۸۸۷ع میں ہفت روزہ ''دکن پنچ'' کو روزنامہ میں تبدیل کر کے ''مشیر دکن'' بنا دیا گیا - ۱۸۸۵ع میں مدراس سے روزانہ ''اتحاد'' جاری ہوا - ۱۷ مارچ ۱۸۸۳ع کو بمبئی سے روزنامہ ''خادم ہند''

نکلنے لگا۔ پٹنہ سے ۱۸۷۶ع میں روزنامہ ''بہار پٹنہ'' کا اجرا ہوا۔ اس کے بعد روزانہ اخبارات کا اجرا ایک معمول بن گیا۔ ان روزناموں میں سے بعض تو چند ماہ بعد ہی بند ہو گئے، بعض نے چند سال بعد دم توڑ دیا، اور کچھ طویل عرصے تک زندہ رہے۔

ان میں جن اخباروں نے زیادہ شہرت حاصل کی اور جنھوں نے جدید اردو صحافت کی داغ بیل ڈالی وہ دو ہیں: اخبار عام اور پیسہ اخبار۔ بقول ڈاکٹر عبدالسلام خورشید: ''برعظیم میں جدید صحافت کے علمبردار دو اخبار تھے: اول اخبار عام، دوم پیسہ اخبار۔''۲۱

اخبار عام کے اداریے

یہ اخبار ''$6\frac{1}{2} \times 10''$'' کے آٹھ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ پہلے صفحے پر اخبار کے نام کی تختی کے نیچے مختصر خبریں چھپتی تھیں جو ایک ایک یا دو دو سطر کی ہوتی تھیں۔ صفحہ نمبر ۲ پر پھر نام کی ایک کالمی تختی دی جاتی تھی اور اس کے نیچے اداریے چھاپے جاتے تھے۔ یہ اداریے بالعموم مختصر ہوتے تھے۔ ہر شمارے میں اوسطاً چار پانچ اداریے شائع ہوتے تھے۔ آج کل کی اصطلاح میں ان اداریوں کو شذرات کا نام دیا جا سکتا ہے۔ پہلا اداریہ جسے آج کل مقالہ' افتتاحیہ کہا جاتا ہے، دوسرے اداریوں کی طرح مختصر ہوتا تھا۔ نہ ہی یہ اہم ترین مسئلے پر ہوتا تھا بلکہ پہلا اداریہ بلا عنوان ہوتا تھا۔ اس کے بعد کے اداریوں کے مختصر عنوانات دیے جاتے تھے۔ مگر آج کل کے طریقے کے برعکس یہ عنوانات اداریوں کے متن سے باریک ہوتے تھے اور خطوط وحدانی میں دیے جاتے تھے۔ مثال کے طور پر ۲۹ دسمبر ۱۸۹۰ع کے شمارے میں چار اداریے شائع ہوئے۔ پہلا بلا عنوان تھا، باقی کے تین علی الترتیب ''مقدمہ ڈاکہ زنی''، ''عجیب خبر ہے''

اور ''رپورٹ مفصل گندم'' کے عنوانات کے تحت چھپے ۔ اسی طرح ۳۰ دسمبر ۱۸۹۰ع کی اشاعت میں پانچ اداریے شائع ہوئے جن میں سے پہلا بلا عنوان تھا باقی چار کے عنوانات یہ تھے : (۱) ہندو مسلمان (۲) تھیو سوفیکل سوسائٹی (۳) خطابات سال نو اور (۴) 'رپورٹ مفصلات ہند' ۔

۳۱ دسمبر ۱۸۹۰ع کے شمارے میں چار اداریے شائع ہوئے جو ڈیڑھ صفحے پر محیط تھے ۔ پہلا اداریہ بلا عنوان تھا مگر بعد کے تینوں اداریوں کے عنوانات یہ تھے: (۱) سفر ریلوے (۲) ولی عہد روس ہند میں (۳) شملہ میونسپلٹی ۔ اکثر اداریے مختصر ہوتے تھے ، مگر کبھی کبھی طویل اداریے بھی چھپتے تھے ۔ اخبار عام کے اداریوں کا متن خبروں اور مضامین کے متن سے جلی ہوتا تھا ۔

مثالیں

۱ ۔ ''عنقریب حکم جاری ہونے والا ہے کہ عدالتوں کے سمن بذریعہ ڈاک تقسیم ہوا کریں ۔ بے شک اس سے ہر قسم کی سہولت ہو جائے گی ، بشرطیکہ غریب چٹھی رسانوں کی تنخواہوں کی طرف بھی عنایت کی توجہ کی جائے ۔ ڈاک کا کام پچھلے دنوں جتنا کچھ بڑھایا گیا ہے پیشتر سے دوچند ہے اور باوجود اس کے چٹھی رسانوں کی تنخواہوں کے وہی تین کانے منتظمان کی ناقدر شناسی کی طرف انگلی کر رہے ہیں ۔''

''اخبار لنڈن ٹائمز کی اس تجویز پر کہ ہندوستانی فوج کی کنٹنجنٹ کو ہندوستان کی طرف واپس ہونے سے پیشتر انگلستان کی سیر کرانی چاہیے ، زیادتی اخراجات کے سبب سے عمل ہونا مشکل بیان کیا گیا ہے ۔ ہاں ایسا ہو سکتا ہے کہ جن سپاہیوں نے جنگ مصر میں نمایاں بہادری دکھائی ہے ان کو البتہ انگلستان کی سیر کرائی جاوے ۔ اس سے

بے شک تمام فوج پر نہایت عمدہ اثر پیدا ہوگا اور سپاہی کے دل میں بہادری دکھانے کا خیال ہمیشہ غالب رہے گا ۔ اخبار پایونیر تجویز پیش کرتا ہے کہ جن دیسی سپاہیوں کو انعام یا تمغوں کے واسطے منتخب کیا جاوے گا بہتر ہے کہ حضور قیصر ہند ان کو اپنے ہاتھ سے سرفرازی بخشیں[۲۲] ۔''

''غور سے سنیے رنگون کے بدمعاش ، لچوں شہدوں نے ایک سوسائٹی اس غرض سے قائم کی ہے کہ ان کا کوئی ممبر اگر کسی مقدمے ، چوری سینہ زوری یا دیگر بد معاشی میں گرفتار ہو تو سوسائٹی مذکور چندہ کر کے اس کی جان بچانے کی کوشش کرے ۔''

''ہندوستان میں لوگ آج کل عموماً اس بات کے شاکی نظر آتے ہیں کہ انگریزی راج نے لوگوں کا رزق مار دیا ہے ۔ کلوں نے سب کام سستا کر دیا ہے اور دستکاری کا بیج اکھاڑ دیا ہے ۔ اگر کسی کام میں ظاہرا فائدہ رہ گیا ہے تو وہ نوکری ، وکالت ، انجینیٹری وغیرہ ہیں لیکن عوام الناس کی سر توڑ پیروی نے ان کے لطف کو بھی یہاں تک اڑا دیا ہے کہ وہ دن عنقریب آنے والا ہے جب یہ لوگ بھی کوڑی کے تین تین پڑے بکیں گے ۔ یہ شکایت بے شک بجا ہے اور یاد رہے کہ انگلستان اس شکایت سے سب سے زیادہ تنگ آ رہا ہے ۔ لیکن وہ شائستہ ملک ہے اور اس واسطے اس شکایت کا علاج خود کرنے میں مصروف ہے ۔ وہاں کے ایک بڑے عالی صاحب ثروت موسوم بہ مسٹر ہملٹن نے یہ تجویز ایجاد کی ہے کہ ایک بڑا بھاری مدرسہ بنایا جاوے۔۔۔۔''

(اس کے بعد مدرسہ کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں)

(اخبار عام لاہور
۱۲ اگست ۱۸۸۰ء)

عمومی نوعیت

بعض اوقات اداریے خبروں پر مبنی نہیں ہوتے تھے بلکہ عمومی اور اخلاقی نوعیت کے ہوتے تھے ، مثلاً :

''کثرت جرائم کی وجوہات میں جہاں قحط اور افلاس اور کمی سزا پیش کیے گئے ہیں وہاں سررشتہ پولیس کی سستی یا بے احتیاطی بھی شامل کرنے کے قابل بیان ہوئی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قحط نے بھی تسلط کر رکھا ہے اور چار دانگ اقلیم میں ایک ہی نرخ کا وہ باجا بجا رکھا ہے کہ باید و شاید ۔ اور افلاس و بے روزگاری نے بھی خلقت خدا کا وہ گلا گھونٹنا شروع کر رکھا ہے کہ الامان اس پر پولیس کی غفات اور بھی ستم ڈھا رہی ہے ۔ اس حال میں جرم کی کثرت نہ ہو تو کیا ہو ''۔۔۔

(اخبار عام ۲۶ جنوری ۱۸۵۸ صفحہ ۲)

اور

''صبر

اخلاق مضامین کے مطالعے کے دوران میں صبر کی تعریف قابل تذکرہ معلوم ہوئی ۔ کہتے ہیں صبر میں ایک طور سے وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو لوگ پارس پتھر میں بتلاتے ہیں ۔ صبر سے گو دولت حاصل نہیں ہوتی لیکن دولت کی خواہش نہ رہنے سے وہی بات حاصل ہوتی ہے ۔ جس دل میں صبر ہے کبھی خدا کی ناشکری نہیں کرے گا ، نہ اپنی قسمت کو برا بھلا کہے گا ۔''

(اخبار عام ۲ فروری ۱۸۸۸ء صفحہ ۲)

نسبتاً طویل اداریے کی مثال :

''ہندوستان کے اخبار خبردار ہو جائیں ، ان کی مخالفت کا گورو گھنٹال ولایت میں جا دھمکا ہے ۔ ایک صاحب مسٹر

ویلر نام پہلے اخبار پایونیئر کے ملازم تھے، پھر لاہوری سول کے ایڈیٹر ہوئے۔ یہ دونوں اخبار جیسے اہل ہند کے بدخواہ اور شرطی دشمن ہیں اس کے بیان کی ضرورت نہیں، وہی صاحب اب ولایت کے اخبار جیمز گزٹ کے ایڈیٹر ہوئے ہیں۔ انھوں نے وہاں ایک مضمون دیسی پریس کی زہریلی مخالفت میں شائع کیا اور یہ الزام دیا ہے کہ دیسی اخبار بڑے گستاخ، زبان دراز، مفسدہ پرداز اور نمک حرام ہیں۔ وہ اپنی زیادہ قوت گورنمنٹ کی کارروائیوں پر نکتہ چینی کرنے اور سرکاری افسران کو گالیاں دینے میں صرف کرتے ہیں۔ وہ ہر شے کو تعصب کی نگاہ سے دیکھتے ہیں وہ لوگوں کو گورنمنٹ کے اداروں کی نسبت محض غلط خیالات سے بدظن کرتے ہیں۔۔۔۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ تمام دیسی پریس ان الزامات سے بری ہیں، ہمارا کہنا یہ ہے کہ خود انگریزی اخبار ان تحریروں کی نوشت کا باعث ہوتے ہیں۔ لارڈ رپن کی عالی شان گورنمنٹ کی مخالفت جس بے لگام زبان درازی اور خودسری اور کورنمکی سے انہیں اخباروں نے کی ہے جن کا ایڈیٹر اور ملازم خود 'ویلر' رہ چکا ہے، ہم حلفاً کہنے کو تیار ہیں کہ اس کا عشرعشیر بھی کسی خراب سے خراب دیسی اخبار کے قلم سے نہ نکلا ہوگا۔ تعجب یہ ہے کہ جس کی نقلیں خود انگریزی اخبار قائم کریں اس کی تقلید سے خود ہی گھبرائیں اور دیسی پریس کو ملزم ٹھہرائیں۔ بہر حال دیسی پریس کو واجب ہے کہ ہوش کو ٹھکانے لا کر فرائض منصبی ادا کرے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اخباروں کا کام گورنمنٹ کی کارروائی پر نکتہ چینی کرنا ہے مگر ان کو انصاف اور دیانت کے ساتھ کرنا چاہیے۔ آپ گورنمنٹ کی آگاہی اور

راہنمائی اور باشندگان ملک کی حفاظت کا آلہ نہیں بن سکتے ہیں ، آپ کی نکتہ چینی ان کے کردار پر کتنی ہی سخت کیوں نہ ہو وہ سب قبول و منظور ہوگی بشرطیکہ آپ کے اقوال میں وہ سچائی اور راستی پائی جاوے جس کی نسبت کسی شخص کو غلطی نہیں ہو سکتی ۔

(اخبار عام ۱۶ اکتوبر ۱۸۸۸ء)

پیسہ اخبار کے اداریے

پیسہ اخبار منشی محبوب عالم نے ۱۸۸۷ میں فیروز والہ سے ہفت روزہ کی صورت میں جاری کیا ، بعد ازاں یہ اخبار لاہور منتقل ہو گیا اور بیسویں صدی کے اختتام کے قریب روزنامہ بن گیا ۔ اگرچہ روزنامہ ''زمیندار'' اور ہفت روزہ 'الہلال' و 'ہمدرد' وغیرہ کے اجرا کے بعد پیسہ اخبار دب گیا تاہم یہ ۱۹۲۴ع تک جاری رہا ۔ یہ اخبار روزنامہ 'زمیندار' اور ہفت روزہ الہلال و ہمدرد وغیرہ کے اجرا سے پہلے کے دور کا اہم و نمایاں اخبار تھا ۔ اس اخبار میں لالہ دینا ناتھ ، حکیم غلام نبی، منشی احمد دین ، منشی محمد دین فوق، مولوی شجاع الدولہ اور میر جالب دہلوی ایسے لوگ کام کرتے رہے ۔ ان میں سے اکثر نے بعد میں نئے اخبارات نکالے اس اخبار کے آخری دور کے کچھ فائل موجود ہیں ۔ پہلے ادوار کے فائل نہیں ملتے، اس لیے پہلے ادوار کے اداریوں کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے ، تاہم بعض محققین کی ایسی آرا ملتی ہیں جن سے پیسہ اخبار کے اداریوں کے متعلق رائے قائم کرنے میں مدد ملتی ہے ۔ مولانا عبدالمجید سالک نے میر جالب دہلوی کی ادارت کے زمانے کے پیسہ اخبار کے متعلق لکھا ہے :

''اس زمانے میں پیسہ اخبار کے افتتاحیے نہایت پر مغز ہوتے تھے ، کیونکہ میر صاحب کی معلومات اور ان کا بے نظیر حافظہ سطر سطر میں جلوہ گر نظر آتا ۔''

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں :

''پیسہ اخبار کی دوسری خصوصیت اس کی متانت اور سنجیدگی تھی۔ اس پر سر سید کی صحافت کا پرتو تھا، اس لیے تبصروں میں ہمیشہ توازن نمایاں تھا۔

''۔۔۔ مضمون اور اداریے ان موضوعات پر لکھے جاتے تھے جن کا لوگوں کی روزمرہ زندگی کے مسائل سے تعلق تھا۔ مقالے ٹھوس ہوتے تھے۔''

(صحافت پاکستان و ہند میں)

ذیل میں روزانہ پیسہ اخبار کے آخری دور کے دو اداریے درج کیے جاتے ہیں۔ ان اداریوں سے ایک تو پیسہ اخبار کے متعلق رائے قائم کرنے میں مدد ملتی ہے دوسرے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پیسہ اخبار نے اس دور میں بھی اپنی خبروں اور اداریوں میں متانت اور زبان کی سلاست برقرار رکھی جب اردو صحافت مولانا ظفر علی خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر کے زیر اثر بہت تند و تیز ہو چکی تھی۔

"روزنامہ پیسہ اخبار

اداریہ

لاہور یوم جمعہ ۲۱ اپریل ۱۹۲۲ء

آرزوے برار

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

جنگ نے دنیا کا نقشہ بدل دیا۔ جو مظفر و منصور ہوئے انہوں نے ملک و مال پایا اور جو فتح و نصرت کے حامی اور

مددگار ہوئے انہوں نے صلہ خدمات سے سرفرازی حاصل کی - نئی نئی سلطنتیں اور انوکھی حکومتیں قائم ہوئیں - مسلمانان ہند جنہیں بخت برگشتہ نے لکد کوب حوادث بنا رکھا ہے ، ملک گیری اور کشورکشائی کا دعویٰ نہیں کر سکتے - انہوں نے اپنی تمام تر قوت دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت کی حمایت میں صرف کی اور برطانیہ سے آس لگائی کہ وہ ان کی کھوئی ہوئی شان و شوکت کی بحالی میں مدد دے اور ان کی عظمت و سطوت کا کفیل بنے -

حضور نظام اگر سنٹرل ایشیا میں ہوتے ، امیر افغانستان یا شہریار بخارا و آذربائیجان کی طرح ان کی افواج قاہرہ بھی فتوحات ملکی میں حصہ لیتیں اور ملک گیری اور نبردآزمائی کے جوہر دکھاتیں ان کی سلطنت بھی نوائے آزادی بلند کرتی اور ان کے سفرا بھی سلاطین یورپ کے درباروں میں مسند وقار حاصل کرتے - انہوں نے برطانیہ کا کے ز (مقصد) کو اپنا کاز بنایا اور ان کی فوجوں نے برٹش میدان جنگ میں سرفروشی کے جوہر دکھائے - ان کی پندرہ ملین رعایا برطانیہ کے دست کرم پر نگاہ لگائے تھی کہ ولی عہد سلطنت ان کی جانبازی کا صلہ دیں گے - اگر ملک و مال ان کے حصے میں نہ آئے ، تو حق بہ حقدار پہونچایا جائے گا اور برار کا صوبہ اس کے اصلی مالک کے سپرد کر دیا جائے گا -

پرنس آئے بھی اور چلے بھی گئے ، مگر برار نہ آیا اور نہ رعایائے دکن کی وہ پرجوش امیدیں بر آئیں جن سے ان کے قلوب گرما رہے تھے - وہ چہرے جو ہجوم آرزو سے دمک رہے تھے حسرت و یاس سے اداس ہو رہے ہیں اور سینوں میں ناکامی اور مایوسی سے دھواں اٹھ رہا ہے - جب وہ دیکھتے ہیں کہ افغانستان ، بخارا ، آذربائیجان اور دوسری بیسیوں چھوٹی چھوٹی سی ریاستیں جن کی شاید مجموعی آمدنی اور آبادی بھی سلطنت دکن کے برابر نہ ہو ،

بادشاہتیں بن گئی ہیں اور ان کے سفیر تاجداران زمن سے خراج عقیدت و توقیر وصول کر رہے ہیں ، اور پھر اپنی حالت کو دیکھتے ہیں کہ ترقی معکوس کر رہی ہے تو فطرتاً ان کو تلخ کامیٔ یاس سے ٹیس ہوتی ہے اور وہ برطانیہ کی طرف دیکھ کر کہتے ہیں کہ

لبت شکر بہ مستان داد و چشمت مئے بہ میخواران
منم کز غایت حیراں نہ با آنم نہ با اینم

سر علی امام نے برٹش گورنمنٹ کے دامن عاطفت میں پرورش پائی اور اپنی جانثاریوں اور ہوا خواہیوں سے اس رتبے کو پہنچے کہ آج گورنری کے امیدوار ہیں - اہل حیدرآباد دعا کرتے ہیں کہ ان کی آرزوئیں برآئیں اور وہ جلد گورنری پر تشریف لے جائیں - مگر وہ یہ بھی سوچنے کا حق رکھتے ہیں کہ انھوں نے جو آرزوئیں سرسید ثانی کے دامن سیاست سے لگا رکھی تھیں ، ان کے برلانے میں سرسید نے کیا سعی فرمائی ؟ کئی سال سے ملک قحط اور گرانی کے پنجۂ جفا میں تڑپ رہا ہے - وہ خزانہ جو سر جارج واکر کی حسن تدبیر سے معمور تھا ، خالی ہو رہا ہے اور پھر بھی کسی کو دو وقت پیٹ بھر روٹی نہیں نصیب ہوتی - لیکن اس کشمکش کے زمانے میں بھی ملک نے سر سید کے مطالبات کی تکمیل میں کوتاہی نہ کی اور ان کے اخراجات ذاتی کے لیے بے دریغ روپیہ خرچ کیا - حتیٰ کہ آپ جب گورنمنٹ کے کام پر انجمن اقوام میں شریک ہوئے تو نہ صرف آپ کی تنخواہ بلکہ تمام اخراجات سفر اپنی گرہ سے ادا کرتا رہا - رائٹ آنریبل مسٹر شاستری اس وقت برٹش گورنمنٹ کے نمائندے بن کر ولایت گئے ہوئے تھے مگر ان کو اس کا عشر عشیر بھی خرچ گورنمنٹ نے نہیں دیا جو حیدرآباد نے سرسید ثانی کو سفر ولایت کے لیے نذر کیا - ان کا سارا خاندان اس وقت حیدر آباد میں بڑی بڑی خدمتوں پر سرفراز ہے اور ان کو

کسی طرح کی روک ٹوک نہیں ۔ اپنے جس عزیز یا دوست کو چاہے جس خدمت پر مقرر کریں ۔ انہوں نے اضافۂ تنخواہ کی جو سکیمیں پیش کیں ان سے خزانہ خالی ہو گیا مگر حیدرآباد نے بے چون و چرا منظور کیں ۔ ہندوستان میں کیا ساری دنیا میں تخفیف اخراجات کی کوشش ہو رہی ہے ۔ ضروری محکمے توڑے جا رہے ہیں حتیٰ کہ بولشویک ریشہ دوانیوں کی روک تھام کے لیے کرنل اوکانر کی ماتحتی میں جو ضروری محکمہ خفیہ اطلاعات کا قائم کیا گیا تھا ، وہ بھی شکست کر دیا گیا کہ خرچ کم ہو اور رعایا کا بار ہلکا ہو ۔ مگر حیدر آباد میں سرعلی امام نے نئے نئے محکمے قائم کیے اور مصارف ریاست اس قدر بڑھ گئے ہیں ۔ برٹش گورنمنٹ کے مصارف کو بھی قبول کیا کہ شاید وہی انجام کار میں مدد دیں ۔ ۔ ۔ الخ"

روزانہ پیسہ اخبار

اداریہ

۲ مئی ۱۹۲۲ء

"لاہور میں بلا اجازت تعمیر مسجد
مسلمانوں کی دیکھا دیکھی مندر بھی تعمیر

ناظرین کو یاد ہو گا کہ ان کالموں میں کئی بار ایک مسجد کی تعمیر کی درخواست کا ذکر ہو چکا ہے جو لاہور میں شاہ عالمی دروازے کے نزدیک پرانی میوہ منڈی کی زمین کے سامنے مسلمانوں نے تعمیر کرنے کی تجویز کی تھی اور جس کی تعمیر کی اجازت حاصل کرنے کے لیے اب سے تقریباً ۲ سال پیشتر میونسپل کمیٹی میں درخواست دی تھی ۔

جس زمین پر مسلمانوں نے مسجد تعمیر کرنے کے لیے درخواست دی تھی اس پر ان کا عرصۂ دراز یعنی تقریباً ۴۰ سال

سے قبضہ تھا ، اور وہاں انھوں نے منڈی میں خرید و فروخت کی غرض سے آنے والے مسلمانوں کی سہولت ادائے فریضہ کے لیے ایک چبوترہ اور چھوٹی چھوٹی دیواریں اور محراب تعمیر کر لی تھی - میونسپل کمیٹی میں درخواست پیش ہو گئی مگر بعض ہندو ممبروں کی طرف سے اس کی منظوری میں رخنہ اندازی ہوتی رہی - طرح طرح کے عذر پیش کیے گئے اور درخواست کی منظوری معرض التوا میں پڑ گئی یہاں تک کہ آج تک مسلمانوں کی درخواست کو شرف منظوری حاصل نہیں ہوا -

ہندو ممبروں کی طرف سے جو اعتراضات پیش کیے گئے ان میں سے ایک یہ ہے کہ آیا یہ زمین میونسپل کمیٹی کی ملکیت ہے یا مسلمانوں کی - اس سے مراد یہ تھی کہ مسلمانوں کا جو حق قبضے کے ذریعے سے پیدا ہو گیا تھا، وہ تسلیم نہ کیا جائے اور اس طور سے یہ تعمیر نہ ہو سکے - یہ روش نہایت حاسدانہ اور مبنی بر تخریب تھی جس سے مسلمانوں کو بڑی ہی مایوسی ہوئی -

مسلمانوں کی طرف سے درخواست حصول اجازت کے متعلق جو پہلا نقشہ پیش کیا گیا اس کے مطابق رقبہ اراضی ۲۰،۱ فٹ ۱۳ انچ شمالاً ، ۱۸ فٹ ۱۶ انچ جنوباً ۱۵ فٹ شرقاً ، اور ۱۶ فٹ ۵ انچ غرباً تھا - نقشہ بغرض رپورٹ سب کمیٹی کے سپرد کیا گیا جس کے دو ممبر میاں عبدالعزیز صاحب وائس پریذیڈنٹ اور مسٹر گنپت رائے تھے جن میں سے مسٹر گنپت رائے کی رائے یہ تھی کہ عمارت مسجد ۲۱ ، ۲۲ فٹ سے زیادہ اونچی نہ ہو مگر میاں عبدالعزیز کی رائے تھی کہ بلندی ۲۵ فٹ ہو - اسی رائے سے حق ملکیت اراضی کا سوال پیدا ہوا تھا - مولوی احمد دین کی رائے تھی کہ بلندی ۲۲ فٹ رکھی جائے - اس پر ووٹ لیے گئے تو ۸ ایک طرف نکلے اور ۷ ایک طرف ، اس لیے مولوی احمد دین کی تجویز نا منظور ہوئی - خواجہ دل محمد کی تجویز تھی کہ اصل ۲۶ فٹ کی

بلندی کی اجازت دی جائے۔ مختصر یہ کہ اسی طرح بحث ہوتی رہی اور صدر کمیٹی نے اجلاس ملتوی کر دیا۔ آخری اجلاس یکم مئی ۱۹۲۲ء بروز پیر قرار پایا تھا جس میں مسلمانوں کی درخواست کا فیصلہ کیا جاتا لیکن اس سے پیشتر ہی مسلمانوں نے مسجد کی تعمیر شروع کر دی اور پیر کی صبح کو مسجد تقریباً مکمل ہو چکی تھی جس کا رقبہ حسب ذیل ہے:

۲۸ فٹ شمالاً، ۳۸ فٹ جنوباً، ۲۵ فٹ غرباً، ۲۵ فٹ شرقاً۔

مسلمانوں کی دیکھا دیکھی ہندوؤں نے ایک سبیل کو جو رقبے میں ۱۲۹ فٹ تھی، مندر کی شکل میں منتقل کرنے کے لیے تعمیر کا کام شروع کر دیا اور سبیل کی عمارت سے مغرب کی طرف جو اراضی میونسپل کمیٹی کی تھی اس کا بڑا حصہ معہ درخت پیپل کے اندر لے لیا، اور دیواریں چن کر مندر کی عمارت تعمیر کرنا شروع کر دی جو تقریباً ختم ہونے کے قریب ہے۔ اس مندر کا رقبہ بازار کی طرف ۴۹ فٹ ۹ انچ تھا، ۳۵ فٹ مغرب کی طرف، ۴۸ فٹ جانب جنوب۔

یکم مئی کی صبح کو سات بجے کمیٹی کا اجلاس ہوا مگر کورم پورا نہ ہو سکا، اس لیے بعض ہندو ممبر یہ کہہ کر کہ کورم پورا نہیں ہے، اس وجہ سے کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی، اجلاس کمیٹی سے اٹھ کر چلے گئے۔ لیکن رائے بہادر مکھی رام نے تجویز کی کہ کمیٹی کی طرف سے مسلمانوں اور ہندوؤں کے خلاف بلا حصول اجازت تعمیر مسجد و مندر کی ممانعت کے متعلق مقدمہ چلایا جائے۔ ایجنڈا میں پیشتر سے اس قسم کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ بدیں وجہ پریسیڈنٹ نے ووٹ لیے جن میں سے ۴ ووٹ حق میں نکلے اور چار خلاف اور اس طور سے اجلاس صدر کے کاسٹنگ ووٹ سے بلا کوئی فیصلہ کیے ملتوی کیا گیا۔

یہ ہے مسلمانوں کی درخواست کی حقیقت جس سے عیاں ہے کہ تقریباً دو سال میں بھی ان کی درخواست منظور نہ ہوئی اس لیے مایوسی کا شکار مسلمانوں نے کمیٹی کی پروا نہ کرتے ہوئے ۲۹ اپریل سے مسجد کی تعمیر شروع کر دی ۔ کمیٹی کو چاہیے تھا کہ وہ اتنے عرصے تک مسلمانوں کے صبر و تحمل کی آزمائش نہ کرتی ، اور جس زمین پر ان کا تقریباً چالیس سال سے قبضہ چلا آیا تھا اور جسے وہ نماز جیسے نیک فرض کے ادا کرنے کے لیے استعمال کرتے رہے تھے اس پر تعمیر مسجد کی اجازت دے دیتی ۔ گو مسلمانوں کا فعل قانون کی خلاف ورزی ہے لیکن وہ مجبوری اور مایوسی کا نتیجہ بھی ہے ۔ مگر ہندوؤں نے جو کچھ کیا وہ مسلمانوں کی دیکھا دیکھی ۔ انھوں نے میونسپل کمیٹی کو نہ تو تعمیر مندر کے لیے کوئی درخواست دی اور نہ کوئی نقشہ پیش کیا ، البتہ اب سے کچھ عرصہ پیشتر ان کی طرف سے کمیٹی میں اس مطلب کی درخواست پیش کی گئی تھی کہ ان کو کچھ اراضی کرائے پر دی جائے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کی اولوالعزمی میں زمین آسمان کا فرق ہے ۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کی دیکھا دیکھی سکھ صاحبان کو بھی جوش آ گیا اور وہ بھی ایک قطعۂ اراضی کی ناپ تول کر چکے ہیں اور ان کا ارادہ ہے کہ ایک گوردوارہ تعمیر کیا جائے لیکن اس کے لیے وہ گوردوارہ کمیٹی کے فیصلے کا انتظار کریں گے ۔ ابھی وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ سکھ صاحبان کا ارادہ عملی صورت اختیار کرتا ہے یا نہیں لیکن مسلمانوں اور ہندوؤں کا ارادہ تو تقریباً پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا ہے اور شہر کے ہندو مسلمانوں میں بڑا جوش پھیلا ہوا ہے ۔ مسلمان اینٹ گارا لاتے ہیں ۔ خدا خیر کرے اور جو جوش پیدا ہو گیا ہے اسے راہ راست پر رکھے ۔ اگر وہ صحیح راستے سے بھٹک گیا تو نہ معلوم کیا آفت لائے گا ، اس لیے ہندو مسلمان کو اس وقت بڑی احتیاط

اور ضبط سے کام لینا چاہیے۔ یہ بات خوشگوار ہے کہ ہندو مسلمانوں میں کوئی بھی کش مکش یا نزاع نہیں ؛ دونوں اپنا اپنا کام کر رہے ہیں ۔ ایک دوسرے سے کوئی تعرض نہیں کرتا ۔ گویا دونوں کا مقابلہ میونسپلٹی کے ساتھ ہے ۔ اس وقت سب سے اہم سوال یہ ہے کہ میونسپل کمیٹی مسجد اور مندر کی بلا اجازت تعمیر کے کام کو بند کرتی ہے یا نہیں ، یا ان کے انہدام کے متعلق کوئی کارروائی عمل میں لاتی ہے یا نہیں ۔ چونکہ مسلمانوں اور ہندوؤں کا فعل ایک نہایت نیک عزم کو لیے ہوئے ہے اس لیے ان کے خلاف کوئی کارروائی کرنی چاہے وہ گرفتاری کی صورت میں ہو یا مقدمہ چلانے کی صورت میں، اور چاہے وہ حکم امتناعی کی شکل میں ہو یا انہدام کی شکل میں مناسب نہیں ہوگی ، کیونکہ اس سے عام پبلک میں کمیٹی کے حکام اور گورنمنٹ کی نیت کے متعلق غلط فہمیاں پیدا ہوں گی اور نہایت برے نتائج نکلیں گے ۔ اس لیے کمیٹی اور حکام کو دور اندیشی ، معاملہ فہمی اور در گزر کرنے کی پالیسی سے کام لینا چاہیے ۔"

روزناموں کے اداریوں کے اثرات

تیسرے دور میں روزناموں میں مقررہ ادارتی صفحات پر اداریوں کی اشاعت کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ سہ روزہ اور ہفت روزہ اخبارات میں بھی اداریے واضح اور نمایاں طور پر اور مقررہ صفحات پر شائع ہونے لگے۔ بعض اخبارات میں تو لفظ 'ایڈیٹوریل' نمایاں طور پر لکھا ہوتا تھا ۔ ان کے اداریے بعض اوقات با عنوان اور بعض اوقات بلا عنوان ہوتے تھے ۔ مثلاً 'زمانہ' کانپور میں صفحہ ۵ پر پہلے کالم میں اوپر جلی خط میں 'ایڈیٹوریل' لکھا جاتا تھا ، اس کے بعد باعنوان اداریہ ہوتا تھا ۔ اس میں عموماً ایک ہی اداریہ ہوتا تھا ۔ مثلاً ۲۵ ستمبر ۱۸۹۳ء کی اشاعت میں صفحہ ۳ پر

اور قوموں میں کیا ہے
اور
اور ہم میں کیا نہیں

جلی عنوان کے نیچے دو صفحے کا اداریہ چھپا ہے :

''اس بات کا خیال کرنے سے پہلے ہم اپنے ملک کی ترقی کے اسباب صحیح طور پر دریافت کر سکتے ہیں ۔

ہمدردی — چونکہ بیشتر محبان ملک کی یہی صدا ہے کہ ہمدردی پیدا کرو ۔ اکثروں کا یہ خیال ہوگا کہ ہمارے ملک میں ہمدردی نہیں ، اور اگر ہمدردی ہے تو ہمارا ملک بھی ترقی یافتہ ہو جائے ۔

مگر یہ خیال غلط ہے، ہمارے ملک میں اس سے زیادہ ہمدردی ہے جو ترقی یافتہ ملکوں میں ہے ۔

اعزا و اقربا کے ساتھ جس گرمجوشی سے ہمارے ملک میں سلوک ہوتا ہے وہ اپنا آپ ہی نظیر ہے ۔

احباب پرستی بھی شاید کسی ملک میں ایسی نہیں ہوسکتی جو ہمارے ملک میں ہے ۔

عام نیکی و عام بھلائی جس کو ہمارے ملک کے حالات سے پوری واقفیت ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ جس قدر ہندوستانی خیر و خیرات کے عادی ہیں شاید ہی دنیا کے کوئی اور لوگ بھی ہوں ۔

ہندوستان ہی میں ایسے ایسے باہمت لوگ پیدا ہوئے ہیں اور اس وقت بھی موجود ہیں جو ایک ادنیٰ موقع میں اپنی عمر بھر کی کمائی لٹا دیتے ہیں ۔

ایک تمبا کو والا ، ایک نیچہ بند اس خیال میں ہے کہ دمڑی دمڑی پس انداز کرے اور ایک چھوٹی سی مسجد بنا جائے۔ چنانچہ سینکڑوں مسجدیں ایسی ہی اولوالعزمی اور گرمجوشی سے بنی ہیں۔''

مگر اس اخبار کی ۸ جنوری ۱۸۹۴ع ، ۱۵ جنوری ۱۸۹۴ع کی اشاعتوں میں اداریے نہیں ہیں۔

'انیس ہند' میرٹھ بھی جلی خط میں لفظ 'ایڈیٹوریل' کے نیچے باعنوان اداریہ چھاپتا تھا۔ مثلاً ۱۵ جولائی ۱۸۹۳ع کی اشاعت میں مندرجہ ذیل 'ایڈیٹوریل' چھپا ہے۔

''ایڈیٹوریل

کمال بیرحمی سے سخت گیری

یہ حیرت انگیز اور دردناک واقعہ ریلوے کے کارپردازان کی سختی اور بیرحمی کی داستانوں میں ایک یادگار قصہ ہے؛ یعنی حال ہی میں ایک مسکین عورت مع ایک صغیر سن لڑکے کے راجپورہ سٹیشن کا ٹکٹ لیے ہوئے سفر کر رہی تھی کہ قضائے الٰہی سے اثنائے راہ میں جاں بحق تسلیم ہو گئی۔ نا سمجھ لڑکا یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کو کہاں تک جانا ہے ، کئی سٹشن آگے تک چلا گیا جب ریلوے ملازمین کو یہ معلوم ہوا کہ ایک مردہ عورت اس گاڑی میں ہے تو اس کی نعش اتاری گئی اور وہ لڑکا بھی اتارا گیا۔ بجائے اس کے کہ اس مظلوم بے کس لڑکے کے ساتھ کچھ ہمدردی کی جاتی یہ سلوک اس کے ساتھ کیا گیا کہ پورے تشدد اور سختی کے ساتھ کرایہ زائد اس سے وصول کیا گیا۔ گو قواعد ریلوے کی رو سے ٹکٹ سے زائد سٹیشنوں تک چلے جانے میں کرایہ زائد وصول کرنے کا حکم ہے لیکن کس سے ؟ جس نے عمداً اپنی غفلت سے ایسی حرکت کی ہو نہ کہ ایک نا سمجھ لڑکے سے۔ مجھ کو سخت تعجب ہے کہ

ایک انسان سے اپنے ہم جنس کے ساتھ ایسا ظالمانہ برتاؤ کیسے ہوا؟ اگرچہ یہ صریحی طور پر سنگ دلی اس شخص کی ہے جس نے یہ فعل کیالیکن اس میں تمام آفس کی بدنامی ہے۔ حکام ریلوے کو ایسے امور پر خاص توجہ کرنا چاہیے اور اس امر کی خاص نگرانی رکھنی چاہیے کہ ایسی سختی نہ ہونے پائے، اور یہ زائد محصول جو اس معصوم بچے سے لیا گیا ہے قابل واپسی ہے۔ (ایڈیٹر)''

''ہمعصر کوہ نور لکھتا ہے کہ ایک انگریز کے صاحبزادہ بلند ارادہ کے ہاتھ سے ایک ہندوستانی آدمی شکار ہوا؛ اجلاس میں مسٹر کانرڈ صاحب بہادر سے مجرم پر دس روپیہ جرمانہ ہوا۔ بلحاظ اس امر کے کہ ایک قابل رعایت اہل انگلستان مجرم تھا، یہ سزا بھی سخت ہے، لیکن ہاں جو آزادی اور انصاف قانون کی رو سے ظاہر کیا جاتا ہے اس کے مطابق ضرور سزا بہت کم ہوئی، اور ایسے جرم کے ارتکاب میں اتنی سزا کا ہونا لاریب داخل بے انصافی ہے۔ یہ کچھ پہلا ہی مرتبہ نہیں ہے، اس سے پہلے بھی بعض فیصلے ایسے صادر ہوئے ہیں اور یہ مصداق کر دیا گیا ہے کہ گورے کی داد نہ فریاد گورا مار بیٹھے گا۔'' (ایڈیٹر)

پٹیالہ اخبار کے ۱۹۰۲ء، 'دبدبہ سکندری' رام پور کے ۱۹۰۱ء، نجم ہند (سہارنپور) کے ۱۸۹۴ء، سراج الاخبار جہلم کے ۱۹۰۶ء کے فائلوں سے پتا چلتا ہے کہ یہ اخبارات اگرچہ لفظ ''ایڈیٹوریل'' استعمال نہیں کرتے تھے مگر صفحہ ۲ پر اخبار کے نام کی تختی کے نیچے باقاعدہ اداریے شائع کرتے تھے۔

خلاصہ

* تیسرے دور میں روزانہ اخبارات نے زیادہ اہمیت اختیار کر لی، ان کی اشاعت بڑھ گئی، چنانچہ روزناموں کے اداریوں نے بھی اہمیت حاصل کر لی۔

* اس دور کے نمائندہ روزناموں اخبار عام اور پیسہ اخبار کے اداریے آسان اور عام فہم ہوتے تھے جنہیں کم پڑھے لکھے آدمی بھی سمجھ سکتے تھے -

* اخبار عام کے اداریے نسبتاً زیادہ مختصر ہوتے تھے ، اگرچہ اس میں کبھی کبھی طویل اداریے بھی چھپتے تھے - مگر پیسہ اخبار کے اداریے نسبتاً طویل اور خاصے جامع و مکمل ہوتے تھے- اخبار عام کے اداریوں کو پڑھ کر کچھ تشنگی سی محسوس ہوتی ہے کیونکہ وہ سرسری تبصرے کی حیثیت رکھتے ہیں مگر پیسہ اخبار کے اداریوں میں مسائل و امور پر سیر حاصل بحث کی جاتی تھی -

* اخبار عام کی ہر اشاعت میں اوسطاً چار پانچ اداریے چھپتے تھے مگر پیسہ اخبار میں کم - اس دور میں مقالۂ افتتاحیہ کا تصور واضح نہیں تھا - چنانچہ اخبار عام میں جو اداریہ شروع میں چھپتا تھا وہ بھی بعد میں چھپنے والے اداریوں کی طرح مختصر ہوتا تھا - البتہ پیسہ اخبار میں بعض اداریے افتتاحیوں کی صورت میں چھپتے تھے -

* ان اخباروں میں چھپنے والے اداریے نسبتاً جلی حروف میں لکھے جاتے تھے اور دوسرے مندرجات ان سے باریک خط میں ہوتے تھے -

* عام طور پر اداریے خبروں پر مبنی ہوتے تھے لیکن بعض اوقات ایسے اداریے بھی چھپتے تھے جو خبروں پر مبنی ہونے کی بجائے عمومی اور اصلاحی نوعیت کے ہوتے تھے -

* بیشتر اداریے باعنوان ہوتے تھے ، البتہ اخبار عام میں خاصی مدت تک یہ صورت رہی کہ پہلا اداریہ بلا عنوان ہوتا تھا اور بعد میں چھپنے والے با عنوان -

* ابتدائی روزانہ اردو اخبارات کے بعض اداریے خبروں کی

حیثیت رکھتے تھے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ خامی دور ہو گئی اور اس طرح کے اداریے چھپنے بند ہو گئے۔

* تیسرے دور کے اداریے بھی فنی اصولوں کو ملحوظ رکھ کر نہیں لکھے جاتے تھے اور نہ ہی ان کی مخصوص ہیئت ہوتی تھی، بلکہ ہر اخبار کے اداریوں میں انفرادی انداز اور رنگ کارفرما ہوتا تھا۔

* اس دور کے اداریوں میں انگریزی حکومت کی بعض پالیسیوں اور انگریزوں کی زیادتیوں پر تنقید کی گئی ہے مگر زیادہ تر اخبارات نے دبی زبان میں تنقید کی ہے؛ صرف چند اخبارات نے جرأت سے کام لیا ہے۔

چوتھا دور

حق گوئی و بیباکی

سر سید احمد کا دور اصلاح، مصالحت اور عقلیت کا دور تھا۔ سر سید اور ان کے رفقا نے ایک طرف مسلمانوں کو انگریزوں کی آتش انتقام سے بچانے کے لیے انہیں انگریزوں سے قریب‌تر لانے کی کوشش کی۔ دوسری طرف مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے کے لیے جد و جہد کی۔ اس اصلاحی تحریک نے مسلمانوں کو سیاسی اور تعلیمی اعتبار سے بیدار کرنے کے علاوہ اردو زبان، علم و ادب اور صحافت کی بھی اصلاح کی۔ دریں اثنا کانگرس قائم ہو گئی مگر سرسید احمد خاں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ کانگرس کو ہندوؤں کے مفادات عزیز ہیں اور مسلمانوں کو کانگرس کے ساتھ وابستگی سے کچھ نہیں ملے گا۔ نئی تعلیم یافتہ پود کا ذہین اور حساس طبقہ اس ملک گیر محکومی اور مختلف طبقوں کی باہمی آویزش کے اثرات محسوس کرنے کے علاوہ یہ بھی سمجھنے لگا تھا کہ مسلمانوں کا حکومت پر مسلسل انحصار درست

نہیں ہے ، کیوں کہ حکومت مسلمانوں کی وفاداری کے صلے میں
ان کے مفادات اور حقوق کا خیال رکھنے کی بجائے ان کو گھوڑے
کی پچھلی سمجھ کر من مانی کرتی ہے ۔

سر سید احمد خاں ۱۸۹۸ء میں وفات پا گئے مگر ان کے
بیشتر رفقا ابھی زندہ تھے اور ان کی تحریک کا اثر موجود تھا ۔
۱۹۰۳ء میں بنگال کی تقسیم عمل میں آئی تو ہندوؤں نے پورے
ملک میں ہنگامہ برپا کر دیا ۔ بنگال کی تقسیم کو وہ اپنے مفاد کے
خلاف سمجھتے تھے لیکن اس سے مسلمانوں کو کچھ فائدے کی
توقع تھی ۔ انھی دنوں منٹو مارلے اصلاحات کا چرچا ہوا ۔ حکومت
ہندوستانیوں کو بعض سیاسی حقوق دینے کا ارادہ رکھتی تھی ۔
ان حقوق میں سے مسلمانوں کو بھی ان کا حصہ دلانے کی
ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی ۔ اس ضرورت کے تحت
۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا ۔ حکومت نے ہندوؤں
کے دباؤ کے تحت اور اپنی مصلحتوں کی بنا پر ۱۹۱۱ء میں بنگال
کی تقسیم منسوخ کر دی ۔ حکومت کے اس اقدام سے مسلمانوں کو
سخت دھچکا لگا ۔ بقول نواب وقار الملک : ''گورنمنٹ کی پالیسی
بمنزلہ توپ خانہ کے تھی جو مسلمانوں کی مردہ لاشوں پر سے گزر
گیا ، بدون اس احساس کے کہ ان غریب لاشوں میں سے کسی میں
کچھ جان بھی ہے اور ان کو اس احساس سے کوئی تکلیف
محسوس ہوگی[۲۳] ۔'' وقارالملک ہی نے ۳۰ دسمبر ۱۹۱۱ء کو
علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں لکھا : ''آفتاب نصف النہار کی طرح
اب روشن ہے کہ ان واقعات کو دیکھنے کے بعد جو اس وقت
مشاہدوں میں آئے ، یہ مشورہ دینا کہ مسلمانوں کو گورنمنٹ پر بھروسا
کرنا چاہیے لاحاصل مشورہ ہے اب زمانہ اس قسم کا نہیں رہا ۔''

تقسیم بنگال کی تنسیخ کا زخم ابھی مندمل نہیں ہوا تھا کہ

۳ اگست ۱۹۱۳ء کو کانپور میں مسجد کی شہادت کا سانحہ رونما ہوا ۔ اس سے مسلمانوں کا احساس مظلومی و بے بسی اور شدید ہو گیا ۔ اس کے علاوہ دوسرے اسلامی ملکوں کے مسائل بھی برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں پر اثرانداز ہو رہے تھے ۔ ۱۹۰۷ء میں روس اور برطانیہ نے ایران میں اپنے حلقہ ہائے اثر قائم کر لیے ۔ سامراجی طاقتیں سلطنت عثمانیہ کو ختم کرنے کے درپے ہو گئیں ۔ ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس (لیبیا) پر حملہ کر دیا ۔ ۱۹۱۲ء میں ریاستہائے بلقان نے ترکی پر چڑھائی کر دی اور شاہ یونان نے اسے صلیبی جنگ قرار دیا ۔ پھر پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی ۔ برصغیر کے مسلمانوں اور دوسرے اسلامی ملکوں کا مستقبل ایک بہت بڑا استفہامی نشان بن گیا ۔ ان حالات میں مسلمانوں کے لیے مصالحت اور حکومت پر بھروسا کرنے کی پالیسی پر کاربند رہنا ممکن نہ رہا ۔ نتیجتاً حصول آزادی اور حقوق کے تحفظ کی جد و جہد شروع کر دی گئی ۔ ترک موالات اور تحفظ خلافت کی تحریکیں چلیں ۔ یہ پرجوش فضا عقل سے زیادہ جذبات ، فکر سے زیادہ عمل اور استدلال سے زیادہ ہنگامے کی متقاضی تھی ، اس لیے اس دور میں رہنمائی کے لیے پرجوش خطابی انداز خواہ تحریر میں ہو یا تقریر میں ، زیادہ مؤثر اور عمل آفریں ہو سکتا تھا ۔ اس دور میں جو رہنما ابھرے وہ اس صفت سے متصف تھے ۔ چنانچہ اس دور کی صحافت نے بھی نئی صورت اختیار کی اور یہ صورت تھی مبارزت طلبی ، جنگجوئی ، جرأت و بیباکی کے ساتھ اظہار خیال ۔ اس دور میں جو مسلم رہنما ، مسلمانوں کی رہنمائی ، برصغیر کی آزادی اور عالم اسلام کی چارہ جوئی کے لیے آگے بڑھے ، ان میں سے تین رہنماؤں نے جد و جہد کے لیے خطابت اور صحافت کے راستے اختیار کیے ۔ یہ رہنما تھے : مولانا ظفر علی خاں ، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد ۔ یہ تینوں رہنما دلیر ، نڈر ،

عالم ، خطیب ، سیاست دان ، ادیب ، شاعر اور صحافی بھی تھے اور انھوں نے اپنی تمام تر صلاحیتیں عالم اسلام کے اتحاد ، برصغیر کے مسلمانوں کی بہتری اور برصغیر پاک و ہند کی آزادی کے لیے وقف کر دیں ۔ مولانا ظفر علی خان نے ''زمیندار'' ، مولانا محمد علی جوہر نے ''کامریڈ'' اور ''ہمدرد'' اور مولانا ابوالکلام آزاد نے 'الہلال' و 'البلاغ' کو اپنے افکار و جذبات کے اظہار کا وسیلہ بنایا ۔ یہ تینوں صحافی چونکہ بہت سی دوسری حیثیتوں سے بھی بہرہ ور تھے ، اس لیے بہت جلد پوری صحافت پر چھا گئے اور ہر طرف انھی کا طوطی بولنے لگا ۔ حکومت کی ہاں میں ہاں ملانے والے یا اعتدال پسند ، اخبارات و جرائد دب کر رہ گئے ۔ اگرچہ ۱۹۰۲ء میں لاہور سے ہفت روزہ وطن ، ۱۹۰۴ء میں 'ہندوستان دیش' اور 'ہمالہ' وغیرہ جاری ہوئے ۔ ۱۹۱۲ء میں بجنور سے ''مدینہ'' ، لکھنؤ سے ''ہمدم'' جاری ہوا ۔ مسلم گزٹ بھی شائع ہو رہا تھا ۔ ۱۹۱۴ء میں لاہور سے مولانا سید حبیب کا روزنامہ ''سیاست'' اور اس کے بعد 'پرتاپ' ، 'بندے ماترم' ، 'کیسری ملاپ' وغیرہ جاری ہوئے ۔ مگر اس دور میں مولانا ظفر علی خان کا ''زمیندار'' ، مولانا محمد علی جوہر کے ''کامریڈ'' اور ''ہمدرد'' اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ''الہلال'' و ''البلاغ'' صحافت پر چھائے رہے ۔ حالانکہ کامریڈ ، ہمدرد ، الہلال و البلاغ ہفتہ وار تھے مگر ان کے سامنے بہت سے روزنامے ماند پڑ گئے ۔

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ لکھتے ہیں : ''ملک کی سیاست بدل رہی تھی اور بیرونی حوادث سے جذبات اس درجہ مشتعل ہو رہے تھے کہ ٹھنڈی معقولیت کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ تھی ۔ چنانچہ بیسویں صدی کے ربع اول میں اردو صحافت اور مجلہ نگاری سراپا جذبات پر آ کر کھڑی ہو گئی اور سیاسی کشمکش نے کچھ ایسی صورت اختیار کر لی کہ نہ ''دانا گورنمنٹ'' چھاپے کی آزادی قائم رکھ

سکی اور نہ ''آزاد رعیت'' اس آزادی کو ''برقرار'' رکھ سکی ۔ اس فضا نے اخبار نویسی کے جو بڑے بڑے نمونے ہمارے سامنے پیش کیے ، ان میں الہلال ، زمیندار اور ہمدرد کو نمایاں مقام حاصل ہے[۲۳] ۔''

چنانچہ بیسویں صدی کے ابتدائی پچیس تیس سال کی سب سے نمائندہ اور مؤثر اداریہ نگاری مولانا ظفر علی خاں ، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد کی اداریہ نگاری ہے اور یہ اداریہ نگاری دوسرے اور تیسرے دور کی اداریہ نگاری سے یکسر مختلف ہے ۔ زمیندار ، الہلال ، ہمدرد اور البلاغ کے اداریوں میں جذبہ و جوش نمایاں ہے ۔ یہ اداریے جرأت اور بیباکی سے لکھے گئے ۔ ان میں انگریزوں کو بالخصوص اور سامراجی طاقتوں کو بالعموم للکارا گیا ہے ۔ پاک و ہند کے مختلف طبقوں کے معاملات و مسائل پر جو اداریے لکھے گئے ان میں بھی جوش اور جذبہ نمایاں ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اداریہ نویس اپنے اپنے انداز میں سونے والوں کو پکڑ کر جھنجھوڑ رہے ہیں ۔ زبان کے اعتبار سے اس دور کے اداریوں میں ادبیت غالب ہے اور ادبیت میں بھی خطابت کا انداز کارفرما ہے ۔ اس لیے کہ یہ تینوں عظیم صحافی ادیب اور خطیب بھی تھے ۔ ان تینوں کی اداریہ نگاری کا جائزہ الگ الگ ابواب میں لیا گیا ہے ۔

جہاں تک اس دور کے دوسرے اخباروں کا تعلق ہے ان میں مولانا سید حبیب کا ''سیاست'' نسبتاً اچھا تھا ، مگر ''مقالہ نگاری' اور 'اداریہ نگاری' کے سلسلے میں اس اخبار کو کوئی خاص حیثیت حاصل نہیں تھی[۲۵] ۔'' غیر مسلموں کے اخبارات میں پرتاپ اچھا اخبار تھا ۔ اس میں مہاشے کرشن مدلل اور مؤثر اداریے لکھتے تھے ۔ ان کا لہجہ کبھی کبھی خاصا سخت ہو جاتا تھا ۔

اسی طرح بجنور کے اخبار 'مدینہ' میں نسبتاً بہتر اداریے چھپتے تھے۔ جرائد میں مولانا حسرت موہانی کا مجلہ ''اردوے معلیٰ'' بطور خاص قابل ذکر ہے۔ یہ رسالہ بنیادی طور پر ادبی و علمی تھا، لیکن مولانا اس میں سیاسی مضامین بھی لکھا کرتے تھے اور ان کا لب و لہجہ بہت تنقیدی ہوتا تھا۔ مولانا کے مضامین اگرچہ باقاعدہ اداریے تو نہیں ہوتے تھے لیکن ان کی رائے کے حامل ہونے کے باعث مؤثر ہوتے تھے اور وہی کام کرتے تھے جو اداریے کرتے ہیں۔ پھر ان کے مضامین کے موضوعات بھی اداریوں کے موضوعات کی طرح ہنگامی ہوتے تھے۔ مثلاً انہوں نے مئی ۱۹۰۷ء کے شمارہ میں ''بے چینی کے آثار'' کے زیر عنوان مضمون لکھا جس کا ایک اقتباس یہ ہے: ''ہم لوگوں کا فرض ہے کہ اس حق کے اظہار میں باک نہ کریں اور صداقت کی آخری فتح پر یقین رکھتے ہوئے راہ حق میں جو مصائب پیش آئیں ان کو بہ کشادہ پیشانی برداشت کریں اور خوب سمجھ لیں کہ آزادی کی دولت آسانی سے نہیں حاصل ہوا کرتی۔ یہ جو حکومت کے جبروت سے بظاہر تحریک حریت کو فاش شکست ہوئی ہے، اس پر افسردہ، مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں کیوں کہ ابھی تک ہماری نہ قوت مجتمع ہے نہ منظم اور اس لیے ہم کو ابھی کچھ دنوں تک ایسی بہت سی ناکامیوں اور شکستوں کو صبر و شکر کے ساتھ برداشت کرنا پڑے گا۔''

جدید دور

چوتھے دور کی اردو اداریہ نویسی کے بعض خصائص کسی نہ کسی صورت میں قیام پاکستان تک برقرار رہے لیکن ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ جدید رجحان کے آثار پیدا ہونے لگے تھے۔ اس سے پہلے جو اداریہ نویس مولانا ظفر علی خاں،

مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح بے خوف اور جرأت کا مظاہرہ نہیں کر سکتے تھے ، وہ ''اعتدال پسندی'' کا سہارا لیتے تھے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے اداریوں میں جذبات کی بجائے عقل اور استدلال کا عنصر زیادہ ہوتا تھا ۔ مگر یہ انداز اس دور کے تقاضوں کے مطابق نہیں تھا ، اس لیے یہ اداریہ نویس شہرت حاصل نہ کر سکے ۔ البتہ مولانا غلام رسول مہر نے ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۷ء تک کے عرصے میں 'زمیندار' میں جو اداریے لکھے وہ ایک جدید رجحان کی نشان دہی کرتے ہیں ۔ مگر یہ رجحان زیادہ نمایاں اس وقت ہوا جب انھوں نے روزنامہ ''انقلاب'' میں اداریہ نگاری شروع کی ۔ یہ جدید رجحان جذبہ و جوش کی بجائے منطق ، دلائل ، حقائق اور اعداد و شمار سے عبارت ہے ۔ ۱۹۳۴ء میں روزنامہ ''احسان'' جاری کیا گیا جس میں مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش نے مدلل اور مؤثر اداریہ نگاری شروع کی ۔ ان کے اداریوں میں سنجیدگی اور متانت ہوتی تھی ۔ ''احسان'' میں باری علیگ مرحوم نے ''گرد و پیش'' کے عنوان سے خبروں کا پس منظر بھی لکھنا شروع کیا اور یہ سلسلہ اردو اخبارات کے ادارتی صفحے کو مزید وقیع اور مفید بنانے کی طرف پہلا قدم تھا ۔ جن مسائل پر اداریوں میں تبصرہ نہیں کیا جا سکتا تھا ان کی وضاحت اور توجیہ ''گرد و پیش'' کی صورت میں ہو جاتی تھی ۔ اس کے بعد لاہور سے کئی اردو اخبارات جاری ہوئے ، مثلاً 'احرار' ، 'نیشنل کانگرس' ، 'زمزم' (سہ روزہ) ، 'پاسبان' ، 'مساوات' ، 'جمہور' ، 'مجاہد' اور 'انصاف' وغیرہ ۔ 'زمزم' اور 'پاسبان' میں مولانا نصراللہ خان عزیز نے مدلل اور متین اداریے لکھے ۔ 'احرار' میں مولانا چراغ حسن حسرت نے پہلی بار اداریہ نگاری کی اور زور دار اداریے لکھے ۔ ''شہباز'' میں بھی متین اور مدلل اداریے لکھے جاتے تھے ۔ انھی دنوں دہلی

سے ''الجمعیت'' جاری کیا گیا جس کے اداریے بھی متین اور سنجیدہ ہوتے تھے ۔ لکھنؤ کے اخبار ''ہمدم'' کے اداریے بھی سلیس ، متین اور پراز معلومات ہوتے تھے ۔ کلکتے کا اخبار ''عصر جدید'' بھی اداریہ نگاری کے اعتبار سے وقیع تھا ۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے 'پیغام' ، 'پیام' اور 'روزانہ ہند' میں اچھی اداریہ نگاری کی ۔ وہ سادہ مگر مؤثر اداریے لکھتے تھے اور جو کچھ لکھتے دل سے لکھتے تھے ۔ اس دور کے ہفت روزہ اخبارات میں سے دیوان سنگھ مفتون کا ''ریاست'' ، مولانا چراغ حسن حسرت کا ''شیرازہ'' اور مولانا عبدالماجد دریا بادی کا سچ (جو بعد ازاں ''صدق'' اور پھر ''صدق جدید'' بن گیا) بہ طور خاص قابل ذکر ہیں ۔ ان اخبارات کے ایڈیٹر صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ ادیب اور شاعر بھی تھے ، اس لیے ان کے اداریوں میں واقعات

کی تشریح ، توجیہ اور تفصیل بہتر طریقے سے کی جاتی تھی ۔ بعض اداریہ نویس اس دور کی طوفانی سیاست کے زیر اثر جوش و جذبہ سے بھی کام لیتے تھے ۔ مثال کے طور پر آغا شورش کاشمیری نے ''آزاد'' اور پاکستان بننے کے بعد ہفت روزہ ''چٹان'' اور بعض مراحل میں ''زمیندار'' میں جو اداریہ نگاری کی اس پر مولانا ظفر علی خاں اور مولانا ابوالکلام آزاد کا گہرا اثر ہے ۔ لیکن بحیثیت مجموعی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اردو اداریوں میں جذباتیت کم ہوتی گئی اور منطق و دلیل کے استعمال میں اضافہ ہوتا گیا ۔ اپنی تحریر میں وزن اور اثر پیدا کرنے کے لیے انہوں نے اداریوں میں اعداد و شمار ، رپورٹوں اور جائزوں کا عنصر شامل کیا ۔ بحث کو نفس مضمون تک محدود رکھنے اور غیر متعلقہ امور زیر بحث نہ لانے کا رجحان قوی ہوا ۔ اس طرح اداریہ نگاری نے فنی اعتبار سے ترقی کی ۔ ہندو اخباروں کے اداریوں کی زبان زیادہ آسان ہوتی تھی اس لیے کہ ان کے اداریہ نویس عربی اور فارسی

پر قادر نہ ہونے کے باعث آسان زبان لکھنے پر مجبور تھے - وہ ہندی اور سنسکرت کے الفاظ کثرت سے استعمال کرتے تھے اور بعض اوقات غلط زبان بھی لکھتے تھے لیکن قارئین مفہوم سمجھ جاتے تھے - اردو اخبارات کے اداراتی صفحات پر مزاحیہ کالم مستقل طور پر چھپنے لگے - ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی اور اس کے بعد 'تحریک پاکستان' نے منظم صورت اختیار کر لی - ہندوؤں نے اس تحریک کو ناکام بنانے کے لیے دوسرے ذرائع کے علاوہ ''پریس'' کی پوری قوت بھی استعمال کی - ہندوؤں نے کئی نئے اخبارات جاری کیے - مسلمانوں کے اخبارات میں سے بعض کانگرس کی پالیسی کے حامی تھے - بعض سرکردہ مسلمان صحافیوں کا بھی یہی حال تھا - چنانچہ قائداعظم نے بھی مسلمانوں کے لیے ایسے اخبارات کی ضرورت محسوس کی جو نظریہ' پاکستان اور تحریک پاکستان کی جنگ میں ہندو پریس کا مقابلہ کریں اور مسلم لیگ کے نقطہ' نظر کی تشہیر اور ترویج کریں - چنانچہ دہلی سے آل انڈیا مسلم لیگ کی مساعی سے ''ڈان'' اور ''منشور'' جاری ہوئے - اسی زمانے میں دہلی سے ''جنگ'' اور ''انجام'' جاری کیے گئے - لاہور سے پہلے ''نوائے وقت'' نکلا ، پھر ۴ فروری ۱۹۴۷ء کو ''پاکستان ٹائمز'' کی اشاعت شروع ہوئی-

اس زمانے میں جس اردو اخبار نے بہتر ، مدلل اور مؤثر اداریہ نگاری میں ایک سنگ میل کی حیثیت اختیار کی وہ ''نوائے وقت'' تھا - مولانا غلام رسول مہر نے آسان اور مدلل اداریہ نگاری کی جو روایت شروع کی تھی ، نوائے وقت کے مدیر حمید نظامی مرحوم نے اسے درجہ' کمال تک پہنچا دیا - انہوں نے اداریوں کو موضوع کے اعتبار سے مزید ہنگامی ، زبان کے اعتبار سے مزید آسان اور عام فہم بنا دیا - اس کے بعد آج تک اس میں کوئی اور بہتر تبدیلی پیدا کرنا ممکن نہیں ہوا - جدید اردو

اداریہ نگاری کے ارتقا میں مولانا غلام رسول مہر اور حمید نظامی مرحوم کے نمایاں حصہ کے پیش نظر ان دونوں کی اداریہ نگاری کا الگ الگ مفصل جائزہ لیا گیا ہے -

قیام پاکستان کے بعد

۱۴ اگست ۱۹۴۷ع کو پاکستان معرض وجود میں آیا - اس وقت ملک میں صحافت کا سب سے بڑا مرکز لاہور تھا - مشرق پاکستان میں اس وقت کوئی روزنامہ موجود نہیں تھا - کراچی میں بھی کوئی اردو روزنامہ نہیں تھا - پشاور میں الفلاح اور الجمیعت اور سرحد روزنامے تھے لیکن برائے نام - لائل پور سے 'سعادت' اور ڈیلی بزنس رپورٹ شائع ہوتے تھے مگر ان کی حیثیت علاقائی اخباروں کی تھی - لاہور سے 'پرتاپ'، 'ملاپ' 'ویر بھارت' 'بندے ماترم' 'پر بھات' 'جے ہند' اور اجیت وغیرہ بھارت منتقل ہوگئے - اور صرف زمیندار، انقلاب، احسان، شہباز، اور نوائے وقت رہ گئے - انقلاب ۱۹۴۹ع میں بند ہوگیا، شہباز پشاور منتقل ہو گیا - احسان کی مقبولیت کم ہوتی گئی - زمیندار بھی پہلا زمیندار نہ رہا اور ۱۹۵۳ع میں اس کی حیثیت اور بھی کم ہوگئی - لاہور سے آغاز، طاقت، سفینہ 'مغربی پاکستان' قاصد، تسنیم اور امروز، نوائے پاکستان، روزنامہ خاتون، ہلال پاکستان، ملت اور آفاق جاری ہوئے - آزاد کا احیا ہوا - ۱۹۵۸ع میں کوہستان لاہور سے بھی شائع ہونے لگا اور ۱۹۶۳ع میں روزنامہ مشرق جاری کیا گیا - ان میں سے بیشتر اخبارات رفتہ رفتہ بند ہو گئے - پرانے اخباروں میں سے صرف نوائے وقت کی مؤثر حیثیت نہ صرف برقرار رہی بلکہ اس میں اضافہ ہوا - نئے اخباروں میں سے امروز، کوہستان اور مشرق نے مؤثر اور اہم حیثیت حاصل کی اور اردو صحافت کی ترقی اور ارتقا میں نمایاں حصہ لیا - اگست ۱۹۴۷ع میں جنگ اور انجام دہلی سے کراچی منتقل ہو گئے -

ان کے علاوہ کراچی سے نئی روشنی ، 'انقلاب' اور مسلمان جاری کیے گئے لیکن جنگ اور انجام کے سامنے جم نہ سکے ۔ انجام نیشنل پریس ٹرسٹ میں شامل ہونے کے بعد 'مشرق' میں مدغم ہو گیا ۔ جنگ اس وقت اردو کا سب سے زیادہ کثیرالاشاعت اخبار ہے ۔ 'حریت' بھی قابل ذکر ہے ۔ پاکستان کے دوسرے شہروں سے بھی بہت سے اخبار جاری ہوئے ۔ لاہور اور کراچی کے بڑے اخبارات کے بھی دو دو تین تین جگہوں سے ایڈیشن شائع ہوتے ہیں ۔

قیام پاکستان کے بعد اداریوں میں کوئی فوری اور انقلابی تبدیلی رونما نہیں ہوئی البتہ انگریزوں ، ہندوؤں اور انگریزوں یا ہندوؤں کے ہمنوا مسلمانوں کے طرز عمل ، فرقہ واریت اور جداگانہ سیاست سے پیدا ہونے والے مسائل کی جگہ اہم قومی یا بین الاقوامی مسائل نے لے لی ۔ چنانچہ قیام پاکستان کے فوراً بعد کے اداریے عموماً اہم خبروں پر مبنی ہوتے تھے ، اگرچہ ہر اخبار متعلقہ مسئلے پر اپنے اپنے نقطہ نظر کے مطابق لکھتا تھا اور ان میں دلائل ، منطق اور عقلیت ہوتی تھی ؛ جذباتیت یا محض لفاظی نہیں ، مثلاً انقلاب نے ۲۸ مارچ ۱۹۴۸ع کو یہ اداریہ لکھا :

''عربوں اور یہودیوں کے متارکہ کی تجویز

''پریذیڈنٹ ٹرومن نے ایک تازہ بیان میں خواہش ظاہر کی ہے کہ فلسطین میں عربوں اور یہودیوں کے درمیان متارکہ ہو جانا چاہیے ۔ آپ نے اپنی تجویز کا اعادہ کیا ہے کہ ۱۵ مئی سے جب برطانیہ فلسطین سے اپنا انتداب اٹھا لے گا ، فلسطین پر مجلس اقوام کی تولیت قائم ہو جانی چاہیے ، ورنہ عربوں اور یہودیوں کے درمیان سخت خوں ریزی ہو گی جس سے نہ صرف

مشرق ادنیٰ بلکہ دنیا بھر کا امن و امان شدید خطرے میں پڑ جائے گا۔

متارکہ کی تجویز پیش کرنے کے ساتھ ہی ساتھ تولیت پر زور دینا ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر آج یہودیوں اور عربوں کو معلوم ہو جائے کہ برطانیہ کے اخراج کے بعد کوئی طاقت فلسطین پر حاوی نہ ہو گی تو وہ متارکہ بھی کر سکتے ہیں اور اپنے اختلافات کو دور کر کے اچھے ہمسایوں کی طرح زندگی بسر کرنے کا پروگرام بھی بنا سکتے ہیں۔ لیکن اگر فلسطین کو برطانوی انتداب کے بعد بھی تولیت اغیار کے ماتحت رہنا ہے تو کم از کم عرب تو ہرگز کسی قسم کی عارضی یا مستقل صلح کے لیے تیار نہ ہوں گے۔ تولیت کی تجویز سے بھی پریذیڈنٹ ٹرومن کا منشا یہ ہے کہ:

تولیت سے آخری سیاسی تصفیہ کی نوعیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ اس سے ایسی صورت حالات پیدا ہو جائے گی جو پرامن تصفیہ کے لیے ضروری ہے۔۔۔۔ الخ''

روزنامہ نوائے وقت نے ۲۹ مارچ ۱۹۴۸ء کو اسی مسئلے پر ''تولیت فلسطین کی تجویز'' کے زیر عنوان لکھا:

''امریکہ نے تقسیم فلسطین کی حمایت سے دستبردار ہو کر کم از کم وقتی طور پر منصوبہ' تقسیم کو ختم کر دیا ہے۔ مگر اس کی بجائے صدر ٹرومن نے تولیت فلسطین کی جو تجویز پیش کی ہے وہ بھی عربوں کو قبول نہیں۔ جہاں تک یو۔ این۔ او کا تعلق ہے اگر امریکہ کی خواہش یہی ہوئی تو جنرل اسمبلی تولیت فلسطین کی تجویز منظور کر لے گی اور اتحادی قوموں کی انجمن میں فیصلہ ہو جائے گا کہ فلسطین کا نظام حکومت اتحادی اقوام کی تولیت میں دے دیا جائے۔ مگر اس تجویز کو عملی جامہ پہنانا

بھی آسان نہیں ۔ ۔ ۔ عربوں کے متعلق یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ اپنی خوشی سے تولیت کی تجویز ہرگز قبول نہیں کریں گے ۔ فلسطینی عربوں کے سب سے بڑے لیڈر مفتی اعظم امین الحسینی نے اس تجویز کو مسترد کر دیا ہے اور ان کی طرف سے اس تجویز کے استرداد کے بعد کسی دوسرے عرب لیڈر سے یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ تولیت کی تجویز کو مان جائے ، یا اسے خود مان لینے کے بعد عرب عوام کو بھی اس کی منظوری پر آمادہ کر سکے گا ۔ ۔ ۔ الخ"

روزنامہ احسان نے ۳ اپریل ۱۹۴۸ع کو "نئی سازشیں اور نیا فلسطین" کے زیر عنوان اسی موضوع پر یوں لکھا :

"فلسطین کا سوال اگرچہ بظاہر مشرق وسطیٰ کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے سے تعلق رکھتا ہے ۔ لیکن حقیقت میں تمام بڑی طاقتوں کی رقابتوں کا نہایت خطرناک میدان آج کل یہی علاقہ بنا ہوا ہے ، اور دنیا کے امن و جنگ کا بہت بڑا انحصار آج اسی پر ہے ۔ پچھلے دنوں جب امریکہ نے اس علاقے کو یہود و عرب کے درمیان تقسیم کر ڈالنے کے نا قابل عمل فیصلے سے دستبردار ہونے کا اعلان کیا تو خیال تھا کہ شاید یہ گتھی جلد سلجھ جائے گی ، لیکن اب امریکہ جو نئی تجویز سامنے لا رہا ہے اس سے صورت حال روبہ اصلاح ہونے کی زیادہ توقع نہیں ۔ ان نئی تجاویز سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ امریکہ نے تقسیم فلسطین کی حمایت نیک نیتی اور عربوں سے ہمدردی کی وجہ سے ترک نہیں کی ، بلکہ بین الاقوامی سیاست میں اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کے لیے ایک نیا پینترا بدلا گیا ہے ۔ جہاں تک امریکہ کی اس تجویز کا تعلق ہے کہ فلسطین کو یو ۔ این ۔ او ۔ کی "امانت" میں دے دیا جائے ، ہمیں سو فی صدی یقین ہے کہ عرب اس تجویز کو کسی

نہیں رکھ سکے گی -

ایک اور مثال

ان اداریوں کے اسلوب ، انداز فکر اور دلائل میں فرق ہے ، لیکن ان سب کا مقصد ایک ہے اور اس وقت کے اہم واقعے پر مبنی ہیں - روزنامہ ''سفینہ'' نے ۲۹ مارچ ۱۹۴۸ع کی اشاعت میں یہ اداریہ لکھا :

''اردو کانفرس میں کام کی باتیں

۲۶ مارچ کی شبینہ نشست میں تین مقالے پڑھے گئے : (۱) ڈاکٹر تاثیر کا مقالہ (۲) خواجہ احمد شفیع کا مقالہ (۳) پروفیسر کلیم کا مقالہ - زبان اور زبان آرائی کا جہاں تک تعلق ہے ، خواجہ صاحب کا مقالہ بہت ہنگامہ آفریں تھا ، اور جہاں تک ادب کی اسلامی قدروں کا تعلق ہے پروفیسر کلیم نے اردو زبان ہی نہیں مسلمان جس قدر زبانیں بولتے اور لکھتے ہیں ان کے متعلق داد تحقیق دی - لیکن جہاں تک اردو زبان کے مستقبل کا تعلق ہے ، ڈاکٹر تاثیر نے بہت پتے کی بات کی - تاثیر کو اردو سے زیادہ انگریزی پر عبور ہے لیکن وہ انگریزی سے زیادہ اردو سے محبت کرتا ہے اور ایک حساس اور سیاسی آدمی کی طرح رات اس نے اردو کی حمایت میں انگریزی سے بے وفائی کا اظہار کیا ہے -

اس کی تجویزیں ایسی ہیں کہ ان پر یونیورسٹی اور وزارت تعلیم کو فوراً توجہ کرنی چاہیے - وہ چاہتا ہے کہ اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم بنا لیا جائے - اس کے نزدیک زبان کی بے مائگی روا علمی اصطلاحوں کی کمی عذرات لنگ ہیں - اس نے انگریزی کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ جب انگلینڈ میں یہ تحریک شروع ہوئی اس وقت وہاں اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ لاطینی تھا - اس کا اعالی ادب لاطینی میں تھا - فلسفہ اور سائنس کا نصاب لاطینی میں تھا - اور

اب بھی لاطینی ہی کی اصطلاحیں ان میں درج ہیں - لیکن یہ دونوں عذر بےکار ثابت ہوئے اور انگریزی ذریعہ' تعلیم بن گئی - پھر اردو کے متعلق انھوں نے جامعہ عثمانیہ کی مثال دی اور بتایا کہ وہاں ذریعہ' تعلیم اعلیٰ جماعتوں تک اردو میں ہے اور وہاں کے گریجوئیٹ کسی ایسی یونیورسٹی کے گریجوئیٹ کے ذہنی اور فکری رتبے میں کم نہیں جہاں ذریعہ' تعلیم انگریزی ہے -

دوسری بات اس نے رسم‌الخط کے متعلق کہی کہ ہمیں فوراً خط نسخ قبول کر لینا چاہیے - اس بارے میں ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ خط نسخ سے پاک و ہند کا کوئی مسلمان ناواقف نہیں - قرآن پاک سب سے بڑا واسطہ ہے جو ہمیں خط نسخ سے متعارف کراتا ہے - پھر امتحانات کے پرچے نسخ میں ہوتے ہیں اور کسی طالب علم کو اس سے کوئی تکلیف نہیں ہوتی - تاثیر چاہتا تو اس باب میں اور بھی تفصیل اور بحث کر سکتا تھا اور بحث کا یہ پہلو شاید اس کی نظر سے رہ گیا کہ نسخ خط اختیار کر لینے سے ہماری زبان کی ظاہری مشابہت تمام اسلامی ملکوں کی سرکاری و دفتری زبانوں سے ہو جائے گی - افغانستان ، ایران ، شام ، فلسطین ، عراق ، مصر ، لیبیا ہر جگہ یہ خط رائج ہے ، اس لیے یہ خط ہمیں سیاسی فائدہ بھی پہنچائے گا - اور اگر ہندوؤں کا سب سے بڑا لیڈر اردو کی تمام خوبیوں کے باوجود یہ کہہ کر اس سے آنکھیں پھیر لیتا ہے کہ اس کا رسم الخط قرآن کے رسم الخط کا ہے تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ قرآن ہی کا رسم الخط اپنائیں - اس ضد سے نہیں کہ کسی نے کیا کہا بلکہ اس محبت کی بنا پر جو انھیں کلام اللہ کی ظاہری صورت یعنی عربی رسم الخط سے ہے اور اب زبان کا مسئلہ قطعاً انھی کے ہاتھ میں ہے - اور یہ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ پشتو اور سندھی زبانوں میں خط نسخ پہلے ہی رائج ہے - تاثیر نے لتھو کی طباعت اور کتابت کا ذکر

بھی کیا ۔ اس پر شیخ عبدالقادر صاحب بالقابہ نے فارسی کا ایک لطیفہ سنا کر مجلس کو ہنسایا . . .''

روز نامہ احسان لاہور نے یکم اپریل ۱۹۴۸ع کو اسی موضوع پر یوں لکھا :

''پنجاب یونیورسٹی کی اردو کانفرنس
شان و شوکت کا بے روح مظاہرہ

اگر کانفرنس کے معنی یہ ہیں کہ کچھ مخصوص افراد اپنے چند حاشیہ نشینوں کے ذوق خودنمائی کو پورا کرنے کے لیے بڑے سے بڑا ڈھونگ رچائیں اور عوام کا نام لے کر اپنے ذاتی افتخار کی کلاہ میں ایک طرے کا اضافہ کر لیں تو ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ پنجاب یونیورسٹی کی اردو کانفرنس (جو ۲۶ سے لے کر ۲۸ مارچ تک جاری رہی) بڑی شاندار کانفرنس تھی ۔

علم و ادب کے نام پر رنگ و نغمہ کی دنیا میں بسنے والے وہ چند نواب منش افراد جو پچھلی سیاسی تحریک میں عوام کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تھے ، انھوں نے اپنے چند حاشیہ نشینوں کی مدد سے ایک خوبصورت سٹیج آراستہ کر کے اور زرق برق لباس کی جلوہ ریزیاں دکھا کر اپنی اداکاری کے کمال خوب دکھائے ۔ انھوں نے خوب بن ٹھن کر ایک تماشا کیا ۔ لیکن خدا کی وہ بھولی بھالی مخلوق جو دور کے ڈھول سن کر ہزاروں سہانے خواب دیکھتی ہوئی اس تماشے کی طرف ٹکٹکی باندھے کھڑی تھی ، اسے آخر میں اپنے محبوب خوابوں کی تعبیر صرف یہ نظر آئی کہ ع

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

راقم الحروف کے لیے اس قسم کے تماشے دیکھنے کا یہ پہلا موقع نہ تھا ، تاہم اس غلط فہمی کا اعتراف ہمیں بھی کرنا چاہیے

کہ ہم نے سمجھا تھا کہ شاید اب پاکستان بن جانے کے بعد ذاتی نمود و نمائش کے جاہلی مظاہروں کے پرانے چکر سے ہم اونچے اٹھ چکے ہوں گے اور کم از کم موجودہ نازک دور میں صحیح عوامی سپرٹ کے ساتھ پاکستان کے بہترین مفاد کے لیے نئے جوش و خروش کے ساتھ میدان میں اتریں گے ، لیکن ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اس کانفرنس کا اصل مقصد صدارتیں کرنا ، خطبے سنانا ، تقریربازی کے جوہر دکھانا ، مقالے پڑھنا یا مشاعرے کرنا نہ تھا مگر اس کے باوجود کچھ مہرے بھی تھے جو مخصوص اغراض کے تحت انہیں میدانوں میں دوڑائے گئے ۔ اس سے معدودے چند افراد کے ذاتی جذبات نمود و نمائش کو تو یقیناً تسکین ہو گئی مگر جن بلند مقاصد کے نام پر پاکستانی عوام نے اس کانفرنس کا خیر مقدم کیا تھا وہ مجروح ہو کر رہ گئے ۔ عوام تو یہی سمجھتے تھے کہ اس کانفرنس میں پاکستان کے مختلف گوشوں کے درمیان ربط و ضبط پیدا کرنے اور مشرق و مغرب کو قومی اور ملی اتحاد کی ایک لڑی میں پرونے کے لیے اردو کو بطور ایک طاقتور ''وسیلۂ ارتباط'' اختیار کرنے کی منظم کوشش کی جائے گی لیکن اس کانفرنس میں کچھ ہوا ہی نہ ہوا ۔

اس وقت سب سے اہم سوال بنگال (اور بنگال کے بعد سندھ) کا تھا جہاں اغیار نے پاکستان کو تباہ کرنے کے لیے مقامی زبانوں کو فروغ دینے کے پردے میں انتشار و افتراق کا جھنڈا بلند کر رکھا ہے ۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ کانفرنس اس معاملے میں کوئی مؤثر رہنمائی کرے گی اور پھر اس رہنمائی کے مطابق مبلغانہ سرگرمی کے ساتھ کوئی عملی پروگرام بنا کر میدان میں آترے گی ، لیکن کچھ بھی نہ ہوا اور آج اس کانفرنس کے بعد بھی ہم ٹھیک

اسی نقطے پر ہیں جہاں اس کانفرنس سے پہلے تھے۔

دنیا کہیں سے کہیں نکل گئی مگر ہم ابھی تک خطبوں، تقریروں اور ضیافتوں ہی کے چکر کو قومی خدمت کی آخری منزل سمجھے ہوئے ہیں۔ آج عوام سے براہ راست رابطہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ عوام کے ساتھ گھل مل کر ان میں قومی اور ملی شعور کے صحیح احساسات کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔ من و تو کے امتیاز کو توڑنے کی ضرورت ہے۔ مگر اس کانفرنس کے کارکنوں نے ۱۹۴۸ء کے تیسرے مہینے میں آزاد پاکستان کے آزاد عوامی جھنڈے کے سایے تلے ہونے کے باوجود پچھلی صدی کی فرسودہ ڈگر سے ایک انچ قدم آگے نہیں بڑھایا۔ وہی پرانی ادائے انجمن آرائی کہ دس بیس رئیس منش افراد نے چند گھنٹوں کے لیے رقص و نغمہ کی فضا میں اپنے آشیانوں سے سر نکلا، اپنے بال و پر کی چمک دکھائی اور پھر ادائے بے نیازی کے ساتھ اپنے کاشانوں میں روپوش ہو گئے۔

ہم اس بات کے منتظر تھے کہ بنگال کی موجودہ خطرناک کشمکش کے پیش نظر عام بنگالیوں کو اردو کے اغراض و مقاصد سے روشناس کرنے کے لیے مجاہدوں اور سپاہیوں کی رضاکارانہ خدمات سرانجام دینے کی غرض سے آگے بڑھنے کا کوئی پروگرام بنایا جائے گا۔ یہی صورت سندھ میں کی جائے گی اور انہیں واضح طور پر یہ بتایا جائے گا کہ آج حالات کے تقاضے کیا ہیں۔ پنجاب کے دور افتادہ دیہات و قصبات میں بھی ملت کی شیرازہ بند طاقت کو برقرار رکھنے کے لیے مناسب رہنمائی کی جائے گی۔ مگر ہوا یہ کہ چند لوگ اٹھے، کچھ تقریریں کیں، کچھ ایڈریس لیے، کچھ قصیدے سنائے گئے، کچھ ضیافتیں ہوئیں، کچھ مسکرا کر ادھر آدھر دیکھا گیا اور سمجھ لیا گیا بس معرکہ سر ہو گیا؛ اب

آگے حکومت جانے اور حکومت کا کام...

اس کانفرنس کا کام یہ ہونا چاہیے تھا کہ انگریزی کی لعنت سے (جو ذہنی غلامی کی بدترین شکل ہے) ملک کو فوراً نجات دلائی جاتی مگر یہاں بھی بھوکا بیل جہاں تھا وہیں رہا۔ سبجکٹ کمیٹی کے کلغی پوشوں نے یہ ریزولیشن پیش کیا کہ یونیورسٹی میں اردو لازمی نہیں انتخابی مضمون ہو۔ مگر مجلس عام میں جب اس پر لے دے ہوئی تو چار و ناچار سپر ڈال دی گئی یعنی اس ریزولیشن میں یہ ترمیم کی گئی کہ اردو انتخابی نہیں لازمی مضمون ہو، لیکن اس کے باوجود اخباروں میں وہی پرانا ریزولیشن بھیج دیا گیا، اور کہا یہ جا رہا ہے کہ مجلس عام نے اصل ریزولیشن میں جو ترمیم کی وہ ناجائز ہے۔

جائز و ناجائز کی اس اصطلاحی بحث سے قطع نظر اصل سوال یہ ہے کہ کیا یہی وہ معرکہ ہے جسے سر کرنے کے لیے اردو کانفرنس کے نام پر اتنا بڑا ناٹک رچایا گیا، حالانکہ ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں سالہا سال سے اردو انتخابی مضمون ہے۔ پھر کیا پاکستان بن جانے کے بعد ہماری پرواز یہی ہے کہ ہم اپنی یونیورسٹیوں کو ہندوستانی یونیورسٹیوں کی سطح پر لے آئیں؟

اگر یہی کرنا تھا تو کون سا انتخابی فیصلہ تھا جس کے لیے کانفرنس کا ڈھنڈھورا پیٹ پیٹ کر چاروں صرف عوام کو آواز دی گئی؟ یہ کام تو یونیورسٹی کا سینٹ اور سنڈیکیٹ بھی کر سکتا تھا۔

اس کانفرنس کو ایک چیز یہ بھی طے کرنی تھی کہ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں انگریزی کی بجائے اردو کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے۔ مگر یہاں بھی فیصلہ یہی ہوا جو اس کانفرنس کی ہلڑ بازی کے بغیر ہو سکتا تھا۔ یعنی فی الحال انگریزی ہی کو

باقی رکھا گیا اور دلیل یہ دی گئی کہ ہندوستان والوں نے بھی ایسا ہی کیا ہے ۔ پھر کیا عوام کو یہی دلیل سنانے کے لیے جمع کیا گیا تھا ؟ آخر اس دلیل میں کون سی ندرت اور جدت تھی جس کے لیے قوم کا ہزاروں روپیہ ضیافتوں ، دعوتوں پر لٹا دیا گیا ؟

بات ذرا تلخ ہے ، لیکن ان حالات میں ہم اس تلخ بات کو کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس کانفرنس نے قومی مفادات و مطالبات کو پاؤں تلے روند کر صرف چند افراد کی ذاتی نمود و نمائش کی جاہلی ہوس کو قوم کی متاع عزیز لٹا کر پورا کیا یا اپنے آن چند حاشیہ نشینوں کی ذاتی اغراض کی تکمیل کا سامان فراہم کیا گیا ہے جو یہ آس لگائے بیٹھے ہیں کہ تعلیمی اداروں میں اردو کے نام پر کچھ ''حلوے مانڈے'' کی تقسیم ہو اور وہ اس میں اپنا حصہ طلب کر کے اس چند روزہ زندگی میں دو روزہ عیش و راحت کا کچھ وسیلہ تلاش کر لیں ۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ؎

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز
گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفت است''

جس ''زمیندار'' نے انقلابی اور پرجوش اداریہ نگاری کا آغاز کیا تھا ، اس دور میں اس کے اداریوں میں بھی جدید رنگ نظر آنے لگا ، مثلاً :

''کاشت کار اور غیر کاشت کار

سرحد اسمبلی نے قانون انتقال اراضی کے متعلق ایک ترمیم منظور کر لی ہے ۔ حقیقت میں یہ ترمیم نہیں بلکہ ایک نیا قانون ہے جس کے باعث قانون انتقال اراضی خود بخود ختم ہو گیا ۔ اس قانون کا مقصد یہ تھا کہ زمین وہی قبیلے خرید سکتے ہیں جنھیں زراعت

پیشہ قرار دیا گیا ہے ، لیکن زیر بحث ترمیم کے بعد کاشتکار اور غیر کاشت کار کی تمیز مٹ گئی - ہر مسلمان زراعت پیشگی کے حقوق حاصل کر سکتا ہے -

اسلامی مساوات کے مطابق یہ فیصلہ قابل تحسین ہے اور اس کا خیر مقدم کرتے ہیں - اس مساوات پر کوئی خطرہ تو پیدا ہونے کا احتمال نہیں ؟ اس بات پر خان عبدالقیوم خاں سواتی کے سوا کسی نے غور نہیں کیا - انھوں نے کہا : اگر کاشتکار اور غیر کاشتکار کی تمیز مٹ گئی تو کیا سرمایہ دار شہری غریب کاشتکاروں کی زمینوں پر قبضہ نہیں کر لیں گے ؟ یہ فیصلہ نظرانداز نہیں کیا جا سکتا - قانون انتقال اراضی اس لیے بنایا گیا تھا کہ بنیے زمین خرید خرید کر کاشتکاروں کو بھوکے مارنے لگے تھے - اس لوٹ کھسوٹ کا راستہ بند کرنے کے لیے یہ قانون بنایا گیا - اب اگرچہ ہندو بنیے سرحد سے جا چکے ہیں ، لیکن مسلمان بنیئے تو موجود ہیں - جہاں تک بنیے پن کا تعلق ہے مسلمان کسی صورت میں ہندو سے کم خطرناک نہیں ہوتا - ہمیں بتایا جائے کیا سرحدی بنیئے غریب کسانوں کی زمینیں خرید کر ان کا مستقبل تباہ نہ کر دیں گے ؟ مساوات پسندی کا یہ ثبوت نہیں کہ قانون انتقال اراضی کا گلا گھونٹ دیا جائے - حقیقی مساوات یہ ہے کہ ایسا قانون نافذ کیا جائے جس کی رو سے وہی شخص کاشتکارانہ حقوق حاصل کر سکے جو خود کھیتی باڑی کرتا ہو ، تاکہ عشرت پرست جاگیرداروں کے پنجے سے نجات مل سکے اور بنیے پن کی متوقع زمینداری کا رستہ روکا جائے - یہی ایک طریقہ ہے جس سے زراعت کو ترقی نصیب ہو سکتی ہے اور مساوات کے اصول پر عمل ہو سکتا ہے ورنہ زیر بحث ترمیم تو غریب کسانوں کی بوجھ سے دبی ہوئی گردن کے لیے چھوری ثابت ہو گی[۲۶] -''

عوام اور عوام کے مسائل

قیام پاکستان کے بعد اداریوں کے موضوعات اور نوعیت میں قابل ذکر تبدیلی روزنامہ 'امروز' نے پیدا کی ۔ نوائے وقت نے چونکہ تحریک پاکستان میں سرگرمی سے حصہ لیا تھا ، اس لیے قیام پاکستان کے بعد اس کا پاکستان کی تعمیر و ترقی اور نظریہ' پاکستان کی حفاظت کے لیے نسبتاً زیادہ جوش و خروش سے کام کرنا ایک قدرتی امر تھا ۔ امروز چونکہ اشتراکی راہنما میاں افتخارالدین کی قائم کردہ کمپنی ''پروگریسو پیپرز لمیٹڈ'' کے زیر اہتمام جاری ہوا تھا ، اس لیے اس کی پالیسی کا سنگ بنیاد ان مقاصد پر تھا :

۱ ۔ پاکستان کے محنت کشوں ، کسانوں اور مزدوروں کی بھلائی اور جاگیرداری اور سرمایہ داری کی مخالفت ۔

۲ ۔ بین‌الاقوامی سطح پر سامراجی طاقتوں کی مخالفت اور سوشلسٹ بلاک کی حمایت ۔

۳ ۔ ثقافت اور فنون لطیفہ کی حوصلہ افزائی اور فروغ ۔

امروز کے اولین مدیر مولانا چراغ حسن حسرت اعلیٰ پایہ کے ادیب ، شاعر، مزاح نگار اور زباندان تھے۔ چنانچہ اس اخبار نے اردو صحافت میں جدید میک اپ کا عنصر داخل کرنے کے علاوہ اردو اداریے کو عوامی بنانے میں بھی حصہ لیا ۔ امروز کے اولین اداریے میں کہا گیا کہ :

''پاکستان میں اور آسائشوں کی کمی ہو تو ہو ، اردو اخبارات کی کمی نہیں ۔ شاید ہی کوئی سیاسی عقیدہ یا سماجی مسلک ایسا ہو گا جس کا کوئی نہ کوئی ترجمان پاکستان کے کسی نہ کسی گوشے میں موجود نہ ہو۔ ہم نے ان اخبارات کی تعداد میں اضافہ کرنا کیوں ضروری سمجھا ؟ وہ کون سے

مسائل یا مباحث ایسے ہیں جو ابھی تک ہماری نظر میں مزید تشریح و تفسیر کے محتاج ہیں ۔ ہمیں یہ کہنے میں تامل نہیں کہ کوئی ایسا اچھوتا مسئلہ ہمارے پیش نظر نہیں ہے ۔ جو باتیں ہمارے دل میں ہیں وہی ہر ایک کے دل میں ہیں اور جو مسائل ہمارے سامنے ہیں وہی سب کے سامنے ہیں ۔ اگر کوئی بات ہے تو صرف اتنی کہ ہماری قوم اور ہمارے دیس کے لیے ان مسائل کی اہمیت اس نوع کی ہے کہ ان پر بحث اور ذکر و فکر اور محاسبے کی نہ صرف بہت کچھ گنجائش باقی ہے بلکہ ہمیشہ باقی رہے گی ۔ ۔ ۔ ۔

ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے پڑھنے والے اپنے دیس اور باقی دنیا کے حالات کا صحیح اور بے لاگ اندازہ کر سکیں ، اس لیے کسی خاص عقیدے یا نقطۂ نظر کو ان پر ٹھونسنے کے لیے خبروں میں ملمع اور رنگ سازی سے احتراز کیا جائے ۔ ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ موجودہ حالات میں دنیا کی کوئی قوم اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ چن کر بسر اوقات نہیں کر سکتی ، اس لیے پاکستان کے عوام کو اپنے مسائل اور سیاسی مسالک کو ایک حد تک باقی دنیا کے مسائل اور مسالک کے ساتھ منطبق کرنا ہوگا۔ اس کے لیے دنیا کے بدلتے ہوئے سیاسی نقشے پر ان کی نظر جمی رہنی چاہیے ۔ ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی سب سے بڑی دولت ہمارے وسیع میدان اور فلک آشنا پہاڑ ، ہمارے لہلہاتے ہوئے کھیت ، بہتے ہوئے دریا ، ہماری مدفون معدنیات یا معلوم دنیوی ذخائر نہیں ، ہماری سب سے بڑی دولت ہمارے عوام ہیں ۔ پاکستان کی عظمت اور خوشحالی کے سب سے اہم کفیل وہی ہیں اور اس عظمت اور خوشحالی کا وارث اول بھی انہی کو ہونا چاہیے ۔ اس لیے ہمیں لازم ہے کہ ہر سیاسی ، سماجی یا اقتصادی مسئلے کو انہی شاکر اور بے زبان عوام کی نظر سے دیکھیں ۔ ان کے مسائل لا تعداد ہیں ۔ پاکستان کی حکومت ہماری قومی حکومت

ہے اس لیے آج کل سب لکھنے والوں کو ایک دہری سفارت سپرد ہے ۔ عوام کی سفارت حکومت کے ایوانوں میں اور حکومت کی سفارت عوام کی مجالس میں ۔ اس سفارت میں تنقید کا حق بھی شامل ہے ۔ کوئی سفیر یا کوئی نقاد اپنی ذات کو اپنے خیالات اور اعتقادات سے الگ نہیں کر سکتا ۔ ہمیں بھی یہ دعویٰ نہیں ہے ۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے ضروری ہے کہ اول پاکستان کے عوام کے سیاسی اور جمہوری حقوق کا پورا تحفظ ہو ۔ دوم پاکستان کے مادی ذرائع اور ذخائر کی پوری درآمد اور اکتساب اور منصفانہ تقسیم کی جائے ۔ یہ دونوں باتیں اس وقت تک ممکن نہیں جب تک داخلی اور خارجی طور پر امن و آشتی کی بنیادیں مستحکم اور استوار نہ ہوں اور دنیا کا کوئی حصہ بدامنی اور خوف سے اس وقت تک مصئون نہیں جب تک تمام اقصائے عالم میں امن ، آزادی اور جمہوریت کے دشمن مغلوب نہیں ہو جاتے ۔''

(۴ اپریل ۱۹۴۸ء) لاہور

اگلے سال کراچی سے 'امروز' کا ایڈیشن شائع ہونے لگا تو اداریے میں انھی عزائم اور مقاصد کا اعادہ کیا گیا :

''۔ ۔ ۔ ۔ اخبارات کی کثرت کے باوجود ، عوام کے سینے میں اب بھی کئی داغ ہیں جو دیکھے تو جاتے ہیں دکھائے نہیں جاتے ۔ غربا کے سیاہ خانوں میں سے اب بھی کئی نالے بلند ہوتے ہیں جو سننے میں تو آتے ہیں سنائے نہیں جاتے ۔ ہم اپنے قلم اور اپنی آواز کو اس مصرف میں لانا چاہتے ہیں اور اس کام میں ہمیں ہر اس رفیق کی اعانت مطلوب ہے جو اس خدمت میں مشغول ہے ۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اخبار و معلومات کے نشر و ترسیل کے علاوہ ہمیں کچھ کہنا بھی ہے ، وہ گفتنی بھی ہے اور

شنیدنی بھی - روزانہ اخبار اور باتوں کے علاوہ کسی سیاسی کارکن کا کاغذی پیرہن بھی ہوتا ہے - ہر سیاسی کارکن کے وجود کا سب سے بڑا جواز اس کا سیاسی مقصود ہوتا ہے - بشرطیکہ ذاتی اغراض اور شخصی مروتیں اور رقابتیں منتہائے مقصود کو نظر سے اوجھل نہ کرنے پائیں -

آج کل ہماری سیاست کا قافلہ جس منزل سے گزر رہا ہے اس میں قدم قدم پر اس نوع کے کئی سخت مقام آتے ہیں - کہیں اہل ہوس کمینگاہوں میں چھپے بیٹھے ہیں ، کہیں اہل غرض چھاؤنی ڈالے پڑے ہیں - ان کی ہر یلغار کے بعد قافلے میں کھلبلی سی مچ جاتی ہے - حدی خوانوں کے نغمے شور میں ڈوب جاتے ہیں اور نشان سراسیمہ قدموں کے بو قلموں نقوش میں کھو جاتا ہے - موجودہ دور میں سیاسی مسلک کے اختلاف سے قطع نظر ہر سیاسی کارکن کا پہلا فرض یہی ہے کہ قومی سیاست کو شخصیات کے اس چکر سے آزاد کرے - پاکستان میں کسی نوع کے سیاسی شعور کا ارتقا اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک سیاسی جہد و کاوش کی بنیاد دوبارہ مسلک اور اصول پر نہ اٹھائی جائے - ہم نے اب تک حسب مقدرت اس کے لیے سعی کی ہے - - - اگر ہماری سیاست ذاتیات اور دھڑے بندیوں کی بھول بھلیوں سے نکل کر خالص سیاسی اصولوں کی ڈگر پر چل نکلے تو صحیح اور غلط راستوں کا تعین کرنا کوئی مشکل بات نہیں - یہی وجہ ہے کہ وہ سیاسی عناصر جنہیں خدشہ ہے کہ اگر قافلہ والوں نے اپنی منزل کا سراغ پا لیا تو وہ جھوٹے راہنماؤں کو الگ ہٹا کر آگے بڑھ جائیں گے ، سیاسی راستوں کی مسلسل ذاتی جنگ و جدال کو اصول میں چھپانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں - لیکن اس قسم کے کھیل بہت دن نہیں چلا کرتے - ہمیں یقین ہے کہ پاکستان کے عوام کو بہت جلد یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ کون سا راستہ محض

محلات اور تعیش گاہوں کے گرد و پیش گھوم کر وہیں ختم ہو جاتا ہے اور کون سی شاہراہ عوام کے بے چراغ جھونپڑوں اور بے در و دیوارگھروں سے امن، آزادی ، جمہوریت اور فلاح کی اس منزل کی طرف جاتی ہے۔''

(۸ جون ۱۹۴۹ء) کراچی

'امروز' میں مارچ اور اپریل ۱۹۴۸ء کے دوران میں پینتالیس اشاعتوں میں تیرہ اداریے غریب اور عام لوگوں کے مسائل پر لکھے گئے ، جن میں اس کی مخصوص پالیسی کے تحت غریبوں اور محنت کشوں کے مسائل حل کرنے پر زور دیا گیا۔ امروز نے اردو صحافت میں بائیں بازو کے نظریات داخل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ لاہور میں 'امروز' کے بعد کوہستان نے مقبول عام اخبار کی حیثیت سے کامیابی حاصل کی، چنانچہ اس نے سوشلزم سے بے تعلق رہتے ہوئے عوامی مسائل کو ادارتی کالموں میں زیادہ سے زیادہ جگہ دی۔ کوہستان کے بعد 'مشرق' مقبول عام اخبار کی حیثیت سے منظر عام پر آیا اور اس نے بھی ادارتی کالموں میں عوامی فلاح و بہبود پر زور دیا۔ کراچی میں جنگ اور انجام نے مقبول عام صحافت کی طرح ڈالی اور جنگ بالآخر ملک کا سب سے کثیرالاشاعت اخبار بن گیا۔

جدید اردو اداریہ اور اداریہ نویسی کے جدید رجحانات پر تفصیلی بحث الگ باب میں کی جا چکی ہے ، یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ جدید اردو اداریہ عوام کے زیادہ قریب ہے ، اگرچہ زبان و بیان اور جامعیت کے اعتبار سے اس میں تنزل واقع ہوا ہے۔ حمید نظامی نے ۱۹۵۵ء میں کہا تھا کہ :

''جہاں تک علم اور معلومات کا تعلق ہے ، میرا خیال ہے کہ موجودہ صحافت نے بہت ترقی کی ہے۔ گو 'سالک' 'مہر' اور

حسرت کے علمی معیار کے آدمی گزشتہ دس سال سے نہیں آئے ، مگر جہاں تک ٹکنیکل معلومات کا تعلق ہے ، چونکہ زمانہ ترقی کر گیا ہے اس لیے ترقی ہوئی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ مضمون میں ادبیت کم اور اخباریت زیادہ ہوتی ہے[۲۷]"

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے یہی بات ذرا مختلف انداز میں یوں کہی ہے :

"تقسیم سے پہلے برصغیر پر ایسے صحافی چھائے ہوئے تھے جو بیک وقت ادیب اور صحافی تھے ۔ اس لیے صحت زبان کی طرف زیادہ توجہ دی جاتی تھی ۔ اب صحافیوں کی غالب تعداد ایسے افراد پر مشتمل ہے جو ادیب نہیں ، صرف اخبار نویس ہیں ، اس لیے فن صحافت کو فائدہ پہنچا ہے لیکن صحت زبان کی طرف کم توجہ دی جاتی ہے[۲۸]"

حوالہ جات

1. Sajan Lal, K. A Short History of Urdu News-papers, Hyderabad (India)-1964.

۲ - جام جہاں نما - ۲۳ جنوری ۱۸۲۸ع بحوالہ ہندوستانی اخبار نویسی ، محمد عتیق صدیقی - انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ - دسمبر ۱۹۵۷ - ص ۱۶۴ -

3 S. Natrajan, A History of the Press in India Asia Publishing House 1962 - p. 103.

4. Ibid, p. 54 -

۵ - جام جہاں نما - ۹ مارچ ۱۸۲۵ع -

۶ - سیدالاخبار بحوالہ ہندوستانی اخبار نویسی صفحات ۲۷۳ ، ۲۷۴ -

۷ - فوائدالناظرین دہلی - ۲۲ جنوری ۱۸۴۹ ص ۷ -

۸ - ہفت روزہ کوہ نور لاہور - ۲۸ جنوری ۱۸۵۰ع ص ۳۰ -

۹ - صادق الاخبار دہلی جلد ۳ ، نمبر ۱۱ - اشاعت ۱۶ مارچ ۱۸۵۷ع -

۱۰ - دہلی اردو اخبار جلد ۱۹ - نمبر ۲۱ اشاعت ۲۴ مئی ۱۸۵۷ع -

۱۱ - دہلی اردو اخبار جلد ۱۹ - نمبر ۲۰ اشاعت ۱۷ مئی ۱۸۵۷ع -

۱۲ - صادق الاخبار - جلد ۴ - اشاعت ۳ اگست ۱۸۵۷ع -

۱۳ - خطبات دتاسی بحوالہ ہندوستانی اخبار نویسی ، ص ۳۵۷ -

۱۴ - ڈاکٹر عبدالسلام خورشید - صحافت پاکستان و ہند میں ، مجلس ترقی ادب لاہور - جون ۱۹۶۳ع ص ۱۰۴

15. Margarita Barns. The Indian Press. George Allen & Unwin Ltd. 1942 - p. 249.

16. A History of the Press in India - p. 103.

۱۷ - بدرشکیب : اردو صحافت کاروان ادب کراچی - کلیم پرنٹنگ پریس ۱۹۵۲ ص ۱۹۹ -

۱۸ - ہفت روزہ کشف‌الاخبار بمبئی - اشاعت ۱۶ جولائی ۱۸۶۱ع -

۱۹ - ہفت روزہ اخبار عالم ، اشاعت ۲ فروری ۱۸۶۵ع ص ۵ -

۲۰ - صحافت پاکستان و ہند میں ، ص ۱۹۲ -

۲۱ - صحافت پاکستان و ہند میں ، ص ۳۰۷ -

۲۲ - اخبار عام لاہور ، اشاعت ۲۷ ستمبر ۱۸۸۴ع ص ۲ -

۲۳ - محمد امین زبیری : مکاتیب محسن الملک ، وقارالملک ، ص ۱۱۷ -

۲۴ - جدید اردو نثر، مقالہ سرسید احمد خاں ، از ڈاکٹر سید عبداللہ ص ۱۳۹ -

۲۵ - صحافت پاکستان و ہند میں ، ص ۴۱۵ -

۲۶ - روزنامہ زمیندار ، ۲۷ مارچ ۱۹۳۸ع -

۲۷ - بیگم محمودہ حمید نظامی : نشان منزل ، ص ۱۳۰ -

۲۸ - صحافت پاکستان و ہند میں ، ص ۵۲۸ -

سوالات

۱ - ابتدائی اردو اخبارات میں اداریوں کی صورت کیا ہوتی تھی ؟ جواب کو مثالوں سے واضح کیجیے -

۲ - ۱۸۵۷ع کی جنگ آزادی میں اردو اخبارات نے کس انداز سے اداریہ نگاری کی اور اُن کے اداریوں کی ہیئت اور لب و لہجہ کیا تھا ؟

۳ - ۱۸۵۷ع کی جنگ آزادی کے بعد اردو اداریے میں کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں ؟ مفصل جواب دیجیے -

۴ - اردو اداریہ نگاری کے ارتقا میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق نے کیا حصہ لیا ؟

۵ - ابتدائی اردو روزناموں کے اداریے کیسے ہوتے تھے ؟
جواب کو مثالوں سے واضح کیجیے -

۶ - انیسویں صدی کے آخر میں اردو اداریوں کی مختلف
صورتوں پر روشنی ڈالیے -

۷ - مندرجہ ذیل اخبارات کے اداریوں پر روشنی ڈالیے :
(۱) اودھ پنچ (۲) اخبار عام (۳) پیسہ اخبار -

۸ - اردو میں پرجوش اور انقلابی نوعیت کی اداریہ نگاری کا
آغاز کب اور کیوں ہوا ؟ مفصل جواب دیجیے -

۹ - روزنامہ زمیندار نے اردو اداریہ نگاری میں کیا کیا
تبدیلیاں پیدا کیں ؟

۱۰ - ہمدرد اور الہلال ہفتہ وار اخبارات تھے مگر ان کے
اداریے اپنے عہد کے بہت سے اردو روزناموں کے
اداریوں سے زیادہ مؤثر ، وقیع اور مقبول ہوتے تھے ؛
بحث کیجیے -

۱۱ - بیسویں صدی کے ربع اول میں اردو اداریہ نگاری کی
خصوصیات پر روشنی ڈالیے -

۱۲ - جدید اردو اداریہ نگاری کا آغاز کب اور کیسے ہوا ؟

۱۳ - کن اخبارات نے جدید اردو اداریہ نگاری کے فروغ اور
ارتقا میں زیادہ حصہ لیا ؟

۱۴ - قیام پاکستان کے بعد کے اردو اخبارات کے اداریوں
کا تنقیدی جائزہ پیش کیجیے -

۱۵ - اردو اداریہ نویسی کے ارتقا پر ایک مبسوط مضمون لکھیے -

۱۶ - اردو اداریہ نویسی کے ارتقائی عمل میں اہم مراحل پر روشنی ڈالیے -

۱۷ - جدید اردو اداریوں کے محاسن اور معائب پر روشنی ڈالیے -

دوسرا باب

اردو کے نامور اداریہ نویس

سرسید احمد خاں کی اداریہ نگاری

سر سید احمد خان محقق ، مؤرخ ، مقرر ، شاعر ، ادیب ، مصنف ، مؤلف و مترجم ، صحافی اور سب سے بڑھ کر مصلح تھے ۔ انہوں نے اپنی بیشتر صلاحیتیں اصلاحی سرگرمیوں میں صرف کیں ۔ صحافت میں باقاعدہ آنے سے پہلے سر سید احمد خان اپنے بھائی سید محمد خان کے اخبار ''سیدالاخبار'' میں مضامین لکھتے رہے تھے اور متعدد کتابیں تصنیف کر چکے تھے ، مثلاً 'جام جم' ، 'جلاء القلوب' 'میکانکیات' ، 'آثار الصنادید' ، 'رسالہ اسباب بغاوت ہند' وغیرہ ۔ جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد انگریز انتقام پر تلے ہوئے تھے ۔ مغربی نقاد اسلام اور پیغمبر اسلام پر حملے کر رہے تھے ۔ سرسید احمد خاں نے کمر ہمت باندھی اور ہر محاذ پر ڈٹ گئے ۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ مسلمان قوت کے بل پر سیاسی اقتدار حاصل نہیں کر سکتے اور ان کی بقا کا راستہ یہ ہے کہ وہ حکمرانوں سے تعاون کریں ؛ جدید علوم و فنون سیکھیں اور غلط رسم و رواج ترک کر دیں ۔ اسی مقصد کے تحت انہوں نے ایک سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی اور پھر اس کے زیر اہتمام 'اخبار سائنٹیفک سوسائٹی' جاری کیا ۔ ۱۸۶۹ء میں انگلستان گئے جہاں انہوں نے 'خطبات احمدیہ' کا انگریزی ترجمہ چھپوایا ۔ ۱۸۷۰ء میں واپس آ کر ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا ۔ سائنٹیفک سوسائٹی سرسید کی وفات

کے بعد بھی جاری رہا ۔ تہذیب الاخلاق چھ سال سات ماہ بعد بند ہوگیا ؛ کچھ عرصہ بعد یہ دوبارہ جاری کیا گیا مگر پھر ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا ۔

مولانا الطاف حسین حالی نے سر سید احمد خاں کے مشن کے بارے میں لکھا تھا ؎

زیستن در فکر قوم و مردن اندر بند قوم
گر توانی ، می توانی سید احمد خاں شدن

می تواں مقبول عالم گشت اما ہمچو شیخ
بہر سود خلق مردود جہاں نتواں شدن

ترجمہ : (قوم کی فکر میں مرنا اور قوم کے غم میں جینا اگر تم ایسا کر سکتے ہو تو پھر سر سید احمد خاں بن سکتے ہو ۔ دنیا میں مشہور و مقبول تو ہوا جا سکتا ہے لیکن سر سید احمد خاں کی طرح انسانوں کی بھلائی کے لیے دنیا بھر کا مردود نہیں ہو سکتے ہو) ۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی حالت اس عمارت کی سی تھی جو زبردست زلزلے کے باعث تباہ و ویران ہو چکی ہو ۔ چنانچہ ''جس فرد جلیل نے اس کی تعمیر نو کے لیے سب سے پہلے آواز بلند کی وہ سر سید ہی تھے ۔ ان کے سوا سب کی زبانیں گنگ ، سب کے ہاتھ شل اور سب کے قلوب ماؤف رہے ۔

۔۔۔۔۔ جب کسی فرد کے ہاتھ پاؤں جکڑ کر اسے کسی گہرے کنوئیں میں دھکیل دیا جاتا ہے تو سب سے پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ اس بیچارے کو باہر نکالا جائے ۔ پھر اس کے ہاتھ پاؤں کھولے جائیں اور اس قابل بنایا جائے کہ کوئی اسے ایسی

سر سید احمد خاں

بلا میں دوبارہ مبتلا نہ کر سکے ۔ سر سید نے مسلمانوں کے لیے یہی کیا[۱] ۔''

اگرچہ سر سید احمد خاں ہمیں 'اخبار سائنٹیفک سوسائٹی' اور تہذیب الاخلاق کے آئینے میں بہت عظیم نظر آتے ہیں ، درحقیقت ان کی صحافتی حیثیت ان کی جامع اور با کمال شخصیت کا صرف ایک پہلو ہے ۔ جس طرح انھوں نے اپنی دوسری حیثیتوں میں اپنے دور کے مسلم معاشرے کے ہر شعبے کو متاثر کیا ، اسی طرح ان کی صحافت نے اردو صحافت کو متاثر کیا ۔

خالدہ ادیب خانم نے اپنے دورۂ ہندوستان کے تاثرات ''Inside India'' میں لکھا ہے :

''سر سید کو کسی بھی پہلو سے دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک بڑا سا پتھر ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی کے ٹھہرے ہوئے پانی میں لڑھکا دیا گیا ہو ۔ اس نے جو لہریں اٹھائیں وہ اب تک حرکت میں ہیں ، خواہ ہمیشہ اسی سمت میں نہ ہوں جو سر سید پسند کرتے تھے ۔''

سر سید احمد خاں کے اخبار ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' اور رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایسے پتھر تھے جن کو ہندوستان کی اردو صحافت کے ٹھہرے ہوئے پانی میں لڑھکا دیا گیا ہو اور انھوں نے جو لہریں اٹھائیں وہ اب تک حرکت میں ہیں ۔

مولانا الطاف حسین حالی نے ''حیات جاوید'' میں اخبا ''سائنٹیفک سوسائٹی'' کا ذکر یوں کیا ہے :

''اگرچہ اخبار ملک کی سوشل اصلاح کا ہمیشہ ایک عمدہ آلہ رہا ہے ، اور اول ، اول کئی سال تک جس قدر زمانہ حال کی

نئی اصلاحیں اس کی بدولت ہندوستانیوں کو حاصل ہوتی رہی ہیں ، ان کے لحاظ سے یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں ہے کہ کم سے کم شمالی ہندوستان میں عام خیالات کی تبدیلی اور معلومات کی ترقی اس پرچے کے اجرا سے شروع ہوئی ہے ۔ مگر اس کے ساتھ ہی پولیٹیکل معاملات میں جو وقعت اور اعتبار اس پرچے نے گورنمنٹ اور حکام کی نظر میں حاصل کیا وہ آج تک کسی دیسی اخبار نے حاصل نہیں کیا ۔

''اس میں سوشل ، اخلاق ، علمی اور پولیٹیکل ہر قسم کے مضامین چھپتے تھے ۔ جب تک سر سید کی توجہ دوسری جانب مائل نہیں ہوئی ، علاوہ ان لیڈنگ آرٹیکلوں کے جو وہ خود لکھتے تھے انگریزی اخباروں سے عمدہ عمدہ آرٹیکل جو معاملات ہندوستان سے علاقہ رکھتے تھے ، برابر ترجمہ ہو کر اس میں چھاپے جاتے تھے ۔

''اس کی آواز ہمارے دیسی اخباروں کی طرح کوئی معمولی آواز نہ تھی بلکہ جن معاملات پر وہ بحث کرتا تھا اور دخل دیتا تھا ، ہمیشہ اس کی آواز پر کان لگائے جاتے تھے اور اس کو غور سے سنا جاتا تھا ۔''

مولانا حالی مزید لکھتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ''مگر جو صفائی اور سلاست اور تہذیب اور شائستگی اور کھلاوٹ آج عام تحریروں میں دیکھی جاتی ہے اور جس قدر آرٹیکل نگاری کا سلسلہ اخباری دنیا میں پھیلا ہے اور جہاں تک اہل قلم میں اس قسم کے معاملات پر آزادانہ رائے زنی اور نکتہ چینی کا حوصلہ پیدا ہوا ہے ، اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو یہ سب اسی ایک قلم کی آواز بازگشت ہے اور اس کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ جو اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ کا اخبار نکلنے سے پہلے ملک میں جاری تھے ،

ان کا مقابلہ ان اخباروں کے ساتھ کیا جائے جو اس کے بعد شائع ہوئے ، اور جو اخبار یا میگزین تہذیب الاخلاق سے پہلے شائع ہوتے تھے ، ان کا موازنہ ان اخباروں یا میگزینوں سے کیا جائے جو اس کے بعد جاری ہوئے - اس مقابلے سے صاف معلوم ہو جائے گا کہ اردو اخباروں نے ان پرچوں سے کیا سبق حاصل کیا ہے -''

اخبار سائنٹیفک سوسائٹی کے اداریے

صحافت کے میدان میں اخبار سائنٹیفک سوسائٹی کی خدمات بہت زیادہ اور ہمہ جہت ہیں - اس کی ایک اہم خدمت وہ ''لیڈنگ آرٹیکل'' ہیں جن کا ذکر مولانا حالی نے کیا ہے - یعنی اس اخبار میں پہلی بار اور علیحدہ سے باقاعدہ اداریے چھپنے شروع ہوئے - ایک تحقیق کے مطابق ''کل مواد میں ۲۸ فیصد حصہ خبروں پر مشتمل ہوتا تھا ، تقریباً تیرہ فیصد اداریے کے لیے وقف ہوتا تھا اور باقی مواد حالات حاضرہ پر مضامین کے لیے مخصوص ہوتا تھا[۲] -''

آج کل کے ضخیم اخبارات میں اداریوں کو جو جگہ دی جاتی ہے اس کا تناسب بعض صورتوں میں تیرہ فیصد بھی نہیں بنتا -

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ بعض حلقوں نے سر سید احمد خاں پر انگریزوں کی طرفداری اور خوشامد کا الزام عائد کیا ہے ، مگر ۱۸۵۷ء کی ہولناکی کے بعد سر سید احمد خاں ہی نے انگریزوں کے طرز عمل اور حکومت کے بعض اقدامات پر جرأت سے تنقید کی ، مثلاً :

''ہندوستانیوں کا خون

یہ خبریں ہم کو اسی طرح پہنچتی ہیں جس طرح شکار کے موسم میں یہ خبریں پہنچتی ہیں کہ فلاں صاحب نے آج ایک ہرن یہاں سے مارا ، دوسرے صاحب نے ایک ہرن وہاں سے مارا -

چنانچہ فلر صاحب کے مقدمے کے بعد ایک خبر توپخانے کے صاحب کی پہنچی جنھوں نے پنکھا قلی کو مارے لاتوں کے جان سے مار ڈالا - دوسری خبر ان صاحب کی پہنچی جنھوں نے ایک ملاح کو را، گزین عالم بقا کیا - تیسری خبر لکھنؤ کے چوکیدار کی پہنچی جس کو شرتھن گوروں نے بندوق سے شکار کیا - چوتھی خبر کراچی کے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ محکمہ ٹیلی گراف کی پہنچی جنھوں نے ایک شخص کو مار ڈالا - پانچویں خبر گورکھ پور کے ایک تماشا والا صاحب کی پہنچی جنھوں نے سرائے میں ایک صاحب کو لٹھ مار کر ہلاک کیا - چھٹی خبر جہلم کے ایک صاحب ایاچی نام کی ہے جو ملازم ریلوے ہیں اور انھوں نے پنکھا قلی کے سر میں ضرب شدید لگا کر اسے ہلاک کیا - غرض کہ یہ چھ خبریں قتل کی ہیں جن میں چھ ہندوستانی مقتول اور چھ صاحب بہادر قاتل ہیں اور ان جملہ مقدمات میں اب تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ قاتلوں سے کیا مواخذہ ہوا - - - -''

'' - - - ہم کو ان تمام دردناک خبروں کو سننے سے نہایت افسوس ہوا ہے اور وہ افسوس کچھ اس وجہ سے نہیں کہ بیچارے ہندوستانی ایسی بے رحمی کے ساتھ مارے گئے اور ان کا خون ایک جانور کے خون بلکہ پانی سے بھی زیادہ بے قدری کے ساتھ بہایا گیا ، اور باوجود اس کے ہندوستانیوں کی فریاد کی کوئی شنوائی نہیں ہے - اسی طرح شاید حضورگورنر بہادر کے احکام کی بھی شنوائی نہیں ہوئی ، کیوں کہ اگر ان کی شنوائی ہوتی تو ان کا اثر یہ ہوتا کہ اگر ہمیشہ کے واسطے نہیں تو چند روز کے واسطے تو ضرور ہندوستانیوں کو اس سختی سے نجات ملتی [۳] -''

'' - - - - ہندوستانی کتنے ہی علوم و فنون میں کمال حاصل کریں اور کتنے ہی دیانتدار اور خوش کردار ہو جائیں ، مگر وہ انگریزوں کے نزدیک بے ایمان اور غیر مہذب ہی رہیں گے، اور

جلد ۱ — ۳ مئی سنہ ۱۸۶۶ع روز جمعہ — نمبر ۶

LIBERTY OF THE PRESS IS A PROMINENT DUTY OF THE GOVT. AND A NATURAL RIGHT OF THE SUBJECTS

آزادی چھاپہ کی ہی ایک بڑا فرض گورنمنٹ کا اور ایک اصلی اور جبلی حق رعیت کا

اطلاع

یہہ اخبار سین ٹیفک سوسئٹی علیگڈہ سے ہفتہ وار جاری ہوتا ہی قیمت اسکی حسب تفصیل ذیل ہی مگر جو لوگ سین ٹیفک سوسئٹی کے ممبر ہیں انکو بلا قیمت ملتا ہی ۔

سالانہ قیمت اخبار ۱۲ روپیہ
سالانہ محصول ۳ روپیہ

جو لوگ ہماری سوسئٹی کے ممبر ہوتے ہیں انکو چوبیس روپیہ سالانہ دینا پڑتا ہی اور کل کتابیں اور اخبار جو سوسئٹی چھاپتی ہی بلا قیمت انکو ملتی ہیں ۔

NOTICE

This Paper will be issued weekly by the Scientific Society.

The rates of subscription will be as follows

Annual subscription. 12 – –
Do. with postage 15 – –

The paper will be distributed gratis to members of the Society.

Members of the Society pay an annual subscription of Rs. 24 and are entitled to receive, without further payment, all the Society's publications, books, lectures, and newspapers.—

انگریز چاہے جتنی ہی بد انصافیاں کریں مگر وہ شریف کے شریف ہیں ۔''

(اخبار سائنٹفک سوسائٹی ، ۲۳ دسمبر ۱۸۶۷ء)

''۔۔۔۔ نہایت افسوس کی بات ہے کہ اس نادان یورپین نے ان بیچارے نا کردہ گناہ ہندوستانیوں کے قتل کو اس ظلم کی مکافات تصور کیا جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں کسی اور کی طرف سے ہوا تھا اور جس میں ان مقتول ہندوستانیوں کو کچھ بھی دخل نہ تھا ۔

ہم کو یاد ہے کہ اس بارے میں ہم نے ایک رائے بھی دی تھی جس کا منتہا یہ تھا کہ ایسی یادگاریں ہمیشہ کینے کو تازہ کریں گی اور فساد کو بڑھا دیں گی ۔ پس اس طرح ہم اب یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ ہماری گورنمنٹ پر بہ نظر بقائے امن و امان ضروری ہے کہ وہ ایسی جملہ یادگاروں کو نیست و نابود کر دے ۔''

(اخبار سائنٹفک سوسائٹی ۱۲ مئی ۱۸۷۶ء)

''ہندوستان کی دولت انگلستان کو کھنچی چلی جاتی ہے اور کل کے بنے ہوئے کپڑے کے تن کے ان بہت جلد سونا اور چاندی ہوئے جاتے ہیں ۔ مگر منچسٹر والے روپیہ کو اس طرح پر کھنچے چلے جانے سے بھی راضی نہیں ہیں بلکہ وہ حتی الامکان اس سے بھی زیادہ نفع حاصل کرنا چاہتے ہیں اور ان کو اس بات کی کچھ بھی پروا نہیں کہ ہندوستان دولتمند ہے یا غریب ۔''

برطانیہ نے حبشہ پر حملہ کیا اور اس جنگ کے مصارف کا بار ہندوستان پر ہی ڈالنے کا فیصلہ کیا گیا تو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے ۷ فروری ۱۸۶۹ء کی اشاعت میں لکھا :

''جنگ حبشہ

یہ اول موقع ہے کہ ایسی لڑائی کے واسطے جو صرف ہندوستان

کی ہی سرحد سے خارج نہیں بلکہ ایشیا کی بھی سرحد سے علیحدہ واقع ہوگی اس ملک کے محاصل سے روپیہ لیا جاتا ہے ۔ اب فکر کرنی چاہیے کہ اس لڑائی میں ملک ہندوستان کی کوئی غرض نہیں ہے ۔ ۔ یہ صحیح ہے کہ ملک ہندوستان سلطنت برطانیہ کا ماتحت ہے لیکن اس کی گورنمنٹ اور اس کی فوج علیحدہ ہے اور اس کی بحری فوج اور سول سروس ، خزانہ جدا ہے ۔ انگلستان اپنی نو آبادیوں حفاظت میں ہمیشہ روپیہ صرف کرتا ہے لیکن ہندوستان کی امداد میں ایک حبہ نہیں دیتا[۳] ۔"

تہذیب الاخلاق اور اس کے اداریے

سر سید احمد خاں ۱۸۶۹ء میں انگلستان گئے اور وہاں سے واپس آ کر برطانوی جرائد سپیکٹیٹر (The Spectator) اور ٹیٹلر (The Tatler) کے نمونے پر رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا ۔ اس کے سرورق پر اردو نام کے ساتھ انگریزی میں "محمڈن سوشل ریفارمر" بھی چھپتا تھا ۔ یہ پورا رسالہ اردو میں ہوتا تھا ۔ ہر مہینے میں عام طور پر تین بار شائع ہوتا تھا ۔ سرسید احمد خاں نے اس کے پہلے شمارے میں تمہید کے زیر عنوان ایک مفصل اداریہ لکھا جس میں اس رسالے کے اجرا کے اغراض و مقاصد بیان کیے اور برصغیر کے مسلمانوں کو کامل تہذیب اختیار کرنے کی طرف راغب کرنے کے سلسلے میں لکھا :

"یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ ہم . . . بخوبی ہوشیار ہو کر نیک دلی اور غور سے اپنی حالت پر خیال کریں اور جو رسوم و عادات اب ہم میں موجود ہیں اور جو مانع تہذیب ہیں ان کو دیکھیں کہ وہ کہاں سے آئیں اور کیوں کر خود ہم میں پیدا ہوگئیں اور ان میں سے جون جون سی ناقص اور خراب اور مانع تہذیب ہوں ان کو ترک کر دیں ، اور جو قابل اصلاح ہوں

ان کی اصلاح کریں اور ہر ایک بات کو اپنے مذہبی مسائل کے ساتھ مقابلہ کرتے جاویں کہ وہ ترک یا اصلاح موافق احکام شریعت بیضا کے ہیں یا نہیں ، تاکہ ہم اور ہمارا مذہب دونوں غیر قوموں کی حقارت اور ان کی نظروں کی ذلت سے بچے کہ اس سے زیادہ ثواب کا کام اس زمانے میں نہیں ہے ۔

پس ہمارا مقصد ہندوستان کے مسلمان بھائیوں سے ہے اور اس مقصد کے لیے یہ پرچہ جاری کرتے ہیں تاکہ بذریعہ اس پرچے کے جہاں تک ہم سے ہو سکے ان کے دین و دنیا کی بھلائی میں کوشش کریں ۔"

پہلے شمارے میں تمہید کے بعد سر سید ہی کے تین اور مضمون شائع ہوئے جن کے عنوانات "رسم و رواج" ، "تعصب" اور "تکمیل" تھے ۔ ان مضامین کا مقصد بھی مسلمانوں کی اصلاح اور بہبود تھی - اس کے بعد تہذیب الاخلاق میں سر سید احمدخاں یا دوسرے اکابر کے جتنے مضامین چھپے ، ان میں بھی خیالات ، رسم و رواج ، طرز عمل اور معاشرت کی اصلاح پر زور دیا گیا اور ہر معاملے میں عقلی اور تنقیدی انداز فکر اختیار کرنے کی تاقین کی گئی - چھ سال سات ماہ بعد تہذیب الاخلاق بند ہوگیا ۔ اس عرصے میں اس میں ۲۲۶ مضامین چھپے جن میں سے ۱۱۲ سر سید کے تھے ۔ تین سال بعد یہ رسالہ دوبارہ جاری ہوا مگر دو سال پانچ ماہ بعد پھر بند ہوگیا ۔ اس عرصے میں اس میں چھپنے والے ۶۷ مضامین میں سے ۲۳ سر سید احمد خاں کے تھے ۔ تقریباً چودہ سال بعد یہ رسالہ پھر شروع ہوا مگر تین سال بعد بند ہو گیا -

تہذیب الاخلاق میں سر سید نے جو اداریے لکھے وہ بھی اصل میں مضامین ہی تھے اور ان میں اور سر سید احمد خاں کے دوسرے مضامین میں کوئی فرق نہیں ہوتا تھا ۔ چنانچہ ان کی کوئی

علیحدہ حیثیت متعین نہیں کی جا سکتی اور تہذیب الاخلاق نے اپنے دور پر جو کچھ اثر ڈالا بحیثیت مجموعی ڈالا ۔ سولانا الطاف حسین حالی نے حیات جاوید میں اس رسالے کی خدمات کا ذکر کیا ہے ۔ اس کا خلاصہ یہ ہے :

سر سید احمد خاں کی آواز پر موافق بھی متوجہ ہوئے اور مخالف بھی ۔ ان کی تحریک کو دونوں سے فائدہ پہنچا ۔ مسلمانوں کو اپنے زوال و زیاں کا احساس ہوا اور ان میں ترقی کرنے کا جذبہ پیدا ہوا - مغربی مصنفین نے اسلام کے خلاف اپنی تحریروں سے پڑھے لکھے مسلمانوں کے دلوں میں جو شبہات پیدا کر دیے تھے وہ دور ہو گئے ۔ تقلید اور تعصب کی گرفت کمزور پڑ گئی ۔ ادب میں ایک انقلاب پیدا ہوا اور اردو شاعری نے نئی کروٹ لی ۔ اردو زبان میں وسعت پیدا ہوئی اور ہر طرح کے خیالات و افکار آسانی کے ساتھ اردو میں ادا کیے جانے لگے ۔

سرسید کے اداریوں کی خصوصیات

۱ ۔ سر سید احمد خاں نے اردو صحافت میں پہلی بار الگ اور نمایاں مقام پر اداریوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا - سر سید کے اخبار میں دوسرے اخباروں کے برعکس خبروں میں تبصرہ شامل نہیں ہوتا تھا ۔ خبریں بڑی حد تک معروضی ہوتی تھیں اور وقت کے اہم مسئلے پر اداریہ الگ لکھا جاتا تھا ۔

۲ ۔ سر سید احمد خاں کے اداریے مدلل اور منطقی ہوتے تھے۔ ان کا مقصد اصلاح اور ہر حال میں اصلاح ہوتا تھا ۔ چنانچہ وہ مسئلے کی نوعیت اور کیفیت بیان کرنے کے بعد اس کا حل تجویز کرتے تھے - پھر اپنی رائے کے حق میں دلائل دیتے تھے - بقول ڈاکٹر سید عبداللہ :

''اخبارات میں واقعات ، اطلاعات پر بے لاگ رائے جس میں بڑی عاقبت بینی ، وسعت معلومات اور تعمیری نقطہ' نظر جھلکتا ہے ۔ یہی ان کے تبصروں کی خصوصیت ہے ۔''

(مقالہ سرسید احمد خاں ، ڈاکٹر عبداللہ ، جدید اردو نثر)

۳ ۔ سر سید کے اخبارات کی طرح ان کے اداریوں کی زبان سلیس اور عام فہم ہوتی تھی ۔ اس دور کے عام رجحان کے برعکس انہوں نے زبان کی خوبصورتی کی بجائے مفہوم اور مطلب کو مؤثر طور پر پیش کرنے کی کوشش کی اور اس میں بڑی حد تک کامیاب رہے ۔

سر سید احمد خاں نے خود تہذیب الاخلاق اختتام سال ۱۸۹۱ع میں لکھا تھا :

''جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اردو زبان کے علم و ادب کی ترقی میں اپنے ناچیز پرچوں کے ذریعے کوشش کی ۔ مضمون کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ وضع کیا ۔ جہاں تک ہماری کج مج زبان نے یاری دی الفاظ کی درستی ، بول چال کی صفائی پر کوشش کی ۔ رنگینیٔ عبارت سے جو تشبیہات اور مضامین خیالی سے بھری ہوتی ہے اور اس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا ، پرہیز کیا ۔ تک بندی سے کہ وہ اس زمانے میں مقفٰی عبارت کہلاتی تھی ، ہاتھ اٹھایا ۔ جہاں تک ہو سکا سادگی عبارت پر توجہ دی ۔''

شمس العلما مولوی ذکاءاللہ تہذیب الاخلاق کے ضمن میں لکھتے ہیں :

''کیا مبارک دن عید کا یکم شوال ۱۳۰۱ نبوی اور

۱۲۸۷ھ تھا کہ ایک دانشمند باغبان نے اپنے دست مبارک سے ہماری قوم کے لیے اس سر زمین ہند میں تہذیب الاخلاق کا وہ بیج بویا کہ پہلے کسی سے نہ بویا گیا تھا ، اور اس کی آبیاری ایسی جانفشانی سے کی کہ وہ جلدی سے زمین میں سے پھوٹا اور سبز کونپلیں اور سبز پتے جھٹ پٹ نکل آئے ۔ اور شگوفے کھل کر گل ہوئے اور ہزاروں بلبلوں کے جمگھٹ اس پر جمع ہوئے اور انھوں نے اپنے شیریں نغموں کا ایسا شور اور غلغلہ مچایا کہ وہ لوگ جو خواب غفلت میں ایسے پڑے سوتے تھے کہ خواب بھی نہیں دیکھتے تھے ، جاگ اٹھے ۔ ۔ ۔ ۔

''جو بڑا اس نے کام کیا ، اور حقیقت میں بڑا ہی کام کیا ہے ، وہ یہ ہے کہ مغربی خیالات کو مشرقی زبان میں اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ ان کی حسانت اصل سے بھی زیادہ ہو گئی ہے ۔ بعض قائلوں کی یہ رائے ہے کہ اردو زبان میں یہ قابلیت ہی نہیں کہ مغربی خیالات اس میں سمائیں ۔ اب اس پرچے نے خود اس کام کو کر کے دکھا دیا کہ مغربی خیالات خواہ وہ کسی قسم کے ہوں وہ سب اردو میں ادا ہو سکتے ہیں بشرطیکہ کوئی ادا کرنے والا لائق اور قابل ہو ۔ سید احمد خاں صاحب میں ایک استعداد اور ملکہ خداداد ایسا ہے کہ وہ ان مغربی خیالات کو اپنی زبان میں اس خوبی اور بے تکلفی سے ادا کرتے ہیں اور اپنی جودت طبع اور عالی دماغی سے کوئی ایسی اصلاح یا کوئی بات ایسی کر دیتے ہیں کہ وہ مضمون مغربی زبان سے زیادہ تر شگفتہ اور متین ہو جاتا ہے ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ اب تک بندی سے لوگ ہاتھ اٹھاتے جاتے ہیں اور بھاری بھاری لفظوں اور موٹے موٹے کلموں سے مضامین کی

گردن نہیں توڑتے۔ بیہودہ استعارات اور تشبیہات کی چھری
سے اردو کا خون نہیں کرتے۔ شوکت الفاظ سے حشمت
معنی نہیں دکھاتے.... کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ ہم
کوئی اخبار یا خط یا کوئی کتاب ایسی نہ دیکھتے ہوں کہ
اس پرچے کی تحریر کا پرتو نظر نہ آتا ہو۔ بعض برملا اقرار
کرتے ہیں کہ ہم سید احمد خاں کی تحریروں سے مستفیض
اور مستفید ہوتے ہیں جو ایسے مضامین لکھتے ہیں۔ بعض
ہٹ دھرمی کرتے ہیں۔ اور... اس پرچے کے نکلنے سے پہلے
کوئی نہیں جانتا تھا کہ قوم کا مفہوم کیا ہے اور وہ ہوا
کیا کرتی ہے۔ قومی ہمدردی، قومی عزت، قومی محبت،
مروت، قومی بھلائی، قومی خوشی نہ یہ الفاظ خود اور نہ
ان کے مترادفات اردو میں موجود تھے[5]۔"

سر سید احمد خاں کی مساعی میں ان کے نامور معاصر مولانا حالی، نواب وقارالملک، نواب محسن الملک، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ذکاءاللہ بھی براہ راست یا بالواسطہ شریک تھے۔ سر سیداحمد خاں نے آسان نویسی کی جو رسم ڈالی وہ مشترکہ مساعی سے ایک پر زور تحریک بن گئی اور اس تحریک نے اردو اداریہ نویسی کو بھی متاثر کیا۔

۴ - فنی اعتبار سے بھی سر سید احمد خاں کے اداریے خاصے مکمل ہوتے تھے۔ پہلے وہ مسئلہ بیان کرتے، پھر اس پر بحث کرتے اور آخر میں حل تجویز کرتے۔

۵ - انگریز حکمرانوں کی زیادتیاں، حکومت کی غلط پالیسیاں، ہندوؤں اور مسلمانوں کی آویزش، مسلمانوں کی پسماندگی، جہالت، جدید علوم کے حصول کے لیے حکمرانوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات کی ضرورت کا احساس، یہ اس دور کے بڑے مسائل تھے اور سر سید نے زیادہ تر انہیں

مسائل پر اداریے لکھے ۔

چنانچہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ چند تبدیلیوں کے ساتھ سر سید احمد خاں کے اداریے صحافت کے جدید دور کے اداریوں کے خاصے قریب ہیں ۔

حوالہ جات

۱ ۔ محمد امین زبیری : تذکرۂ سر سید ۔ دیباچہ از مولانا غلام رسول مہر (ص ذ ۔ ض) پبلشرز یونائیٹڈ ۔

۲ ۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید : صحافت پاکستان و ہند میں ، ص ۲۱۰ ۔

۳ ۔ اخبار سائنٹیفک سوسائٹی ۔ اشاعت ۱۵ ستمبر ۱۸۷۶ء جلد ۱۱ نمبر ۳۵ ۔

۴ ۔ بحوالہ فن صحافت ، بدر شکیب ، ص ۲۱۲ ۔

۵ ۔ تذکرہ سر سید صفحات ۱۴ تا ۴۴ ۔

مولانا ظفر علی خان کی اداریہ نگاری

مولانا ظفر علی خاں کے والد مولوی سراج الدین نے ۱۹۰۳ء میں لاہور سے ہفت روزہ 'زمیندار' جاری کیا ، لیکن کچھ ہی مدت بعد وہ اس کا دفتر اپنے آبائی گاؤں کرم آباد لے گئے ۔ 'زمیندار' کے اجرا سے پہلے ہی مولانا ظفر علی خاں حیدرآباد دکن سے ۱۹۰۲ء میں ماہوار رسالہ 'افسانہ' جاری کر چکے تھے اور ''معرکہ' مذہب و سائنس'' اور ''اسرار لندن'' کے مترجم کی حیثیت سے شہرت حاصل کر چکے تھے۔ ۱۹۰۳ء میں انھوں نے حیدرآباد ہی سے ''دکن ریویو'' جاری کیا ۔ اور چند انگریزی کتابیں اردو میں 'خیابان فارسی' 'اسیر ظلمات' اور 'جنگل میں منگل' وغیرہ ناموں سے ترجمہ کیں ۔ ۱۹۰۹ء میں مولوی سراج الدین کے انتقال کے بعد مولانا ظفر علی خاں نے اپنے آبائی گاؤں جا کر 'زمیندار' کا انتظام سنبھالا ۔ ۱۹۱۰ء میں وہیں سے ماہنامہ ''پنجاب ریویو'' نکلا ۔ مئی ۱۹۱۱ء میں 'زمیندار' اور 'پنجاب ریویو' لاہور منتقل ہو گئے ۔ مولانا کے قلم نے زمیندار کو جلد ہی مقبول عام بنا دیا ۔ چنانچہ انھوں نے اس کی مقبولیت اور مانگ نیز حالات کے تقاضوں کے پیش نظر ۵ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو اسے روزنامہ بنا دیا ۔ جنگ طرابلس اور جنگ بلقان کے باعث مولانا کا قلم شعلے بکھیرنے لگا ۔ اخبار اس قدر مقبول ہو گیا کہ سرحد کے ناخواندہ لوگ دو پیسے کا زمیندار خریدتے اور ایک آنہ پڑھوا کر سننے پر خرچ کرتے تھے ۔ ۱۹۱۲ء میں 'مائیکل اڈوائر' پنجاب کا گورنر مقرر کیا گیا لیکن

اس سے پہلے کہ مائیکل اڈوائر کوئی کارروائی کرتا مولانا انگلستان چلے گئے جہاں وہ پریس ایکٹ کے خلاف جدوجہد میں مصروف ہو گئے۔ وہاں سے زمیندار کے لیے مضمون بھی بھیجتے رہے۔ مارچ ۱۹۱۲ء میں 'زمیندار' سے ایک ایک ہزار روپے کی دو ضمانتیں طلب کی گئیں۔ مولانا لندن ہی میں تھے کہ ان کا ایک مضمون

چار چیز است تحفۂ لندن
خمر و خنزیر و روزنامہ و زن

کے زیر عنوان چھپا۔ اس کی اشاعت پر حکومت نے دس ہزار کی ضمانت اور چھاپہ خانہ ضبط کر لیا، اور دس ہزار روپے کی مزید ضمانت طلب کی گئی۔ مگر عوام نے چندہ کر کے رقم جمع کر دی۔ اگست ۱۹۱۳ء میں مسجد کانپور کا المیہ رونما ہوا۔ ان کے اخبار نے اس سلسلے میں یو پی کے گورنر پر کڑی تنقید کی؛ اس پر زمیندار کی یہ ضمانت بھی ضبط ہو گئی۔ اس بار چندہ بر وقت جمع نہ ہو سکا اور زمیندار کچھ دن بند رہا۔ مگر چند روز بعد پھر شروع ہو گیا۔ ۱۹۱۴ء میں مولانا لندن سے واپس آئے تو اتحاد اسلامی پر زوردار مضامین اور افتتاحیے لکھے۔ ادھر پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ ترکی بھی اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ ہندوستان میں ''ڈیفنس آف انڈیا رولز'' نافذ کر دیے گئے۔ ۲ اکتوبر ۱۹۱۴ء کو مولانا ظفر علی خاں کرم آباد میں نظر بند کر دیے گئے اور زمیندار کو حکم دیا گیا کہ وہ جنگ کی خبریں نہ چھاپے۔ ان حالات میں اخبار جاری رکھنا بے سود اور عملاً ناممکن تھا چنانچہ جون ۱۹۱۵ء میں احتجاج کے طور پر اخبار بند کر دیا گیا۔ نظر بندی کے دوران میں مولانا تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔ پھر ان کی طرف سے ایک علمی و ادبی ہفت روزہ جاری کرنے کی درخواست دی گئی جو حکومت نے منظور کر لی۔ چنانچہ انھوں نے ۱۹۱۶ء کے اواخر میں ہفت روزہ ''ستارۂ صبح'' جاری کیا۔

مولانا ظفر علی خاں

یہ رسالہ کچھ عرصہ بعد لاہور سے نکلنے لگا ۔ رفتہ رفتہ اس میں مباحث شروع ہو گئے ۔ مولانا خود رقم طراز ہیں کہ : سر مائیکل اڈوائر گورنر پنجاب کی ستم پیشہ ملوکیت نے زمیندار کو بند کر رکھا تھا اور مجھے نیم نظر بندی کی صورت میں اپنا ادبی شوق پورا کرنے کے لیے ہفت روز ستارۂ صبح کی ادارت کے فرائض کی انجام دہی کی اجازت دے رکھی تھی۔ سیاست میرے لیے شجر ممنوعہ کا حکم رکھتی تھی اور 'ستارۂ صبح' کے اوراق صرف غیر سیاسی مواد کے لیے وقت ہونے پر مجبور تھے ۔ نقلی صوفیوں اور جھوٹے پیروں کا پول ستارۂ صبح میں کچھ اس طرح کھولا گیا کہ اپنائے طریقت کے بر خود غلط رہنما چیخ اٹھے ۔ چنانچہ میرے خلاف ان بزرگوں نے ایک وسیع پیمانے پر سازش کی جس کا مقصد یہ تھا کہ کسی طرح میں ان کے راستے سے ہٹ جاؤں ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے پنجاب چھوڑنا پڑا اور کچھ عرصے کے لیے حیدر آباد جا کر حضرت میر عثمان علی خاں کے دامن دولت میں پناہ لینی پڑی ۔ اگرچہ حیدر آباد میں بھی حریفوں نے میرا پیچھا نہ چھوڑا اور مجھے اس گوشۂ عافیت کو بھی چھوڑ کر پنجاب کا رخ کرنا پڑا ۔''
(بہ حوالہ نگارستان)

انہوں نے اپنی یہ کیفیت اشعار میں یوں بیان کی ہے ؎

نہیں اپنوں سے امید مدارات
تو کیا غیروں سے ہو چشم مراعات
محبت کا نتیجہ ہے عداوت
نرالی ہے عمل کی یہ مکافات
جگر پھٹتا ہے بھرتا ہوں اگر آہ
زباں کٹتی ہے کرتا ہوں اگر بات
زمانے کا ہے یہ برتاؤ مجھ سے
کہ اٹھتے جوتیاں ہیں بیٹھتے لات

لگد کوب حوادث ہو رہا ہوں
ہیں میرے ہی لیے شاید سب آفات

مارچ ۱۹۲۰ء میں ''زمیندار'' دوبارہ شروع کرنے کی اجازت مل گئی مگر دو ہزار کی ضمانت بھی مانگی گئی - اس کے بعد ہی تحریک خلافت شروع ہو گئی جس کے دوران میں یہ ضمانت ضبط کر کے مزید پانچ ہزار کی ضمانت طلب کر لی گئی - ۱۹۲۰ء میں مولانا کو حضرو (کیمبل پور) میں باغیانہ تقریر کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا اور پانچ سال قید بامشقت اور ایک ہزار روپے جرمانے کی سزا دی گئی - 'زمیندار' کے متعدد ایڈیٹر گرفتار کر لیے گئے- زمیندار ہی کے سلسلے میں ۱۹۲۰ء میں 'مسلم پرنٹنگ پریس' کی دو ہزار روپے کی ضمانت اور پریس بھی ضبط کرلیا گیا - جنوری ۱۹۲۲ء میں ''کانگریس پریس'' کی دو ہزار کی اور فروری ۱۹۲۲ء میں مالک پریس کی دو ہزار روپے کی ضمانت ضبط ہو گئی ، علاوہ ازیں انگریز ڈی - آئی - جی پولیس لونگر کی طرف سے ازالۂ حیثیت عرفی کے مقدمے کی یک طرفہ کارروائی کے بعد اسے پندرہ ہزار روپے کی ڈگری مل گئی یہ روپیہ بھی ادا کرنا پڑا - مولانا ہی کے الفاظ میں ـــــ

دل ضبط ، زباں ضبط ، فغاں ضبط ، قلم ضبط
دنیا میں ہوئے ہوں گے یہ ساماں کہیں کم ضبط

آنسو مری آنکھوں کے گئے پہلے ہی سے سوکھ
تھے ورنہ وہ اس فکر میں ان کا بھی ہو نم ضبط

مولانا کی اسیری کے زمانے میں زمیندار اگرچہ طرح طرح کی آزمائشوں اور مصیبتوں سے دوچار رہا مگر وہ ان کے باوجود زندہ رہا -

مولانا قید کاٹ کر جیل سے نکلے تو شدھی اور سنگٹھن کی

تحریکیں زوروں پر تھیں - مسلمان رہنما مسئلہ حجاز پر دو گروہوں میں تقسیم ہو چکے تھے - کانگرس بھی موالاتی اور ترک موالاتی گروہوں میں بٹی ہوئی تھی - پنجاب کی خلافت پارٹی مولانا ظفر علی خاں کی قیادت میں آل انڈیا خلافت کمیٹی سے علیحدہ ہو گئی - مگر مولانا ابھی تک کانگرس کے ہم خیال تھے ۱۹۳۰ء میں گاندھی جی کی 'نمک تحریک' میں شامل ہوئے اور باغیانہ تقریر کرنے کے ''جرم'' میں تین سال کے لیے قید کر دیے گئے - اسی اثنا میں زمیندار کی ضمانتوں کی ضبطی کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا - ۱۹۳۲ء میں ایک ہزار کی ضمانت ضبط ہوئی اور تین ہزار کی نئی ضمانت طلب کی گئی - ۲۱ دسمبر ۱۹۳۲ کو اس میں سے دو ہزار روپے کی رقم ضبط کر لی گئی اور مزید دو ہزار روپے کی ضمانت لی گئی - اخبار بھی عارضی طور پر بند ہوگیا اور ۷ جولائی ۱۹۳۳ء کو پھر شروع ہوا - پنجاب کی تحریک خلافت نے بعد میں مجلس احرار کی صورت اختیار کر لی - ۱۹۳۵ء میں مولانا مسئلہ' شہید گنج کے سلسلے میں اختلاف کی بنا پر 'احرار' سے الگ ہوگئے - اور ''مجلس اتحاد ملت'' کی بنیاد رکھی - ۱۹۳۶ میں کراچی میں کانگرس کا اجلاس ہو رہا تھا کہ نماز عصر کے موقع پر اجلاس ملتوی نہ کرنے پر ناراض ہوگئے اور کانگرس کو خیرباد کہہ دیا - ۱۹۳۷ء میں انہوں نے مجلس اتحاد ملت کو مسلم لیگ میں مدغم کردیا - اسی سال حلقہ لاہور سے ایک ضمنی انتخاب میں مرکزی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے - ۱۹۴۶ء میں دوبارہ مرکزی اسمبلی کے انتخاب میں زبردست اکثریت سے کامیاب ہوئے۔ اس اثنا میں وہ مسلم لیگ کے لیے کام کرتے رہے - شب و روز سفر میں بسر کرتے اور جلسوں سے خطاب کرتے - ۱۹۴۶ء کے آخر میں تپ محرقہ لاحق ہوا اور تین ماہ تک بیمار رہے ، افاقہ ہوا تو فالج کا حملہ ہوگیا - ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان قائم ہو گیا

۲۶ مارچ ۱۹۴۸ء کو مولانا نے پنجاب یونیورسٹی اردو کانفرنس میں اپنا مقالہ ''عہد حاضر اور اردو'' پڑھتے ہوئے کہا : ''ہمارا قافلہ منزل مقصود پر پہنچ چکا ہے - اس کے بعد تمنائے راہ پیمائی تو ہے لیکن قوت راہ پیمائی نہیں رہی - کام کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن ہاتھ جواب دے چکے ہیں - دل میں جذبات تو ہیں لیکن ان کے لیے عمل و حقیقت کا جامہ نہیں ملتا - اب راستے میں بیٹھ کر چلنے والوں کی برق رفتاری کا تماشہ دیکھنے کے قابل رہ گئے ہیں'' -

رفتہ رفتہ قویٰ مضمحل ہوتے گئے - قیام پاکستان کے بعد دو تین سال لاہور میں رہے ، پھر کرم آباد منتقل ہو گئے - آخر ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ء کو دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے - ان کا اخبار ابتلاء و آزمائش کے کئی مراحل سے گزرتا رہا - ۱۹۵۳ء میں ختم نبوت کی تحریک کے سلسلے میں اسے ایک سال کے لیے بند کر دیا گیا - تاہم پھر شروع ہوا اور دنیائے فانی سے مولانا کے کوچ کرنے کے بعد بھی کچھ عرصے تک زندہ رہا -

مولانا ظفر علی خاں کے اداریے

(مولانا ظفر علی خاں کی زندگی کے اس اجمالی جائزے سے ان کی شخصیت کے نقوش بھی اجاگر ہو جاتے ہیں اور یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے اداریوں کا انداز کیا ہوگا - مولانا قادرالکلام شاعر ، بے مثال ادیب ، انشا پرداز ، خطیب ، سیاستدان، عالم اور صحافی تھے - ان کی بیشتر صلاحیتیں اور توانائیاں انگریزوں کی غلامی کے خلاف جہاد میں صرف ہوئیں - وہ صحافت کے میدان میں بھی اسی مقصد کے لیے آئے تھے - اگرچہ اور رہنماؤں نے بھی صحافت کے ذریعے غلامی کے خلاف جہاد کیا ، مگر مولانا ظفر علی خاں کا قلم تو شمشیر برہنہ تھا - وہ خود فرماتے ہیں ؎

قلم سے کام تیغ کا اگر کبھی لیا نہ ہو
تو مجھ سے سیکھ لے یہ فن اور اس میں بے مثال بن

مولانا صلاح الدین احمد مرحوم کے الفاظ میں ''جس مرد مجاہد نے سب سے پہلے میدان وغا میں قدم رکھ کر ملوکیت مغرب کو للکارا ، جس حریت کوش نے سرزمین بے آئین سرحد اور کشور نیازپرور پنجاب میں اپنے عصائے کلیمی سے اژدر طلسم فرنگ کی سر کوبی کی ، جس بندۂ حق آگاہ نے طرابلس اور قسطنطنیہ کے زخموں کی ٹیس لاہور میں محسوس فرمائی اور اسے جسد ملت میں سر تا سر دوڑا دیا ، لاریب وہ بیسویں صدی میں اسلامیان ہند کا اولین راہنما ظفر علی خان تھا؟ ۔'' مائیکل اڈوائر (جس نے پنجاب کے اسسٹنٹ گورنر کی حیثیت سے مولانا ظفر علی خان اور زمیندار کے خلاف حاکمانہ اختیارات بے محابا استعمال کئے تھے) لکھتا ہے :
''اخبار زمیندار پان اسلام ازم پر یقین رکھنے والے طبقہ کا آتش بار ترجمان تھا ۔ اس اخبار کا ایڈیٹر آتش مزاج (Fire brand) اور ''رسوائے عالم'' (Notorious) ظفر علی خان تھا ۔ اسے متعدد بار منع کیا گیا ؛ بالآخر میں پریس ایکٹ کے ماتحت اس کی ضمانت ضبط کرنے پر مجبور ہوگیا ۔ مزید ضمانت طلب کی گئی جو داخل کردی گئی ، اور اخبار زمیندار پھر نکلا ۔ اب کہ اس کا انداز تحریر پہلے سے بھی زیادہ باغیانہ اور معاندانہ تھا ۔ وہ عوام کو برطانوی حکومت کے خلاف اعلانیہ بغاوت پر ابھارتا تھا ۔ ظفر علی خان نے برطانوی حکومت اور وزیر اعظم ایسکوئتھ کے خلاف انتہائی آتشیں مضامین لکھے ۔ ۔ ۔'' غیر ملکی حکومت کے ایک بااختیار نمائندے اور مولانا ظفر علی خاں کے دشمن کے یہ الفاظ مولانا کی حب وطن ، بے مثال جرأت ، بے باکی ، عزم اور مشن کی بلندی کا اعتراف اور ثبوت ہیں ۔

۱۹۱۳ء میں مولانا کی تحریروں کی وجہ سے زمیندار کی ضبطیوں کا سلسلہ شروع ہوا تو مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال (کلکتہ) نے لکھا :

''روزنامہ زمیندار کی اشاعت سے پہلے اخبار بینی طبقۂ خواص میں محدود تھی ، اور عام بیداری و احساس کے پیدا ہونے میں یہ ایک ایسا مانع عظیم تھا جس کی وجہ سے کوئی تحریک اور کوئی آواز عام قوت و اثر پیدا نہیں کر سکتی تھی - جنگ طرابلس نے قوم کے تمام طبقات کو خبروں کا شائق بنا دیا اور زمیندار کی عام مقبولیت شروع ہو گئی - اس کی اشاعت بیس بیس ہزار روزانہ تک پہنچی - ہر شخص جو اردو عبارت پڑھ سکتا ہے علی الصباح اس طرح 'زمیندار' کا خواہشمند ہوتا تھا گویا یورپ اور امریکہ کا ایک تعلیم یافتہ عادتاً صبح کے وقت مطالعۂ اخبار کے لیے بے قرار ہے - اس نے گو ابتدا میں ہندوستان کے معاملات کے متعلق کچھ نہ لکھا اور مسلمانوں کی سیاسی حالت پر بھی کوئی توجہ نہ کی تاہم اس نے جن جن معاملات کو لکھا آزادی اور جرأت کے ساتھ لکھا اور پڑھنے والوں میں یقیناً زندگی کی ایک روح پیدا کر دی - اس کے حالات میں مزید تغیرات ہوئے اور زمیندار نے بیرون ہند کے اسلامی مسائل کے متعلق بھی لکھنا شروع کر دیا - گو اس سے بے اعتدالیاں بھی ہوئیں لیکن اس میں شک نہیں کہ اصولاً اس نے ہمیشہ آزادی کے ساتھ اظہار خیال کی سعی کی[۳]'' - - -

جیسا کہ اس اقتباس سے واضح ہے 'زمیندار' کی اشاعت میں اضافے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ لوگ جنگ کی خبریں پڑھنا چاہتے تھے اور زمیندار عالم اسلام کی خبریں خصوصی اہتمام سے چھاپتا تھا۔ یہ واحد اردو اخبار تھا جس نے رائٹر اور ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا سے خبریں حاصل کرنے کا انتظام کیا - لیکن اس کی اشاعت اور مقبولیت میں اضافے کا زیادہ بڑا سبب اس کے وہ آتشیں اداریے اور مضامین تھے جو مولانا ظفر علی خاں لکھتے تھے - اس اقتباس اور مائیکل اڈوائر کے الفاظ سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ابتدا میں مولانا ظفر علی خاں کے نزدیک اتحاد عالم اسلام اہم

مسئلہ تھا ، اس لیے انھوں نے زیادہ تر اسی مسئلے پر زور دیا ۔ ۷ دسمبر ۱۹۱۱ع کے اخبار میں اٹلی کی حالت زار کے زیر عنوان اداریے میں لکھا : ''اب سے دو مہینے پہلے کی بات ہے کہ اٹلی نے بغیر کسی وجہ و دلیل بیان کیے نہایت بے باکی سے باب عالی کے نام جنگ کا الٹی میٹم بھیج دیا تھا ۔ حکومت عثمانیہ اٹلی کی اس پھرتی اور غداری کو دیکھ کر حیران رہ گئی ۔ بظاہر اٹلی کے تمام مدبرین حکومت عثمانیہ کی خیرخواہی کا دم بھرتے تھے اور بادی النظر میں کوئی خصومت بھی نظر نہ آتی تھی ۔ لیکن حکومت عثمانیہ نے کمال فراخ حوصلگی و متانت سے کام لیا اور یورپ کو ، جس کا دعویٰ ہے کہ وہ تہذیب و تمدن کے لحاظ سے ساری دنیا کا پیش‌رو ہے ، اٹلی کی اس حرکت پر متوجہ کیا ۔ مگر خدا جانے یورپ کیوں خاموش بیٹھا رہا ۔ آخر اٹلی اپنے الٹی میٹم کے جھوٹے مطالبات کو پورا ہوتے نہ دیکھ کر طرابلس پر دیوانہ وار دوڑ پڑا ۔ باب عالی نے دول یورپ کو اٹلی کی اس غاصبانہ کارروائی پر مکرر سہ کرر توجہ دلائی لیکن یورپ کی طرف سے وہی ایک جواب ملا کہ بیچ بچاؤ کا موقع نہیں ۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے دول یورپ کی کیا مراد تھی، انھیں میں سے ایک طاقت قانون بین‌الاقوامی کے تمام قواعد کو توڑ کر دفعتاً جنگ کا اعلان کردیتی ہے اور تمام یورپ تماشا دیکھ رہا ہے ۔ یوں تو دول یورپ اور مصنفین یورپ نے چلا چلا کر اپنے گلے پھاڑے کہ صلح و امن کا قائم رکھنا ضروری ہے ۔ بندگان خدا کا خون بہانا اچھی بات نہیں ۔ ہیگ کانفرنس پر لاکھوں روپیہ صرف کیا جاتا ہے اور معاہدات کی ترتیب و تکمیل میں بڑے شد و مد سے حصہ لیا جاتا ہے ۔ لیکن جب عملدرآمد کا وقت آتا ہے تو کوئی واحد طاقت ان سب قوانین و قواعد کو بالائے طاق رکھ کر خونریزی پر کمربستہ ہو جاتی ہے اور باقی طاقتیں منہ میں گھنگھنیاں بھر کر بیٹھ جاتی ہیں ۔ اس طرز

عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ بین الاقوامی قواعد صرف دھوکے کی ٹٹی ہیں، جس کی آڑ میں بیٹھ کر دول یورپ پولٹیکل شکار کھیلا کرتی ہیں، اور جب ان کا جی چاہتا ہے، علانیہ بھی خون ریزی پر آمادہ ہو جاتی ہیں .... الخ"

جوں جوں برصغیر اور اس سرزمین کے مسلمانوں کے مسائل شدید ہوتے گئے، اس طرف ان کی توجہ بھی بڑھتی گئی - لیکن ابتدا میں بھی انھوں نے ملکی مسائل سے بالکل صرف نظر نہیں کیا - بیسویں صدی میں جس مسئلے نے مسلمانوں کو پہلی بار شدت سے جھنجھوڑا وہ تقسیم بنگال کی تنسیخ تھی - مولانا نے اس پر ۲ فروری ۱۹۱۲ع کی اشاعت میں ایک طویل اداریہ لکھا جس کا اقتباس ذیل میں دیا جاتا ہے:

"سودے کے بہانے سے مجھے گھر سے نکالا
میں خوب سمجھتا ہوں تری دال میں کالا

ابلق لیل و نہار کی شوخیاں بھی قابل دید ہیں - ابھی رات تھی، ابھی دن ہے، ابھی صبح تھی، ابھی شام ہے - کسی چیز کو ثبات نہیں - کسی شئے کو قیام نہیں - تغیر و تبدل کا ایک سلسلۂ لامتناہی ہے، جو ازل سے لے کر ابد تک پھیلا ہوا ہے - اس پر بھی اگر کوئی شخص کسی بات کو "امر فیصل شدہ" سمجھے تو اس کی سادہ لوحی میں کیسے شک ہو سکتا ہے -

۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ع سے پیشتر کسی کو تقسیم بنگال کی تنسیخ کا گمان تک نہ ہو گا - جناب لارڈ مارلے سابقہ وزیر ہند ایک دفعہ نہیں، دو دفعہ نہیں بلکہ متواتر اور بارہا اس امر کا اظہار فرما چکے تھے کہ تقسیم بنگال ایک "طے شدہ امر" ہے؛ اب اس کی تنسیخ یا ترمیم کا دل میں وہم بھی نہ لانا چاہیے - لارڈ منٹو اگرچہ اپنے پیش رو لارڈ کرزن کی روش سے اختلاف رکھتے تھے،

لیکن ان کی پنج سالہ میعاد حکومت میں لارڈ کرزن کے عہد حکومت کے اس مہتمم بالشان واقعے یعنی تقسیم بنگال کی تنسیخ کے مسئلے پر بحث کرنے کا خیال تک گورنمنٹ ہند یا وزارت ہند کو نہ ہوا۔ پارلیمنٹ میں جب بنگالیوں کے چند ہمدرد ممبروں کی طرف سے تقسیم بنگال کے خلاف آواز بلند ہوئی تو وزیر ہند بس یہی ایک جملہ پیشانی پر بل لا کر فرما دیتے تھے کہ یہ ایک ''امر فیصل شدہ'' ہے اور یہ سن کر وہ بیچارے اُن کا منہ دیکھتے رہ جاتے تھے۔ ادھر ہندوستانیوں کو بھی تاروں کے ذریعے سے خبریں مل جاتی تھیں کہ تقسیم بنگال کی سرزمین پر پتھر کی لکیر بن کر کھنچ گئی ہے۔ اب دست حسرت و کف افسوس ملنے سے شاید ہاتھ کی لکیریں مٹ جائیں تو مٹ جائیں مگر تقسیم بنگال کا معاملہ بنگالیوں کے لیے خط تقدیر بن گیا ہے؛ اگر قسمت بدل سکتی ہے تو تقسیم بنگال کی ترمیم و تنسیخ بھی ممکن ہو سکتی ہے۔ لیکن ۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء کو دربار قیصری میں جو شاہی اعلان اہل ہندوستان کو پڑھ کر سنایا گیا اس نے ثابت کر دیا کہ خط تقدیر مٹ سکتا ہے، قسمت بدل سکتی ہے، امر فیصل شدہ، امر غیر فیصل شدہ تسلم کیا جا سکتا ہے اور مسلمان جس بسم اللہ کے گنبد میں اپنی قناعت اور وفاداری کی چادر تانے پڑے سوتے تھے، اس میں سے وہ ع

پا بہ دست دگرے دست بدست دگرے

باہر نکالے جا سکتے ہیں۔ ہم ان کیفیات کا تجزیہ کرنے سے جو اس اعلان کو سن کر مسلمانوں کے قلب پر طاری ہوئیں، ایک رستے ہوئے ناسور کو ایک اور چرکا نہیں لگانا چاہتے۔ صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ گورنمنٹ عالیہ نے تقسیم بنگال کی تنسیخ اور کلکتے کے بجائے دہلی کو دارالسلطنت قرار دینے میں جن پولٹیکل شزلغوں کا ارتکاب کیا ہے، وہ اپنے پہلو میں بہت سے ایسے

خمیازے چھپائے ہوئے ہیں جو گورنمنٹ ہند کو مسلمانان ہند کے قلب کی غیر مطمئن کیفیت اور بنگالیوں اور ان کے ہمنواؤں کے مزید نامتناہی مطالبات کی شکل میں رہ رہ کر کھینچنے پڑیں گے۔

آج کل مسلمانان ہند عجیب مصیبت میں مبتلا ہیں۔ اگر خاموش رہتے ہیں تو اس کا کچھ اچھا نتیجہ نظر نہیں آتا کیونکہ آج کل اسی کا زمانہ ہے جو ذرا ہاتھ پاؤں اور زبان ہلائے۔ خاموش اور صابر آدمی اس تعلیم و تہذیب کے زمانے میں گونگا اور بے وقوف سمجھا جاتا ہے۔ اگر غریب مسلمان اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے ہاتھ پاؤں ہلاتے ہیں تو انھیں کے بعض بھائی بند ان کی روش کو ملک اور قوم اور گورنمنٹ کے حق میں خطرناک مشہور کر کے سرکاری حکام کی نظروں سے انھیں گرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب بیچارے مسلمان حیران ہیں کہ کریں تو کیا کریں۔''

مولانا ظفر علی خاں نے سب سے زیادہ اداریے عالم اسلام، اسلام اور مسلمانوں کے متعلق لکھے۔ افغانستان میں غازی امان اللہ خاں نے جب تعمیری کام شروع کیا تو مولانا نے دل کھول کر ان کی تعریف کی۔ لیکن جب غازی امان اللہ خاں کو بوجوہ اقتدار چھوڑنا پڑا تو مولانا نے مندرجہ ذیل اداریہ لکھا:

''افغانستان میں آفتاب حریت کا غروب

خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

(از ظفر علی خاں)

آخر وہی حادثہ پیش آیا جس کا ہمیں کھٹکا تھا۔ استعمار پرستان مغرب کی عیاری اور اہل افغانستان کی رجعت پسندی کا دوگونہ جادو چل گیا۔ غازی امان اللہ خاں جن کی ذات سے ملت بیضا کی حریت اور مشرق کی آزادی کی بڑی بڑی توقعات وابستہ تھیں تاج و تخت سے دستبردار ہو گئے اور افغانستان کا تاج ان کے بڑے

بھائی عنایت اللہ خاں کے سر پر رکھا گیا جن کی نسبت زمانۂ آئندہ ہی فیصلہ کر سکے گا کہ وہ اپنے جلیل القدر بھائی کا کس حد تک نعم البدل ثابت ہو سکتے ہیں ۔ اسلام کے جہاز کو جو جنگ عظیم کے بعد بحر حوادث میں ڈگمگا رہا تھا ساحل نجات پر پہنچانے کے لیے خدائے بزرگ و برتر نے غیب سے روشنی کے چار مینار ، مصطفٰی کمال ، ابن سعود ، احمد رضا خاں اور امان اللہ خاں کی شکل میں قائم کر دیے اور امید پڑتی تھی کہ مسلمانوں کے دن اب پھر چلے ہیں - لیکن افسوس کہ مشرق وسطیٰ کی کوہستانی پہنائیوں سے ایک تیرہ و تار آندھی ایسی اٹھی جس کے تھپیڑوں نے چوتھے مینار کو یک بیک منہدم کر دیا ۔ جہاں پہلے نگاہ کو چندھیا دینے والی روشنی پھیلی ہوئی تھی وہاں پہلے کی طرح گھٹا ٹوپ، اندھیرا چھا گیا ؎

سیہ بختان قسمت را چہ سود از رہبر کامل
کہ خضر از آب حیواں تشنہ می‌آرد سکندر را

بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ گزشتہ دس سال میں وسط ایشیا کی سیاسی پائداری بڑی حد تک غازی امان اللہ خاں ہی کے مجاہدانہ عزائم و مساعی ، آپ کے والہانہ ذوق حریت اور آپ کے بیتابانہ درد ملت کی رہین احسان ہے ۔ آپ کے تخت سلطنت پر بیٹھنے سے پہلے افغانستان کا درجہ مغربی استعمار کے ایک وظیفہ خوار سے زیادہ نہ تھا ۔ آپ نے ایک ہی جھٹکے میں اُس کی غلامی کی زنجیریں توڑ ڈالیں اور اسے آزاد اقوام عالم کی صف میں لا کھڑا کیا ۔ آپ کی مساعی جمیلہ سے ملک کے ہر حصے میں مدارس قائم ہو گئے ۔ تعلیم کا نور گھر گھر پھیل چلا ۔ قتل و غارت گری کے خوگر انسان تہذیب و تمدن کا سبق پڑھ کر دنیا کی مہذب قوموں کے ہم چشم ہو گئے - - - الخ‘‘

(زمیندار - ۱۸ جنوری ۱۹۲۹ع)

یہ اداریہ نصف صفحے پر محیط ہے -

'زمیندار' کی اگلی اشاعت (۱۹ جنوری ۱۹۲۹ع) میں پھر اسی موضوع پر یوں لکھا گیا :

"بچہ سقہ

آدمیاں گم شدند ملک خدا را خر گرفت

- - - حالات اس سرعت سے پلٹا کھا رہے ہیں کہ کچھ کہا نہیں جا سکتا آج کیا ہے اور کل کیا ہوگا - اشاعت دیروزہ میں قارئین کرام کو بتایا گیا تھا کہ غازی امان اللہ خاں اپنے بھائی عنایت اللہ خاں کے حق میں تاج و تخت سے دستبردار ہو کر اور یہ خداداد امانت انہیں سونپ کر ہوائی جہاز میں قندھار سدھار گئے - اور بھوۂ برقیات میں قارئین نے یہ خبر بھی پڑھی ہو گی کہ نئے فرمانروا کے برسر اقتدار آنے کے باوجود نواح کابل میں قتال و جدال کا ہنگامہ بدستور گرم ہے - خیال یہی ہو سکتا ہے کہ جب بدبخت شنوریوں اور ان کے بدبخت تر حلیفوں کی تمام تر شرائط منظور کر لی گئی ہیں تو پھر معرکۂ حرب و ضرب کا سلسلہ قائم رہنے کی کوئی وجہ نہیں - اور جب وہ پھول جو ان تیرہ بختوں کی نگاہوں میں کانٹا بن کر کھٹک رہا تھا، زیب گلشن نہ رہا تو ان کی ناپاک سرگرمیاں خود بخود ختم ہو جائیں گی - - - الخ"

غرض برصغیر سے باہر مسلمانوں کا کوئی مسئلہ پیدا ہوتا تو مولانا ظفر علی خاں مسلسل اس پر لکھتے، اور جب اندرون ملک کے کسی مسئلے پر قلم اٹھاتے تو کئی اشاعتوں میں اس پر اظہار خیال کرتے- ۳۱ جنوری ۱۹۲۹ کے 'زمیندار' میں :

لارڈ وارن کی قیصرانہ تصریحات

مدت سے لگ رہی تھی لب بام پر ٹکٹکی
تھک کے گر پڑی نگہ انتظار کی

کے زیر عنوان لکھا :

''نائب السلطنت کشور ہند کے جس خطبے کا اہل ہند کو مدت سے انتظار تھا ، آخر ۲۸ جنوری کو جب حضور ممدوح نے دہلی میں مجلس وضع آئین و قوانین ہندوستانی کا افتتاح فرمایا ، سننے میں آ گیا ۔ میں اپنے ہموطنوں کے ضمیر کی ترجمانی کا حق ادا کرنے سے قاصر رہوں گا اگر کسی طویل و عریض تمہید کے بغیر ایک جملے میں صاف صاف یہ نہ کہہ دوں کہ لارڈ وارن کے اس خطبے نے خدا کی اس تین سو ملین مخلوق کی تمناؤں کا خون کر دیا ہے جس کا خمیر مایہ خاک پاک ہند سے اٹھایا گیا ہے ۔ لارڈ وارن کے خطبے میں لفاظی کا افسون بھی ہے ، فصاحت کا سحر بھی ہے لیکن وہی ایک جادو نہیں جس کے ڈورے ہندوستان کے دل پر ڈالے جا سکتے ہیں ؎

من بوسہ جوے و تو بہ سخن داریم نگاہ
لب تشنہ با گہر چہ شکیبد زلال را

۔ ۔ ۔ الخ''

مولانا نے اس کے بعد کی کئی اشاعتوں میں بھی اسی موضوع پر اداریے لکھے ۔

اسلام سے محبت

مولانا ظفر علی خاں کو اسلام سے والہانہ محبت تھی اور یہ محبت ان کے اداریوں سے بھی ظاہر ہوتی رہی ۔ جب دل میں ٹیس اٹھتی ، قلم اٹھاتے اور اداری مقالہ یا نظم لکھ ڈالتے ۔ کبھی 'اسلام' کی حالت پر خون کے آنسو روتے اور خرابیوں کی نشاندہی کرتے ؛ کبھی اسلام کی سر بلندی کے لیے سراپا دعا بن جاتے۔ ۲۶ جنوری ۱۹۲۹ء کے زمیندار میں یہ اداریہ لکھا :

"دعا

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

* اے وہ کہ جس کی یکتائی کا نقارہ اقصائے کائنات میں صبح آفرینش سے بج رہا ہے !
* اے وہ کہ جس کے لیے صد ہزار ازل و ابد ایک گریزپا لمحے کا غبار نفس ہیں !
* اے وہ کہ جس نے انسان کو احسن تقویم کے نورانی سانچے میں ڈھال کر اپنی حکمت بالغہ اور صنعت کاملہ کے کرشمے ارباب نظر کو دکھائے !
* اے وہ کہ نیستی میں سے ہستی ، ہستی میں سے نیستی ، ظلمت میں سے نور ، نور میں سے ظلمت ، زندگی میں سے موت ، موت میں سے زندگی ، عزت میں سے ذلت ، اور ذلت میں سے عزت پیدا کرنا تیری شان خلاق کا سرمدی مشغلہ ہے !
* اے وہ کہ جس کی بے پایاں محبت نے اپنے برگزیدہ پیغمبروں کی معرفت انسان ضعیف البنیان کے قلب تاریک کو اپنی مشیت کی نورانی حقیقتوں سے رہ رہ کر جگمگایا ہے !
* اے وہ کہ جس نے فلیستعجیبولی کی صدائے عام دے کر ہم سے اٹل وعدہ کیا کہ اگر ہم اپنی پیشانی تیری چوکھٹ پر رکھ دیں گے اور رو رو کر مرادیں مانگیں گے تو ہماری التجا ٹھکرائی نہ جائے گی !
* ہم بے دست و پا ہندوستان والوں کی فریاد سن !

* اے آفرینندہ' کون و مکاں ہماری فریاد سن اس لیے کہ
انسان کو اپنے پروردگار کے لطف و کرم کی اتنی احتیاج
کبھی نہ تھی جتنی ہم تیرہ بختوں کو ہے جو آج ذلت
اور رسوائی کے عالم میں تیرے سامنے دست بستہ
کھڑے ہیں ------

------ الٰہی تیرا وہ اسلام جس نے گورے کالے کا فرق مٹا کر، شاہ و گدا کا امتیاز اٹھا کر ساری خدائی کو تیرا قبیلہ بنا دیا؛ علم و حکمت کے موتیوں سے بے مائگان مغربی کی جھولیاں بھر کر انھیں تہذیب انسانی کے استادوں کا درجہ بخش دیا؛ آج اپنے نام لیواؤں کے جاہلانہ اوہام کا کھلونا بنا ہوا ہے۔ اپنے اس دین فطرت کی بنیاد تونے توحید، نماز، روزہ، زکواۃ اور حج پر رکھی تھی اور فرزندان اسلام کو پوری آزادی عطا فرمائی تھی کہ اس اساس محکم پر تمدن کا ایک ایسا فلک بوس قصر تعمیر کریں جس کے سامنے دوسری قوموں کے محل جھونپڑیوں سے زیادہ حقیر نظر آئیں۔ لیکن وہ معمار جن کے سپرد تونے اس دلکشا ایوان کی تعمیر کی تھی، آج اپنے ناعاقبت اندیش ہاتھوں سے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا رہے ہیں ---- الخ''

یہ اداریہ تین چوتھائی صفحے پر محیط ہے اور مولانا کے انداز تحریر کی نمایاں مثال ہے۔ اسی طرح ۱۲ فروری ۱۹۲۹ء کے شمارے میں مندرجہ ذیل اداریہ ان کی اسلام سے محبت کا ثبوت ہے:

''خون جگر کی چند بوندیں

دل میں اک چوٹ لگی، آنکھوں میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے مجھے کیا جانیے کیا یاد آیا!

کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی سلطنتوں کو نصاریٰ نے پارہ پارہ کیا ہے۔ ایک حد تک یہ قول صحیح ہے لیکن کون ہے

جسے اس روح فرسا حقیقت سے مجال انکار ہو کہ اپنے گھر کی تباہی میں خود مسلمانوں کا ہاتھ نصاریٰ سے بڑھ کر ہے۔ دنیا جہان کے تثلیث پرست اگر اپنی قہرمانی طاقتوں کے ساتھ اسلام کو نظام عالم کا ایک جزولاینفک ہونے کی حیثیت سے مٹانے پر تل جائیں تو بے سروسامان مسلمانوں کا بال تک بیکا نہیں کر سکتے، بشرطیکہ مسلمان متحد ہوں۔ لیکن وہ متحد نہیں ہیں۔ ان کی ملت کا شیرازہ پراگندہ ہو چکا ہے۔ ان کا مذہب بچوں کا کھلونا بنا ہوا ہے۔ انہیں نہ خدا کا خوف ہے نہ رسول خدا کی شرم۔ امرا خودغرض ہیں، علما جاہل ہیں، خواص بزدل ہیں، عوام دنیا کے حالات سے نا آشنا، دین کے حقائق سے بے خبر، اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے پھرتے ہیں۔ بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہے، دوست دوستی کے پردے میں دشمنی کرتے ہیں۔ ایک کی عزت دوسرے کی ذلت ہے۔ ایک کی ذلت پر دوسرے کے گھر میں شادیانے بجتے ہیں۔ وہ زمانے لد گئے جب امیر معاویہؓ نے قیصر روم سے للکار کر کہہ دیا تھا کہ اگر تو نے دارالاسلام کی طرف ایک قدم بھی بڑھایا تو میں علیؓ کا ایک سپاہی بن کر ایک ہی یلغار میں تیرا سر کچل کر رکھ دوں گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الخ"

یہ اداریہ بھی نصف صفحے کا ہے۔

مولانا ظفر علی خاں جب کبھی بین الاقوامی امور پر اداریے لکھتے تو تان عموماً سامراجی طاقتوں کی مخالفت ہی پر ٹوٹتی۔ مثلاً:

جاپان نے ستمبر ۱۹۳۱ء میں چین پر حملہ کیا تو مولانا نے لکھا: "انصاف اور رحم کے جذبات نے اگر جہاں کش اقوام میں سے ایک آدھ کے سینے میں پرورش پائی ہو تو یہ فسانہ عہد قدیم کی ایک دلآویز فصل ہے جو صرف آرائش سخن کا کام دے سکتی ہے، ورنہ آج انصاف کہاں اور رحم کہاں؟ یہ دونوں الفاظ تو

تہذیب کی لغات میں سرے سے مفقود ہیں یا اگر ہیں تو شرمندۂ معنی نہیں - آج دنیا کا نظام حکومت جن اخلاق قوتوں کی بنیاد پر قائم ہے وہ غرق آہن جہاز ہیں ، اژدردم توپیں ہیں ، فلک پرواز طیارے ہیں - قطار اندر قطار عسکریوں کی جگرگداز سنگینیں ہیں - صف اندر صف پولیس کی جمیعت فرسا لاٹھیاں ہیں جن سے جابرانہ قوانین کی ہیبت زیر دستوں کے قلوب میں بٹھائی جاتی ہے - ملوکیت کا یہ عفریت لعین جس نے عسکریت کی گود میں پرورش پائی ہے ، آج اس ربع مسکون پر چھایا ہوا ہے اور ناتوانوں کے جسم کی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا رہا ہے - مغرب اس خونخوار دیو کا زادبوم تھا - کاش یہ اپنے ہی وطن میں رہتا مگر اس نے ایشیا کو اپنا گھر بنا لیا اور اس وقت مشرق اقصلی اس کی جہنمی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا ہے - ۱۸ ستمبر ۱۹۳۱ء کی خونچکاں تاریخ چین کے چالیس کروڑ باشندوں کو مدتوں نہ بھولے گی - اس لیے کہ اس دن ان کی فوجی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر جاپان کے عسکریت پرستوں نے جن کی نخوت کا سر روس کو نیچا دکھانے کے وقت سے آسمان تک اونچا ہو گیا ہے ، کسی قسم کا الٹی میٹم دیے بغیر ، کوئی معقول حجت پیش کیے بغیر دفعتاً ایک ہی بے جگرانہ تاخت میں تمام اہم جنگی نقاط پر قبضہ کر لیا اور اس بد عہدانہ یلغار میں قتل و غارت کے ایسے ایسے آدمیت سوز نظارے دنیا کو دکھائے جو زمانۂ قدیم میں تو چنگیز اور ہلاکو نے دکھائے تھے یا حال میں یورپ کے سورماؤں نے دکھائے ہیں -"

مولانا ظفر علی خاں نے جس جرأت اور بے خوفی کے ساتھ اپنے اداریوں میں قومی و بین‌الاقوامی معاملات و مسائل پر اظہار خیال کیا ، اس کی مثال پوری اردو صحافت کی تاریخ میں نہیں ملتی - یہ درست ہے کہ مولانا محمد علی جوہر کے نام سے بھی

انگریز کانپتے تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اپنے انداز میں نہایت بیباکی کے ساتھ لکھا ، اور ان دونوں رہناؤں نے بھی قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں لیکن مولانا ظفر علی خاں کی مبارزت طلبی طویل تر اور ان کی للکار بلند تر تھی ۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ انگریزوں کے خلاف مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافتی جنگ میں جذبے کے ساتھ ذہانت کو بھی خاصا دخل تھا ۔ لیکن مولانا ظفر علی خاں کی صحافتی جنگ میں جذبہ و جوش غالب تھا ۔ اس کا اعتراف تمام نامور سیاست دانوں ، ادیبوں ، شاعروں اور صحافیوں نے کیا ہے ۔ علامہ اقبال کو ان کے قلم میں مصطفیٰ کمال کی تلوار کا بانکپن نظر آیا ۔ سر سید احمد خاں نے ان میں روشن مستقبل کے آثار دیکھے تھے ۔ نواب محسن الملک کو ان میں بلا کی تیزی نظر آئی تھی ۔ علامہ تاجور نجیب آبادی کی رائے اس سلسلے میں ثبوت مزید کی حیثیت رکھتی ہے : ''یہ قہرمان میدان ادب و صحافت اپنی ہنگامہ آفریں شخصیت کے اعتبار سے آج اپنی نظیر نہیں رکھتا ۔ اس کی فلک فرسا ہمت ، اولوالعزمی اور مصائب آرائی نے اسے تاریخ صحافت میں غیرفانی ہیرو بنا دیا ہے ۔ قانون کی پیچ در پیچ بندشوں سے اس کی فطرت ابا کرتی ہے اور خطرات و عواقب پر ہنستا ہوا وہ ان نظر بندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے ۔ جیل ، جرمانہ ، ضمانتیں ، خانہ تلاشیاں ، ضبطیاں غرض قانون کی کوئی گرفت ایسی نہیں جو اسے مجبور کرنے کے کام نہ آئی ہو ، لیکن قانون کو بھی اس جیسے دل گردہ رکھنے والے انسان سے بہت کم واسطہ پڑا ہوگا کہ قانون کی پیدا کی ہوئی ہر بربادی کے بعد ظفر علی خاں کی خاک سے ایک چاق و چوبند نعرے مارتا ہوا زندہ ظفر علی خاں نمودار ہو جاتا ہے[5] ۔''

ایک اور پہلو

نظری اعتبار سے مولانا ظفر علی خاں کی اداریہ نگاری کا جائزہ ان کے اداریوں تک محدود رہتا ہے ۔ لیکن اداریے کا مقصد اگر تنقید ، رہنمائی اور رائے عامہ کی تشکیل ہے تو ماننا پڑتا ہے کہ مولانا کے اشعار ان کے اداریوں سے بھی زیادہ مؤثر کام کرتے تھے ۔ سیاسی شاعری کو مولانا نے درجۂ کمال تک پہنچایا ۔ ہنگامی موضوعات پر ان کے برجستہ اور بر محل اشعار کی کاٹ ان کے اداریوں کی کاٹ سے بھی زیادہ ہوتی تھی ۔ انھوں نے صحافت کے میدان میں شاعری سے بھی گرز گراں کا کام لیا ۔ بعض اوقات وہ طویل افتتاحیہ لکھنے کے بجائے چند اشعار سے وہی مقصد حاصل کر لیتے تھے ۔ مثال کے طور پر جنگ بلقان کے سلسلے میں برصغیر کے مسلمانوں کے شدید رد عمل کو دیکھ کر انھوں نے لکھا :

مسیحیت مسلمانی سے ٹکرائی تو ہے لیکن
کسی نے آج تک شیشے سے توڑا بھی ہے پتھر کو

ڈراوا دے رہے ہیں کیا وہ ہم کو طوق و جولاں کا
پہنتا ہے خوشی سے مومن اس ایماں کے زیور کو

برصغیر کی آزادی کے سلسلے میں اداری مقالے میں دعوت عمل دیتے وقت شعر کہنے پر طبیعت آ گئی تو 'دعوت عمل' ہی کے زیر عنوان نظم لکھ دی :

اگر تم کو حق سے ہے کچھ بھی لگاؤ
تو باطل کے آگے نہ گردن جھکاؤ

فلک پر مہ و مہر پڑ جائیں ماند
زمیں پر اس انداز سے جگمگاؤ

الخ ۔ ۔ ۔

ہندوؤں اور اُن کے اخبارات سے ٹھن گئی تو فی البدیہہ لکھا :

بھارت میں کھل گئے ہیں دبستاں نئے نئے
جن سے نکل رہے ہیں زباں داں نئے نئے

شدھی و سنگھٹن ہیں مضامیں کی سرخیاں
آرائش کلام ہیں عنواں نئے نئے

دہلی میں 'تیج' ہے تو ہے لاہور میں 'ملاپ'
پیدا ہوئے ہیں دشمن ایماں نئے نئے

'پرتاپ' کا دماغ ہے اور ناز کا قلم
پھر کیوں تراشے جائیں نہ بہتاں نئے نئے

'ہندو' ہے اس طرف تو ادھر 'بندے ماترم'
ہیں آندھیاں نئی نئی طوفاں نئے نئے
الخ - - - - -

'زمیندار' اور ستارۂ صبح کے صفحہ' اول پر اکثر و بیشتر مولانا کی نظمیں چھپتی تھیں۔

خصوصیات

جرأت و بیباکی

جیسا کہ مذکورہ بالا مثالوں سے واضح ہوتا ہے، مولانا ظفر علی خاں کے اداریوں کا سب سے بڑا وصف حق گوئی، بیباکی اور دعوت مبارزت ہے۔ ان کا قلم گویا تلوار تھا اور یہ تلوار زیادہ تر انگریزوں کے خلاف استعمال کی جاتی تھی۔ لیکن جب کبھی قومی معاملات و مسائل پر لکھا، کسی قسم کی مصلحت کے بغیر جرأت کے ساتھ صاف صاف لکھا۔ معاملات و مسائل پر ان کی رائے سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ان کا خلوص اور جرأت اظہار

شک و شبہ سے بلند ہے -

۲ - اشعار کا استعمال

مولانا اپنی بلند علمی و ادبی حیثیت اور دور کے تقاضوں کے مطابق اداریوں میں اشعار بھی استعمال کرتے تھے - عموماً اداریے کا عنوان کوئی شعر یا مصرعہ ہوتا تھا - اداریے کے متن میں بھی کہیں کہیں اشعار استعمال کرتے تھے - ان کے اداریوں کی جو مثالیں دی گئی ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہیں -

۳ - پر شکوہ عبارت

مولانا کے اداریوں کا تیسرا بڑا وصف ان کا اسلوب تحریر ہے - ان کے اداریے لسانی اعتبار سے پرشکوہ اور با جلال ہیں - ان کی شخصیت کا رعب ان کی تحریر میں ڈھلا ہوا معلوم ہوتا ہے - بقول ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار :

''ظفر علی خاں ایک صاحب طرز انشا پرداز تھے - ان کے اسلوب کی ساخت میں شخصی رجحانات ، عصری میلانات اور جذباتی و فکری روشوں کے علاوہ ان کی ہمہ زبانی نے بھی بڑا حصہ لیا تھا - وہ پنجابی نژاد تھے لیکن اردو پر انہیں ایک قدرت کاملہ حاصل تھی اور اساتذہ اہل زبان بھی ان کی زبان دانی کے معترف تھے- اردو پر ایسی قدرت کاملہ کے علاوہ ظفر علی خاں کو عربی ، فارسی ، اور ، انگریزی زبانوں میں بھی خاصا درک حاصل تھا - ظفر علی خاں کی اس زبان دانی نے بھی اردو صحیفہ نگاری کی روایت کو عظیم تر بنانے میں حصہ لیا اور صحافت میں نئی نئی اصطلاحیں ، نئی نئی ترکیبیں اور نئے نئے محاورے اور الفاظ وضع کرنے اور انہیں فروغ دینے میں ظفر علی خاں نے بڑا اہم کام کیا - چنانچہ ان کی سیمابی فطرت ، بے پناہ جوش و

جذبہ ، ماحول کے ہیجان ، علم و فضل اور زبان پر قدرت نے ان کے اسلوب کی تشکیل کی - ان کا مزاج طوفان کی تیزی ، بجلی کی چمک ، بادل کی کڑک ، آبشار کے خروش اور فطرت کے حسن سے عبارت تھا - چنانچہ ان اوصاف کے امتزاج سے جو خصوصیت پیدا ہوتی ہے وہ جلال اور ہیبت کی یکجائی ہے - ان کی تحریروں میں جلال بھی ہے اور ہیبت بھی - ان کی تحریروں میں جگہ جگہ پر شکوہ الفاظ ملتے ہیں جیسے کاسہ لیسان ازلی ، بانگ دہل ، حقیقت نفس الامری ، ربع مسکون ، ظلمت کدۂ فرنگ ، جابر و قاہر ، آن بان ، گجردم ، زلزلہ ، آتش صاعقہ تیشہ فرنگ ، برق ، طاغوت ، استبداد ، قہر ذوی الجلال ، کفر سوز ، آویزۂ گوش ، جلال و جبروت ، قضا و قدر اور قہرمانی طاقتیں ایسے الفاظ اور تراکیب وہ بے تکان استعمال کرتے ہیں - مولانا کی زبان اور اسلوب کے اسی رنگ کی بناء پر خواجہ حسن نظامی نے کہا تھا کہ :
''ان کی اردو عرب سے بن کر آتی ہے اور فارس کے راستے یہاں پہنچتی ہے -''

۴ - جذبہ اور عقل

مولانا کی عام ادبی و علمی تحریروں اور صحافتی تحریروں بالخصوص اداریوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے - اگر فرق ہے تو صرف اتنا کہ بعض اداریوں میں باتیں نسبتاً زیادہ پیچ دار انداز میں کہی گئی ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ سخت قوانین کی تلوار ہر وقت ان کے سر پر لٹکتی رہتی تھی اور وہ بعض اوقات مطلب کی بات براہ راست اور کھل کر کہنے کی بجائے پیچ دار انداز میں کہتے تھے - لیکن بعض اوقات اداریوں میں بھی پورے جوش و جذبہ اور بیباکی کے ساتھ اظہار مدعا کرتے تھے - ان کے اسلوب کا انحصار بڑی حد تک ان کے 'موڈ' پر ہوتا تھا - تاہم ان کے اداریوں میں جذبات بھی ہیں اور استدلال بھی - البتہ کسی اداریی

تحریر میں جذبات غالب ہیں ، کسی میں استدلال کا پلہ بھاری ہے ، اور کسی میں دونوں کا خوشگوار امتزاج ملتا ہے - لیکن ہر تحریر کا بنیادی محرک جذبہ ہی ہے -

۵ - للکار و یلغار

مولانا ظفر علی خان کے مخصوص مزاج اور طبیعت کی وجہ سے ان کے اداریوں میں مسائل کے حل یا حل سے متعلق تجاویز کا عنصر کم نظر آتا ہے اور بعض صورتوں میں تو بالکل نہیں ملتا - اس کے بجائے وہ مسائل کے ذمہ دار یا قصوروار افراد یا مخالف فریق کو للکارتے اور دعوت مبارزت دیتے ہیں یا اس کے رویے پر اظہار افسوس کرتے ہیں -

۶ - جامع مقالات

مولانا ظفر علی خان کے اداریے مبسوط و جامع مقالات کی حیثیت رکھتے ہیں ، کیونکہ وہ جس مسئلے پر لکھتے تھے بحیثیت ایڈیٹر زمیندار نہیں بلکہ بحیثیت ظفر علی خان لکھتے تھے - وہ ظفر علی خان جو قومی رہنما ، سیاستدان ، ادیب ، شاعر اور خطیب بھی تھے - ان کے اداریے خاصے طویل ہوتے تھے اور عموماً نصف صفحے پر محیط ہوتے تھے - بعض اوقات اس سے بھی زیادہ جگہ لیتے تھے -

۷ - خطابت کا عنصر

ان کے اداریوں میں خطابت کا انداز بھی ملتا ہے - ابتدائی دور کے اداریوں میں خطابت کا انداز نسبتاً کم ہے ، مگر بعد کے اداریوں میں یہ انداز نمایاں ہے - اس کی وجہ یہ تھی کہ بعد میں ان کی سیاسی مصروفیتیں بڑھ گئی تھیں - جلسوں سے خطاب کرنا شب و روز کا معمول تھا - جب کبھی وقت نکال کر اداریے لکھتے تو ان میں بھی خطابت کا انداز آ جاتا تھا -

۸ - تمہید

مولانا ظفر علی خاں اداریے میں نفس مضمون پر بحث کرنے سے پہلے عموماً تمہید باندھتے ہیں اور پھر اصل موضوع کی طرف آتے ہیں ۔ مضامین یا تقریروں میں تمہید باندھنے کے بعد اصل موضوع کی طرف آنا اس دور کی عام رسم تھی ۔ مولانا ظفر علی خاں نے اردو اداریہ نویسی اور صحافت کے ارتقا میں جو حصہ لیا وہ بحیثیت مجموعی یہ ہے :

''مولانا ظفر علی خاں نے اردو صحافت میں ایک وجاہت پیدا کی ۔ اس کی نوک پلک درست کی ۔ افتتاحیہ نگاری اور شذرہ نویسی میں ایک نئے اسلوب کی بنیاد رکھی ۔ اس کے ساتھ ادبی رنگ کے تبصرے کو رواج دیا ۔ موضوعات میں تنوع پیدا کیا ۔ اسی سے ادارتی صفحے کا نیا نقشہ مرتب کیا ۔ اسے زیادہ دلچسپ بنایا اور اس طرح زیادہ قارئین کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ ۔ ۔''

اور ۔ ۔ ۔ ۔

''حسرت موہانی کے بعد مولانا ظفر علی خاں پہلے مسلمان گریجوایٹ تھے جو اردو صحافت میں داخل ہوئے ۔ اس سے اردو صحافت کا وقار بلند ہوا اور لوگوں میں احساس پیدا ہوا کہ صحافت ایک اونچا پیشہ ہے ۔ وہ انگریزی اور اردو دونوں میں کمال دسترس رکھتے تھے اور اس طرح وہ معاشرے کے ہر گروہ میں تبادلۂ خیال کرنے پر قادر تھے ۔ ان کو زبان پر جو محیرالعقول عبور حاصل تھا ، اس کی بدولت انہوں نے اردو کی صحافتی زبان کو بے شمار سیاسی اصطلاحات اور نئے الفاظ سے آشنا کر دیا ۔

مولانا ظفر علی خاں کا ایک اور بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے لوگوں کے دلوں سے اجنبی راج کا خوف نکال دیا ۔ لوگوں کو معلوم ہوا کہ حاکم کے منہ پر سچی بات کہی جا سکتی ہے ۔ یہی

وجہ ہے کہ ان اخباروں کا چراغ گل ہو گیا جو ڈر کر لکھتے تھے۔ سچی بات منہ پر آتی تھی ، لیکن آتے آتے رہ جاتی تھی اور اس بزدلی کو وہ سلامت روی اور دور اندیشی اور احتیاط کا نام دیتے تھے^۷ ۔''

حوالہ جات

۱ ۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار : ظفر علی خاں ادیب و شاعر ، مکتبہ' خیاباں لاہور ۱۹۶۷ع ص ۱۰۷ ۔

۲ ۔ اشرف عطا : ظفر علی خاں ، پیش لفظ از مولانا صلاح الدین احمد ۔

3 - Michael O'Dwyer, India as I knew it p. 172.

۴ ۔ 'الہلال' کلکتہ ۔ اشاعت ۲۱ جنوری ۱۹۱۴ع ۔

۵ ۔ ماہنامہ فنکار لاہور ۔ (مضمون تاجور نجیب آبادی) اشاعت اپریل ۱۹۳۵ع ۔

۶ ۔ ظفر علی خاں ادیب و شاعر ، ص ۳۳ ۔

۷ ۔ صحافت پاکستان و ہند میں ، صفحات ۳۵۹-۳۶۰ ۔

مولانا محمد علی کی اداریہ نگاری

مولانا محمد علی جوہر نے اگرچہ میدان صحافت میں ۱۹۱۱ء میں قدم رکھا، مگر اس سے پہلے وہ ملک کے مؤثر اخبارات و جرائد میں مضمون لکھ کر شہرت حاصل کر چکے تھے۔ صحافت میں آمد کے بارے میں اپنے فیصلے کا ذکر انہوں نے یوں کیا ہے:

''اس مرحلے میں قومی معاملات و مسائل کے پیش نظر (صحافت) ہی ایک ایسا راستہ تھا جس پر چل کر میں کوئی مفید کام کر سکتا تھا اور ساتھ ساتھ روزی بھی کما سکتا تھا [۱]۔''

چنانچہ انہوں نے بڑے غور و خوض کے بعد قوم کی خدمت کے لیے صحافت کے خار زار میں داخل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ حالانکہ ان کو بڑے بڑے عہدوں کی پیش کش کی گئی، مگر ان کا ارادہ متزلزل نہ ہوا یہاں تک کہ جب وہ کامریڈ جاری کرنے کے لیے کلکتے جا رہے تھے تو انہیں ایک تار ملا جس میں ریاست ''جاورا'' کی وزارت عظمٰی کی پیشکش کی گئی تھی اور اس پیش کش کو مائیکل اڈوائر کی حمایت بھی حاصل تھی۔ مولانا محمد علی نے یہ تار اس وقت کھولا جب ''کامریڈ'' کا پہلا شمارہ کلکتے کے بازاروں میں پہنچ گیا تھا [۲]۔''

کامریڈ کا پہلا شمارہ ۱۱ جنوری ۱۹۱۱ء کو منظر عام پر آیا۔ انہوں نے یہ اخبار انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں جاری

مولانا محمد علی جوہر

کیا تھا ۔ نہ ٹائپ رائٹر تھا ، نہ سٹینوگرافر ، نہ دفتر تھا ، نہ ملازم ، سارا کام خود کیا ۔ مگر اخبار کے شائع ہوتے ہی گویا صحافتی دنیا میں ہنگامہ بپا ہو گیا ۔ انگریز حکام تلملا اٹھے کیونکہ ایک انگریز ہی کے الفاظ میں : ''محمد علی کا دل نپولین کا دل ، ان کی زبان برک کی زبان اور ان کا قلم میکالے کا قلم تھا ۔''

۱۹۱۲ء کے موسم خزاں کی ایک شام کو کلکتہ ہی میں وہ اپنے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ خبر رساں ادارہ رائٹر نے یہ خبر بھیجی :

''بلغاریہ کی فوجیں قسطنطنیہ سے صرف پچیس میل دور ہیں''

یہ خبر پڑھتے ہی ان کا رنگ متغیر ہو گیا ۔ اس سے انہیں اتنا صدمہ پہنچا کہ خود کشی کا ارادہ کر لیا ۔ لیکن خوش قسمتی سے عین اس وقت ایک دوست آ نکلا اور ان کو زبردستی اپنے ساتھ باہر لے گیا ۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام اور عالم اسلام کے سلسلے میں آپ کے جذبات کتنے شدید تھے ۔ بعد میں ان کی مساعی سے ۱۹۱۲ء میں ایک طبی وفد طبی سامان لے کر ترکی گیا ۔ جب دارالحکومت دہلی منتقل ہو گیا تو انہوں نے کامریڈ کا دفتر بھی وہیں منتقل کر لیا ۔ ۱۹۱۳ء میں حکومت نے اس اخبار کی کاپیاں ضبط کر لیں ۔ پریس سے ضمانت طلب کی گئی جو بعد میں ضبط کر لی گئی اور پھر کئی گنا زیادہ ضمانت مانگی گئی ۔ جب انہوں نے محسوس کیا کہ مغربی خبر رساں ادارے ترکی کے متعلق صحیح خبریں نہیں دیتے تو انہوں نے ''ایجنسی برائے خبرہائے ترکی'' قائم کرنے کا ارادہ کیا مگر یہ بیل منڈھے نہ چڑھی ۔

پہلی عالمگیر جنگ شروع ہوئی تو برطانوی اخبار ٹائمز نے ترکوں کا انتخاب ''The Choice of Turks'' کے زیر عنوان ایک اشتعال انگیز اداریہ لکھا ۔ مولانا نے جب یہ اداریہ پڑھا تو

بیماری کے باوجود قلم پکڑ کر بیٹھ گئے ۔ نہ سوئے ، نہ آرام کیا : وقفوں کے بعد سخت تیز قہوہ پیتے رہے ؛ چالیس گھنٹوں کے بعد لنڈن ٹائمز کے اداریے کا جواب اسی عنوان کے تحت تیار تھا ۔ یہ اداریہ کامریڈ میں ۲۶ ستمبر ۱۹۱۴ع کو انیس کالموں میں چھپا ۔ اس سے انگریزوں کے ایوان اقتدار میں زلزلہ آ گیا ۔ یہ اداریہ ضبط کر لیا گیا ۔ کامریڈ پریس کی ضمانت بھی ضبط کرلی گئی ۔ انگلستان کے اخبار سٹیٹسمین نے اداریے پر اپنے افتتاحیہ میں تبصرہ کیا اور لکھا کہ ''ہندوستان کے مسلمانوں کو وفاداری کی انوکھے انداز سے ترغیب دی جا رہی ہے ۔ حکومت اس مضمون سے اتنی خائف تھی کہ ۱۹۴۴ع میں بھی اس کی اشاعت کی اجازت نہ دی گئی [۳] ۔''

مولانا محمد علی نے حکومت کی سختیوں کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا اور ''کامریڈ'' میں لکھا : ''ہم نے جس بات کو صحیح سمجھا آزادی کے ساتھ اس کا اعلان کیا اور اسے ہر کسی تک ہر جگہ پہنچایا ۔ اگر کبھی سچ کا اعلان ببانگ دہل نہ ہو سکا تو غیر صحیح بات بھی نہ کی ۔ ہم زندگی اور موت کے مفہوم میں کبھی نہیں مریں گے ۔ ہم اس لیے زندہ رہے کہ ہم نے جرأت سے کام لیا ۔ ہم آئندہ بھی جرأت کا مظاہرہ کریں گے اور زندہ رہیں گے ۔'' آخر مولانا محمد علی اور ان کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی گرفتار کر لیے گئے ۔ کامریڈ نومبر ۱۹۱۴ع میں بند ہو گیا ۔ اس کے بعد اداریہ ''ترکوں کا انتخاب'' کا ترجمہ ''ہمدرد'' میں شائع کیا جانے لگا تو اس پر بھی حکومت کا عتاب نازل ہوا ۔

مولانا محمد علی کے اداریے

مولانا محمد علی صحافت کے اصولوں اور فنی امور سے پوری طرح واقف تھے ۔ انہوں نے ۶ جنوری ۱۹۱۲ع کے کامریڈ میں لکھا تھا کہ :

''صحافی سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ واقعات کو پوری

صحت سے درج کرے۔ اسے خیال رکھنا چاہیے کہ واقعاتی صحت کا معیار اتنا بلند ہو کہ مؤرخ اس کی تحریروں کی بنیاد پر تاریخ کا ڈھانچا کھڑا کر سکے۔ صحافی رائے عامہ کا ترجمان ہی نہیں راہنما بھی ہوتا ہے۔ اسے صرف عوام کے دعاوی کی تائید و حمایت نہیں کرنی چاہیے، بلکہ صحافتی منبر سے عوام کو درس بھی دینا چاہیے۔''

اسی طرح اداریہ اور اخبار کے مجموعی کردار کے متعلق بھی وہ پختہ رائے رکھتے تھے یعنی :

* اخبار ذاتیات سے بالکل مبرا ہو ؛ نہ کسی دشمن کے خلاف کچھ لکھا جائے، نہ خواہ مخواہ دوستوں کی تعریف کے قصیدے گائے جائیں۔

* کسی شخص یا اخبار کی رائے کے خلاف کچھ لکھنا ہو تو وہ مخالفت محض رائے تک رہے، ذات کا حصہ شامل نہ ہو۔

* جو کچھ لکھا جائے، عبارت آرائی کے خیال سے نہیں، نہ لوگوں کے چٹکیاں لینے کی غرض سے، بلکہ متانت سے اور نہایت سنجیدگی کے ساتھ ۔۔۔

* اخبار کا مقصد اپنی قوم کو نفع پہنچانا ہونا چاہیے نہ کہ دوسری قوم کو نقصان پہنچانا، اس لیے دوسروں کے رنج پر اپنے کو خوش نہ ہونا چاہیے۔

* مضامین میں ایک ایڈیٹوریل ہو، کسی ایسے موضوع پر جو اس زمانے میں زیر بحث ہو۔ اور یہ مضمون اخبار بھرنے کی غرض سے نہ لکھا گیا ہو بلکہ ایسا ہو کہ جس کا لکھا جانا نہایت ضروری تھا۔ مضمون پولیٹیکل ہو، خواہ سوشل، خواہ تعلیمی، خواہ تجارتی۔

* ایڈیٹوریل نوٹ حال کے واقعات اور خبروں پر اپنی رائے زنی کے لیے ہے اس لیے اسی کام میں آنا چاہیے -

* ایک مضمون کسی اور کا بھی ہونا چاہیے - خواہ وہ کسی خبر کے متعلق ہو یا کسی مستقل موضوع پر - ۳ ''

مولانا محمد علی نے ۲۳ جنوری ۱۹۲۸ع کے ''ہمدرد'' میں ''میری صحافت'' کے زیر عنوان لکھا تھا :

''میں صحافت کو تھوڑا بہت جانتا ہوں ، لیکن صحافت کو میں نے کبھی بھی منتہاے مقصود نہیں سمجھا - ملک و ملت کی خدمت کا ایک ذریعہ سمجھ کر کامریڈ نکالا تھا اور اسی غرض سے اب ہمدرد نکل رہا ہے - اور خدا کرے کہ جلد پھر کامریڈ بھی نکل سکے- اس لیے میں صحافت میں بعض اوقات وہ طریقے استعمال کر لیا کرتا ہوں جنھیں عام طور پر بدعت سمجھا جاتا ہے -

- - - صحافت سے میری غرض صحافت نہیں ہے ، ملک و ملت کی خدمت ہے ، اور اگر ایک مختصر مضمون سے صحیح طور پر ملک و ملت کی رہنمائی ہو سکتی ہے تو میں وہ بھی لکھ سکتا ہوں، اور لکھوں گا - لیکن اگر انیس نہیں اڑتیس کالموں کے مضمون سے صحیح رہنمائی ہو سکتی ہے تو میں اتنا طویل مضمون بھی لکھ سکتا ہوں اور ضرور بالضرور لکھوں گا - غرض ملک و ملت کی خدمت ہے : جس طرح بہترین طریقے پر ملک و ملت کی خدمت ہو سکے گی - انشاءاللہ کی جائے گی -''

مولانا محمد علی نے اپنے اس تصور کو پہلے ''کامریڈ'' اور پھر ''ہمدرد''کی صورت میں عملی شکل دینے کی کامیاب کوشش کی - مولانا محمدعلی کی انگریزی صحافت ان کی اردوصحافت پر غالب ہے- انھوں نے کامریڈ میں معرکۃ لآرا اداریے اور مضامین لکھے - کامریڈ کے

حلقۂ قارئین میں بہت سے انگریز بھی شامل تھے ۔ گورنر جنرل ہندوستان کی انتظامی کونسل کے رکن مالیات سر گائی فلیٹ وڈ (Guy Fleetwood) جب انگلستان واپس جانے لگے تو انھوں نے مولانا محمد علی جوہر سے کہا :

"میں کامریڈ کے پرچے اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں ، اپنے دوست کے لیے جو لنڈن پنچ کے ایڈیٹر ہیں ۔ اس سے بہتر کوئی تحفہ نہیں لے جا سکتا ۔ ان کے طرز تحریر اور آپ کے طرز تحریر میں اتنی مشابہت ہے کہ دونوں میں تمیز کرنا مشکل ہے[۵]۔"

آپ کا طرز تحریر انگریزی اور مشرق زبانوں کے کلاسیکی ادب کے طویل مطالعے سے پیدا ہونے والے امتزاج کا نتیجہ ہے ۔ آپ الفاظ کا استعمال ایک فنکار کی طرح کرتے ہیں مگر اس میں اپنے جذبے کی حرارت اور تصور کی رعنائی سمو کر اسے خوبصورت اور مؤثر بنا دیتے ہیں ۔ مسٹر لوواٹ فریسر (Louat Fraser) ایڈیٹر ٹائمز آف انڈیا نے مولانا کی وفات پر لکھا تھا کہ :

"ان کی وفات کے بعد ان پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں یہ ذکر نہیں کہ ان کو انگریزی زبان پر ایسا حیرت انگیز عبور حاصل تھا کہ کسی اور ہندوستانی کو نہیں تھا ، اور شاید بہت کم انگریز ان سے بہتر لکھ سکتے تھے ۔"

اسی طرح بمبئی کرانیکل نے اپنے اداریے میں لکھا تھا کہ :

"محمد علی نے قلم کے ذریعے اپنا دل کامریڈ میں منتقل کر دیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ انسانوں کی سیاست ، ان کے اعمال اور حرکات کی جو عکاسی آپ نے کی ہے وہ کوئی اور نہیں کر سکا اور شاید کبھی نہ کر سکے ۔"

کامریڈ میں ان کا اداریہ صفحہ دو پر چھپتا تھا اور عموماً

ہر اداریہ طویل ہوتا تھا ۔ ان کا تاریخی اداریہ ''ترکوں کا انتخاب'' انیس کالموں پر محیط تھا ۔ وہ عموماً قومی یا بین الاقوامی سیاست پر اداریے لکھتے تھے ، لیکن زیادہ زور حکومت ہند اور برطانوی حکومت کے سامنے مسلمانوں کا مؤقف پیش کرنے پر صرف ہوتا تھا ۔ انہوں نے ملک میں اصلاحات ، ملازمتوں میں ہندوستانیوں کی بھرتی اور تعلیم کرنے کے حق میں بھی لکھا ۔ تقسیم بنگال کی تنسیخ کی ڈٹ کر مخالفت کی اور اسے انگریزی حکومت کی ناانصافی اور سنگین جرم قرار دیا ۔ آپ ہندوستان کو متحد رکھنے کے حق میں نہیں تھے ۔ ۱۴ جنوری ۱۹۱۱ء کے کامریڈ میں انہوں نے لکھا :

''ہمارا اس نعرے پر یقین نہیں ہے کہ ہندوستان متحد ہے ۔ ہندوستان کے مسائل کم و بیش بین الاقوامی مسائل ہیں ۔''

وہ ہندوستان کو ایک وفاق کی شکل دینے کے حامی تھے ۔

۶ جنوری ۱۹۱۱ء کے کامریڈ میں انہوں نے لکھا :

''۔۔۔۔ آج کا ہندوستان متحد نہیں ہے؛ ہمیں متحدہ ہندوستان کی تخلیق کرنی ہے اور ایسا کرنے کے لیے پہلی شرط یہ اعتراف ہے کہ ہندوستان متحد نہیں ہے ۔''

جب بھی مسلمانوں کے جداگانہ وجود کو چیلنج کیا جاتا وہ اس چیلنج کو قبول کرکے مقابلے میں آ جاتے ۔

مولانا محمد علی نے صحافت کی آزادی کے لیے بھی بڑا کام کیا ۔ انہوں نے کامریڈ کے خلاف حکومت کے اقدامات کو پہلے کلکتہ ہائی کورٹ میں چیلنج کیا ، پھر پنجاب ہائی کورٹ میں ۔ اگرچہ دونوں جگہ فیصلے ان کے خلاف ہوئے مگر اس سے صحافیوں کے حوصلے بلند کرنے میں مدد ملی ۔ روزنامہ زمیندار سے ضمانتوں کی طلبی اور ان کی ضبطی کا سلسلہ شروع ہوا تو مولانا

محمد علی نے لکھا :

''جن افسروں کا ہندوستانی زبانوں کا مبلغ علم تھوڑا تھا ، ان کو یقین دلا دیا گیا کہ زمیندار نے خطرناک قسم کے مضامین شائع کیے ہیں ۔ ایک اطلاع کے مطابق ایک اعالی افسر نے ایڈیٹر کو بتایا کہ اخبار پر اعتبار سے قابل اعتراض ہے اور اب لاہور کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے روزانہ اور ہفتہ وار ایڈیشنوں سے ایک ایک ہزار روپے کی ضمانت طلب کر لی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آخر ٹریپولی (طرابلس) کی جنگ یا ایران میں روس کے اقدام سے پریس ایکٹ کا کیا تعلق ہے ؟ ہم ملک معظم جارج پنجم کی رعایا ہیں یا زار روس اور بادشاہ وکٹر ایمانویل کی ؟''

انہوں نے ۱۹۱۰ء کے پریس ایکٹ کے خلاف بار بار اداریے لکھے ۔

اردو اداریہ نگاری

مولانا نے کامریڈ جاری کرتے وقت 'ہمدرد' جاری کرنے کا منصوبہ بھی بنایا تھا ۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ :

''کامریڈ تو انگریزی خوانوں کے لیے ہوگا مگر ۔ ۔ ۔ ۔ باقی مسلمانان ہند کی خدمت کے لیے جو اس ملت مرحومہ کا سواد اعظم ہیں ، ایک روزنامہ اردو میں بھی شائع کیا جائے ۔ ۔ ۔ ۔ میں کامریڈ ہمدرد پریس ۱۹۱۲ء میں قائم کر سکا اور دارالحکومت کی تبدیلی کے بعد ۱۹ ستمبر ۱۹۱۲ءکو دہلی پہنچ گیا ۔ وہاں آتے ہی ایک نئی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا ۔ یعنی جس وقت دہلی سے کامریڈ کا پہلا پرچہ نکلا ، ترک جو ابھی جنگ طرابلس کی مصیبت سے نکلنے نہ پائے تھے ، جنگ بلقان کی تازہ مصیبت میں گرفتار ہو گئے ۔ بیروت سے نسخ کا جو ٹائپ منگایا تھا وہ دیر سے آیا اور اس پر بھی ضرورت سے کم ۔ ۔ ۔ ۔ (آخر) ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء سے ایک ایک

ورقہ 'نقیب ہمدرد' بن کر آنے والے 'ہمدرد' کی منادی کرنے لگا بالآخر بیروت سے کافی ٹائپ آ گیا تو 'ہمدرد' کی بسم اللہ ہوئی'' اور مولانا نے اس کے اداریے میں لکھا :

''اخباروں کی گرم بازاری عاشق کے گھر کی رونق سے کسی طرح کم نہیں ۔ دونوں ایک ہنگامے پر موقوف ہیں اور دونوں کے لیے ع نوحہ' غم ہی سہی ، نغمہ شادی نہ سہی ۔ ۔ ۔

چوں کہ ہمدرد کے نکلنے تک جنگ بلقان کا خاتمہ ہو چکا تھا اور چونکہ کم از کم مسلم اخبارات کے خریدار زیادہ تر جنگ و جدال اور حرب و قتال ہی کی خبروں سے محظوظ ہوا کرتے ہیں ان کا فروخت کرنے والا صحیح طور پر شاعر کی طرح کہہ سکتا ہے کہ :ع

من قاش فروش دل صد پارۂ خویشم

اس لیے اس وقت 'ہمدرد' کا جاری ہونا ایک منڈی کے بازار میں سودا کرنے کے مترادف تھا ۔ اس لیے میں نے لکھا تھا کہ 'ہمدرد' نوحہ' غم سے بھی گھر کی رونق نہیں بڑھا سکتا[6] ۔''

چنانچہ 'ہمدرد' کے اجرا سے پہلے ہی ان کے ذہن میں اس کا واضح تصور موجود تھا ۔ انھوں نے اس سلسلے میں ۲۷ اپریل ۱۹۱۲ء کے کامریڈ میں لکھا تھا جس کا خلاصہ یہ ہے :

''میں ایک ایسا اول درجے کا اردو روزنامہ جاری کرنا چاہتا ہوں جس میں سجاد حیدر یلدرم ، عنایت اللہ ، مولوی عبدالحق ، خواجہ غلام الثقلین ، شیخ عبدالقادر ، سید محفوظ علی بلکہ علامہ اقبال بھی ارکان ادارہ ہوں ۔ 'پیسہ اخبار' کے سائز پر آٹھ صفحے ہوں جن میں کم سے کم چھ صفحے پڑھنے کے مواد پر مشتمل ہوں ۔ رائٹر اور ایسوسی ایٹڈ پریس کی سروس لی جائے ۔ اس کے علاوہ کئی سفری نامہ نگار مقرر ہوں جو ملک کے بعض

علاقوں میں گھوم پھر کر حالات کا مشاہدہ کریں اور وقتاً فوقتاً ان علاقوں کے عوام کے حالات ، ضروریات ، شکایات ، سیاسی آرا ، تجارت ، صنعت اور تعلیم وغیرہ پر مکاتیب لکھیں ۔ علاوہ اداریوں کے خصوصی مقالے بڑے اہتمام سے ایسے لوگوں سے لکھوائے جائیں جنھوں نے متعلقہ موضوعات کا خاص مطالعہ کر رکھا ہے ۔''

مولانا کے اس معیار پر اس دور کے بھی بہت کم اخبار پورے اترتے ہیں ۔ تاہم انھوں نے مشکلات کے باوجود اس تصور کو 'ہمدرد' کی صورت میں عملی شکل دینے کی کوشش کی ۔ 'ہمدرد' نے مدلل ، متین اور سنجیدہ صحافت کی طرح ڈالی ۔ رائے عامہ کی عکاسی بھی کی اور رہنمائی بھی اور معیاری صحافت کا قابل تعریف نمونہ پیش کیا ۔

ہمدرد میں میر محفوظ علی ، سید ہاشمی فرید آبادی ، قاضی عبدالغفار ، مولوی عبدالحلیم شرر ، مولانا سید حبیب جالب دہلوی اور ڈاکٹر سید احمد بریلوی جیسے لوگ ادارتی عملے میں شامل کیے گئے ۔ دیدہ زیبی ، افتتاحیہ ، بلندپایہ مضامین ، علمی مقالے ، تفریحی مضامین ہمدرد کی خصوصیات تھیں ۔ مولانا چونکہ انگریزی صحافت کے اصولوں سے واقف تھے اس لیے انھوں نے اردو صحافت کو بھی انھی اصولوں سے آشنا کیا ، بلکہ اس اخبار میں :

''بعض خوبیاں ایسی بھی تھیں جو بہت کم انگریزی اخباروں میں نظر آئیں گی'' ۱۸ مئی ۱۹۱۵ء کو مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی نظر بند ہو گئے اور 'ہمدرد' پر ایسا سنسر عائد کر دیا گیا جس کا مقصد اخبار کو بند کرنا تھا ۔ چنانچہ اگست ۱۹۱۵ء میں 'ہمدرد' بند کر دیا گیا ۔

۹ نومبر ۱۹۲۴ء کو انہوں نے دوبارہ ہمدرد جاری کیا ؛ اس کے بعد کامریڈ نکلا مگر اس دفعہ 'ہمدرد' میں وہ بات پیدا نہ

ہو سکی جو پہلے دور کے 'ہمدرد' میں تھی ۔ اس سلسلے میں مولانا نے ۲۷ اپریل ۱۹۲۷ء کے 'ہمدرد' میں لکھا ۔۔۔۔۔ ''میں ہرگز اس کا دعویٰ نہیں کرتا کہ 'ہمدرد' میں تمام وہ خوبیاں موجود ہیں جو ایک اخبار کو جائز طریقے پر دلچسپ بناتی ہیں ۔ 'ہمدرد' ان میں سے اکثر سے معریٰ ہے ۔۔۔۔۔ اور ان میں سے اکثر سے 'ہمدرد' کو خود اپنے قلم کے ذریعے سے دلچسپ بنا سکتا ہوں مگر میرے سامنے جو کام ہے وہ ہرگز مجھے اتنی فرصت نہیں دیتا کہ واعظ و ناصح بھی میں ہی بنوں اور مطرب و ندیم بھی میں ہی ؛ اور اتنا سرمایہ نہیں کہ واعظ و ناصح اور مطرب و ندیم سب کو جمع کر سکوں ۔'' چنانچہ ۱۲ اپریل ۱۹۲۹ء کو ہمدرد بند کر دیا گیا ۔

دوسرے دور کے اداریوں میں مولانا محمد علی اور ان کے 'ہمدرد' نے شدھی اور سنگھٹن کی مخالفت کی ۔ سائمن کمشن کے مقاطعے کی حمایت کی ۔ دو لیگیں بنیں تو جناح لیگ کی تائید کی ۔ نہرو رپورٹ کی زبردست مخالفت کی ۔ دوسرے دور میں ان کے اداریے بہت طویل ہوتے تھے اور ان میں خطابت کا انداز نمایاں ہوتا تھا ۔

ادارتی کانفرنس

اخبار کو بہتر بنانے اور اداریے لکھنے سے پہلے موضوع کے انتخاب اور اس میں اظہار رائے کے سلسلے میں صلاح مشورہ کرنے یعنی ادارتی کانفرنس کی روایت بھی مولانا ہی نے قائم کی ۔۔۔ بقول قاضی عبدالغفار :

''۔۔۔ کیا زمانہ تھا جب 'ہمدرد' اور کامریڈ کے دفتر میں صبح اور شام تمام ممبران سٹاف اخبار کے متعلق مشورے میں شریک ہوتے تھے ۔ شوکت علی ، محمد علی ، سید محفوظ علی ، راجہ

غلام حسین ، میں اور دو چار اور۔ ہم سب زیر بحث مسائل پر بحث کرتے تھے اور محمد علی صاحب ایک ایک کو اس کے کام کے متعلق ہدایت دیتے تھے ۔ ان کے دماغ کی ہمہ گیری کا یہ عالم تھا کہ جب ایک چھوٹا سا نوٹ لکھنے کے لیے بحث کے خاص خاص پہلو بتانا شروع کرتے تھے جو اگر سب حیطہ' تحریر میں لائے جاتے تو ہمدرد کے آٹھ دس کالم پر ہو جاتے[۸] ۔''

مثالیں

۱۳ ، ۱۴ اور ۱۵ مئی ۱۹۲۵ء کے شماروں میں حج اور اس کے فلسفے پر اداریے لکھے گئے اور اتحاد بین المسلمین پر زور دیا گیا ۔ آپ نے فلسفہ' حج کا ذکر کرتے ہوئے لکھا :

''۔۔۔۔ اس طرح حج بیت اللہ کی شرکت سے کیسی خوبصورتی سے تمام اسلامی دنیا ایک فلاکت زدہ ملک کے اسلامی بھائیوں کی مصیبت سے آگاہ ہو سکتی ہے اور کیسی آسانی سے اس کی مصیبت میں شریک ہو کر اسے دور کر سکتی ہے ۔''

''دشمنان اسلام ہم کو الگ الگ ملکوں میں رکھ کر تباہ و برباد کر ڈالیں گے ۔ اس پراگندگی اور ابتری سے بچنے کا طریقہ خود خداوندکریم نے ہمیں رسول اکرمؐ کی معرفت بتا دیا ہے ۔۔۔۔''

''اگر دہلی کے مسلمانوں کو لکھنؤ کے مسلمانوں سے کوئی واسطہ نہیں ، اگر ہندوستان کے مسلمان کا ترکی مسلمانوں سے تعلق نہیں ؛ اگر چین کے مسلمان کو مراکش کے مسلمان سے کوئی سروکار نہیں تو پھر ہم سب لنڈورے اور دم کٹے ہیں ؛ آج مرے کل دوسرا دن ؛ نہ مسلمان رہیں گے نہ اسلام ۔۔۔۔۔''

مولانا محمد علی نے ۱۹ جنوری ۱۹۲۷ء کے 'ہمدرد' میں اسمبلی ہال (نئی دہلی) کی رسم افتتاح کے موقع پر ''انگریز اور

انگریزوں کی سیاست'' کے زیر عنوان لکھا :

''بظاہر اخباری دنیا میں رہتا ہوں مگر بہ قول غالب ؂

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

. . . ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسمبلی اور کونسلوں کے لیے انتخابات کل ہی شروع ہوئے تھے اور ''قتل کی رات'' والا مضمون کل ہی لکھا تھا ۔ مگر ڈائریکٹر معلومات عامہ کی نوازش سے 'بکار سرکار' ایک طویل و عریض لفافہ موصول ہوا جس میں ایک ٹکٹ بند تھا ۔ اس ٹکٹ نے اطلاع دی کہ ۱۸ جنوری کو ۱۱ بجے دن کے وائس رائے مجالس قانون ساز کے لیے جو محل تعمیر ہوا ہے اس کا افتتاح فرمائیں گے ۔ تارک موالات ہوں ، حکومت کی بے وفائی پر وفا داری کا حلف نہ اٹھانے کا حلف اٹھا چکا ہوں ۔ اسمبلی اور کونسلوں کی جنگ زرگری کو شاعری سے زیادہ کار بے کاراں سمجھتا ہوں بلکہ اس کی میری نگاہ میں چخ چخ دندان سے زیادہ وقعت نہیں ہے ۔ مگر ملک و ملت کی خبر گیری نے خبر رسانی کو میرا پیشہ بنا دیا ہے ؛ 'ہمدرد' نے مجبور کیا کہ اس افتتاحی جلسے میں شریک ہوں اور دیکھوں کہ کیا ہوتا ہے اور سنوں کہ کیا ملتا ہے ؂

اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچہ' رقیب میں بھی سر کے بل گیا

مقامی معاصرین نے نہ معلوم کس بنا پر توقعات کا پہلے ہی سے ایک طومار باندھ رکھا تھا ۔ ''دنیا بہ آمید قائم ہے'' ، بیچارے مختلف ملتوں اور فرقوں کو لڑانے کے سوا جب اور کچھ نہیں کر سکتے اور خلاق سے خود معذور ہیں تو امید ہی کی خلاق پر دار و مدار ہے . . . .

چنانچہ کل کے اخبارات میں یہ امید ظاہر کی گئی تھی کہ مرادوں کے دن جلد آنے والے ہیں ۔ اصلاحات کی توسیع کے لیے شاہی کمشن کے تقرر کا غالباً آج کی تقریر میں حضور وائسرائے اعلان فرمائیں گے ۔ کتنے سادہ لوح ہوں گے جو اپنے دلوں میں اس آرزو کو چھپائے ہوئے امید و بیم کی حالت میں رات سینا گنے ہوں گے اور کتنے ہوں گے جن کا اصول زندگی عشاق کی طرح یہی ہے کہ ؎

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

یہ نام کے عاشق اسی میں مگن ہیں کہ اصلاحات کی توسیع کے لیے شاہی کمشن مقرر ہو یا نہ ہو نائب شہنشاہ کا درشن تو نصیب ہو گا ۔ اسی سے بھاگ کھلیں گے ۔ ملک کی وارث خالق کے حکم سے تو خلق ہی تھی مگر اس نے بادشاہت اور شہنشاہیت کے فریب میں آ کر اپنی آزادی بلکہ ملکیت کو غلامی کے عوض بیچ دیا اور وہ حقیقت شناس ہستیاں بھی جن سے توقع کی جا سکتی تھی کہ ''انی جاعل فی الارض خلیفۃ'' کے ترکے کو کبھی کسی کے فریب میں آ کر نہ چھوڑیں گی ، وہ بھی بظاہر دولت و ثروت سے محروم ہو کر اس فریب دہی پر مجبور تھیں کہ بادشاہوں کو دیکھ کر قصیدوں میں لکھیں ؎

ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے
اب فریب طغرل و سنجر کھلا

جب خواص کی ذہنیت کی یہ حالت ہو تو اس ''درشنیہ'' فرزند سے جس کا نام خلق ہے کیا توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ اپنے سوا کسی اور کو ملک کا حقیقی وارث نہ جانے گی اور کم سے کم کل کے آئے ہوئے ایک اجنبی کو ملک کا وارث سمجھ کر دیکھنے

نہ جائے گی ۔ کاش طغرل و سنجر کے فریب کی طرح قیصر ہند اور
نائب قیصر کا فریب کھل جاتا اور کوئی ان تماشائیوں سے کہتا
کہ ؎

اے تماشا گاہ عالم روے تو
تو کجا بہر تماشا می روی

تیس کروڑ خدا کی مخلوق یعنی نسل انسانی کا ایک خمس مٹھی بھر
اجنبیوں کی غلامی میں مبتلا ہے جو سات ہزار میل کے فاصلے سے
سات سمندر پار آ کر ان پر حکومت کرتے ہیں ۔ عجوبۂ روزگار
یہ چیز ہے کہ پانچ براعظموں کے تماشائی دور دراز مقامات سے
آ کر تاج بی بی کا روضہ اور دلی کا لال قلعہ یا قطب مینار کی جگہ
اس کا تماشا کریں تو تعجب کی بات نہیں لیکن آج یہ مخلوق
خود دوسروں کی تماشائی ہے ؎

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تو ، کھیتی بھی تو ، باراں بھی تو ، حاصل بھی تو

(علامہ اقبال کی یہ نظم درج کرنے کے بعد مزید لکھتے ہیں)
اس دانے کو ، اس کھیتی کو ، اس باراں کو ، اس حاصل کو ،
اس راہ کو ، اس راہرو کو ، رہبر کو ، منزل کو ، اس ناخدا
کو ، بحر کو ، کشتی کو ، ساحل کو ، اس قیس کو ، لیلی
کو ، صحرا کو ، محمل کو ، اس مے کو ، مینا کو ، ساقی کو ،
محفل کو ، آوارہ عناں تاب راۓ مینا کو سڑکوں پر دیکھا کہ
داخلے کے ٹکٹ ہاتھ میں لیے ہوئے جا رہی ہے ۔ گویا وہ بھی
کسی تاریخی خاندان کا شجرہ یا جنت کے لیے پروانۂ راہداری ہے ۔
منزل مقصود پر پہنچے تو گویا اپنا دل بھی یہی کہتا تھا ؎

یاں قافلہ لٹتا ہے بس اب یاں سے چل اے دل
تو آپ ہی کہہ دے گا کہ منزل تو نہیں ہے

(جوہر)

۔۔۔۔وائسرائے کی تقریر سنی اور ضرور سنی۔۔۔مگر گوش مژدہ نیوش پوری تقریر میں ایک حرف مطلب بھی نہ سن سکا ۔ سارے ملک میں سرکار والا تبار کے قدوم میمنت لزوم نے تفریق و انتشار پھیلا رکھا ہے ، لیکن لاٹ صاحب بہادر نے فرمایا کہ یہ قانون سازی کا گول گھر اتحاد کی علامت ہے اور ملک کے اتحاد ہی کی نہیں بلکہ سرکار ابد قرار کی ابدیت کی بھی نشانی ہے اور کیوں نہ ہو ہمارے تعلیم یافتہ ہمیشہ ہمیشہ اسی چکر میں رہیں گے اور یہ دائرہ السوء اسی طرح تا قیامت باقی رہے گا ۔ اگر غالب آج زندہ ہوتے آج بھی کہتے مگر ایک اور لہجے میں کہ ؎

جانتا ہوں ہے خط لوح ازل
تم پہ اے خاقان نام آور کھلا

تم کرو صاحب قرانی جب تلک
ہے طلسم روز و شب کا در کھلا

خیال تھا کہ کم سے کم شاہی کمشن کے تقرر کا اعلان ہو گا مگر صرف دعا پر تقریر کا خاتمہ ہوا ، دوا کا نام بھی نہ تھا ۔ لاٹ صاحب نے دعا فرمائی کہ خدا اس عمارت میں کام کرنے والوں کو عقل و عدل کی توفیق دے ! ہم سوائے آمین کے کیا کہہ سکتے تھے ۔ خدایا اگر ان کو عدل نہیں دیتا تو ہمیں کو عقل دے کہ اس فریب عدل سے نجات پائیں ۔ اب سب کی نظریں ۱۹۲۹ع پر لگی ہوئی ہیں لیکن جو کچھ ہوگا ہمیں معلوم ہے ۔ کمیشن کا تقرر ہی جس قوم کا آفق آرزو ہو اسے کیا ملے گا ۔ سب یہی کہیں گے کہ ؎

انتیسویں کو رخ کی ترے دید ہو گئی
اب چاہے چاند ہو کہ نہ ہو عید ہو گئی

۔۔۔۔الخ''

۱۲ جنوری ۱۹۲۹ع کے 'ہمدرد' میں ''کانگرس کی مہا سبھا نوازی'' کے زیر عنوان اداریے میں لکھا :

''.... تیس ، پینتیس سربرآوردہ مسلمانوں نے ان تجاویز پر اتفاق کیا جو ''تجاویز دہلی'' کے نام سے جلد مشہور خلائق ہو گئیں اور جنوں نے بہ قول سرنیواس آئنگر ہندو مہا سبھا کے بادبان میں سے ساری ہوا نکال ڈالی ۔ کانگرس کی مجلس عاملہ نے ان تجاویز کا خیر مقدم کیا ۔ مگر ہندو مہا سبھا نے اسی وقت سے ان کی اس طرح مخالفت شروع کر دی کہ مخلوط انتخاب کی اس تجویز کو جو متعدد شرائط سے مشروط تھی ، بطیب خاطر قبول کرنے کا اظہار فرمایا مگر سب شرائط کی مخالفت کی اور اس چیز کا جس سے محتاط مسلمان پہلے ہی سے لرزاں تھے ، بڑے زور شور سے پراپیگنڈا شروع کر دیا ۔ یعنی شرائط کو قطعاً نظر انداز کر کے مشہور کرنا شروع کر دیا کہ اب تو مسلمان بھی جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب سے دستبردار ہو گئے ۔ محتاط مسلمانوں نے مجھ سے ہر جگہ التجا کی تھی کہ خدارا ایک لفظ بھی جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے خلاف نہ لکھیے، نہ اس کا اظہار کیجیے کہ کسی حالت میں اور کتنی ہی شرائط کے ساتھ سہی ہم جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب ترک کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے ۔ کیونکہ ہندو فوراً گورنمنٹ سے (جس نے مسلمانوں کے ساتھ ۱۹۱۱ع میں امپیریل لیجسلٹو کونسل کلکتہ میں عہد کر لیا ہے کہ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب اس وقت تک قائم رکھے جائیں گے جب تک مسلمان خود نہ کہہ دیں کہ یہ ہمیں درکار نہیں) کہنا شروع کر دیں گے کہ لو اب تو مسلمان خود ان سے بیزار ہیں اور شرطیں ساری کی ساری دھری رہ جائیں گی۔ . . اس کے جواب میں میں ہمیشہ یہی کہا کرتا تھا کہ اتنا بھی اندھیر کہیں ہو سکتا ہے ! 'دہلی تجاویز' دراصل ایک تجویز کا نام نہیں اور وہ یہ ہے کہ اگر ہندو اقلیتیں پانچ صوبوں

میں ہمارے انصاف پر اعتماد کرنے کو آمادہ ہیں تو ہماری اقلیتیں بھی نو صوبوں میں ان کے انصاف پر اعتماد کرنے کو آمادہ ہیں ورنہ نہیں ......

افسوس کہ اپنی معبود اکثریت کی دیوی کی خاطر ہندو مہا سبھا سے مرعوب ہو کر پنڈت موتی لال نہرو نے دہلی کی تجاویز کو بھی حکومت کے سامنے پیش نہ ہونے دیا اور ڈاکٹر انصاری اور ان کے سواراجی رفقائے کار اپنے اس عہد سے پھر گئے جو بیس مارچ ۱۹۲۷ع کو رمضان شریف کے مبارک مہینے میں انہوں نے ہمارے ساتھ کیا تھا .... اب موتی لال جی کی کایا پلٹ ملاحظہ ہو ۔ مرکزی حکومت کو فرعونی اور نمرودی اختیارات دے کر ان صوبوں کی حکومتوں کو جہاں بھول چوک سے کہیں مسلمانوں کی اکثریت باقی رہ جائے ، غلام بنانے کے بعد ہندو مہا سبھائیوں کو کیا پڑی ہے جو کسی صوبے میں اپنی اقلیت کے لیے مزید نشستیں طلب کرے ۔ لہٰذا مئی ۱۹۲۷ع کے کانگرس کمیٹی کے فیصلے کو نہرو رپورٹ میں رد کر دیا گیا اور مسلم اقلیتوں کو صرف اتنی ہی نشستیں ملیں گی جتنی کہ ان کی آبادی کے تناسب سے ان کے لیے مخصوص کر دی گئی ہوں ۔ مسلم اکثریتوں کے لیے بھی کانگرس کمیٹی نے نشستیں مخصوص کر دی تھیں ، لیکن نہرو رپورٹ میں یہ بھی غائب ۔ لہٰذا اسمبلی میں جو ہندو مہا سبھا کا ہاؤس آف لارڈز یعنی دارالامرا ہوگا جہاں ہر وہ چیز منظور ہو سکے گی جسے وہ صوبے منظور کریں جہاں ہندو اکثریت ہے اور ہر وہ چیز نامنظور کی جا سکے گی جسے وہ صوبے منظور کریں جہاں گئی گزری مسلم اکثریت بھی کچھی باقی رہ گئی ہے ۔ مسلمانوں کو اتنی نشستیں ملنے کا بھی یقین نہیں جو ان کی آبادی کے تناسب کے مطابق یعنی پچیس فی صدی ہوں اور $33\frac{1}{3}$ فیصدی کا ذکر ہی فضول ہے ۔ پھر اقلیتوں کی

¾ اکثریت کو ویٹو (Veto) کا جو حق دستور کانگرس میں، میثاق لکھنؤ میں، دہلی کی تجاویز میں اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے ریزولیوشن میں دیا گیا تھا وہ بھی نہرو رپورٹ میں غتر بود کر دیا گیا اور اس رپورٹ کے لکھنے والے نہیں تو لکھوانے والے وہی پنڈت موتی لال نہرو ہیں جنھوں نے ایک سال قبل بمبئی میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے سامنے وہ ریزولیوشن پیش فرما دیا تھا جس کی تائید کرنے کے باعث آج ہم غداری کے مجرم ٹھہرائے جا رہے ہیں ....''

۱۲ اپریل ۱۹۲۹ء کے ہمدرد میں مولانا نے افتتاحیہ میں مشکلات اور مجبوریوں کا ذکر کرتے ہوئے 'ہمدرد' بند کرنے کے فیصلے کے متعلق لکھا؛ پھر اپنے اصل مشن کا ذکر یوں کیا:

''لیکن جو کام اب میں نے ساری عمر کے لیے اپنے لیے تجویز کر لیا ہے، خواہ وہ دہلی میں بیٹھ کر کیا جائے یا کہیں اور جا کر، وہ پہلے مسلمانوں میں اور پھر ساری دنیا میں فکر اسلامی پیدا کرنے اور کفر و الحاد کے اس سیلاب کا مقابلہ کرنے کا ہے جو یورپ سے وطن پرستی اور جنسیت و قومیت کی شکل میں امڈا آ رہا ہے اور جو ترکی اور ایران، شام اور عراق ہی نہیں بلکہ افغانستان اور ہندوستان میں بھی نوجوان مسلمانوں کو خدا اور آخرت دونوں سے انکار کی طرف مائل کر رہا ہے۔ اسلام ہرگز حب وطن اور غیر مسلموں کے ساتھ آزادی اور حریت اور بنی نوع انسان کی خدمت میں تعاون کرنے کے برخلاف نہیں اور اس معنی میں ہر مسلم کو ملک پرور اور محب وطن بننا لازمی ہے اور خدا نہ کرے کہ وہ دن آئے کہ مسلمانان ہند اپنی موجودہ غلامی پر رضامند ہو جائیں... لیکن کوئی مسلم اس حب وطن اور جنسیت اور قومیت کا ہرگز قائل نہیں ہو سکتا جو عرب کو عجم سے، ترک کو تاجیک سے یا ہندی کو افغانی سے جدا کرے۔ آیۃ:

(خداوندکریم نے تمام انسانوں کو ایک ہی قوم بنایا تھا ، پھر ان میں انبیاء اس غرض سے مبعوث فرمائے تھے کہ وہ نیکو کاروں کو فلاح دارین کی خوشخبری سنائیں اور بدکاروں کو دنیوی تباہی اور اخروی رسوائی سے ڈرائیں اور اسی لیے ان کے ساتھ صحف سماوی نازل فرمائے کہ جن امور میں لوگوں میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا ان میں سب کو راہ راست دکھا کر اس اختلاف کو مٹائیں اور دنیا میں امن و آشتی قائم ہو)

یورپ کے جو نام نہاد سیاستدان اور مدبر اور مغرب کی نام نہاد تہذیب و تمدن کے نام لیوا بنی نوع انسان کو ملکوں ، قوموں اور رنگتوں میں تقسیم کر کے ایک کو دوسرے کے خلاف ابھار رہے ہیں ، وہ حقیقتاً ایک شیطانی کام کر رہے ہیں اور اگر وہ کامیاب ہو گئے تو اسلام جو ساری مخلوق کو بلا جبر و اکراہ آپس میں ملا کر دنیا میں امن و سلامتی کا دور دورہ قائم کرنے آیا ہے ، سمجھ لو کہ وہ خدا نخواستہ ناکام و نامراد رہا ۔ اس لیے میں بار بار کہتا ہوں کہ خدا نے انسان کو بنایا اور شیطان نے قوم کو بنایا ۔ یہی وہ فکر اسلامی ہے جس کی نشر و تبلیغ ہر مسلمان کا فرض ہے تاکہ دنیا میں جنگ و جدال کا خاتمہ ہو اور ساری خلقت بلا کسی تفریق حسب و نسب ، مرز و بوم اور زبان و رنگ کے دین فطرت پر چلنے لگے اور سارے عالم میں نور اسلام پھیل جائے۔ وہ نور جس کی تعریف میں سورۃالنور میں اسلام کے درخت کو اس زیتون کے نام سے پکارا گیا ہے جو لا شرقیۃ والا غربیۃ (نہ صرف مشرق ، نہ صرف مغربی) ہے ۔ جس نبی کو رب المشرقین و رب المغربین نے رحمت اللعالمین بنا کر کافۃ الناس کے لیے بھیجا تھا ، اس کا دین انسانی سرشت ہے ۔ فطرۃاللہ التی فطرالناس علیھا لا تبدیل لخلق اللہ ۔ وہی حضرت آدم کا دین تھا ، وہی آج ہر مولود کا دین ہے ۔ خواہ وہ کسی مسلم کے گھر پیدا ہوا ہو یا کافر کے گھر ۔ لوگوں نے دین فطرت

کو چھوڑ کر قوموں اور ملکوں کے جداگانہ دہن بنائے ہیں اور جداگانہ نام نہاد تہذیبیں گھڑی ہیں اور کل حزب بمالدیھم فرحون ہر ایک اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے ہوئے اپنی ڈالی پر اپنا ہی راگ بجا رہا ہے - ہمیں عصر نو کی اس فکری جنسیت کو دنیا سے مٹانا اور تمام دنیا کو ایک کر کے جنگ و جدل کی جگہ اسلام اور سلامتی کو پھیلانا ہے...... الخ''

غرض''.. محمد علی اسلامی ملت اور ہندی قوم کا قائد تھا اور نمائندہ بھی - ایک بیدار ہونے والے ملک، ایک خواب گراں سے جاگنے والی ملت کی ساری بیتابی، سارا وفور شوق، ساری سرگرمی، ساری خود فراموشی ایک پیکر خاکی میں جلوہ گر تھی .... اس نمائندے اور قائد کے سینے میں ایک آگ تھی جس کی چنگاری سے خفتہ ملتیں بیدار اور مردہ قومیں زندہ ہو جاتی ہیں - وہ آگ جو کبھی باطل قوتوں کے لیے بہت ناگوار شعلہ نوائی کی شکل میں ظاہر ہوتی، کبھی آنسو بن کر اس کی سرشار محبت آنکھوں سے ڈھلتی تھی۹-'' ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم کے ان مختصر الفاظ میں مولانا محمد علی جوہر کے سینے میں جس آگ کی موجودگی کا ذکر کیا گیا ہے، مولانا عبدالماجد دریا بادی نے اسے ذرا دوسرے انداز میں بیان کیا ہے : ''ملک کے طول و عرض میں بس ایک ہی ہستی ایسی تھی جس کی آواز مشرق نے بھی سنی اور مغرب نے بھی، شمال نے بھی اور جنوب نے بھی، ہمالیہ کی بلندیوں نے بھی اور گنگا کی لہروں نے بھی، پڑھے لکھوں نے بھی اور ان پڑھوں نے بھی، عالموں نے بھی اور جاہلوں نے بھی، بڑوں نے بھی، چھوٹوں نے بھی، سرداروں نے بھی اور خاکساروں نے بھی، وائسرائیگل کی چمکتی اور جگمگاتی ہوئی برجیوں نے بھی اور جیل خانے کی تنگ و تاریک کال کوٹھڑیوں نے بھی ... ۱۰ -''

مولانا محمد علی جوہر کے سینے میں سلگتی ہوئی آگ اور ان کی

'آواز' نے نہ صرف زندگی کے دوسرے شعبوں میں ہلچل مچائی بلکہ صحافت کے میدان میں بھی انقلاب برپا کیا۔ ان کے اخبارات مشرق میں بھی پڑھے گئے اور مغرب میں بھی ۔ ان کا مطالعہ حاکم بھی کرتے تھے اور محکوم بھی ۔ ان کے قلم اور زبان نے نہ صرف لوگوں کے دلوں سے انگریز کا خوف دور کیا بلکہ اپنا خوف انگریزوں کے دل میں بٹھایا ۔ حکمران جتنے ان سے خائف تھے اتنے کسی اور سے نہیں تھے ۔ مولانا کی معرکۃ الآرا اداریہ نگاری کے نمونے ''کامریڈ'' میں ملتے ہیں ، لیکن ان کی انگریزی اداریہ نگاری یہاں ہمارے دائرے سے باہر ہے ۔ ہمارے یہاں 'ہمدرد' کے ابتدائی دور کے فائل بھی نہیں ہیں اس لیے ان کی اداریہ نگاری کے جائزے کے سلسلے میں مثالوں کا دائرہ 'ہمدرد' کے دوسرے دور تک محدود ہے ، مگر یہ نمونے بھی اپنی جگہ پر مکمل ہیں ۔

اداریوں کی خصوصیات

۱ ۔ حق گوئی و بیباکی

مولانا محمد علی کے اداریوں کا سب سے بڑا وصف بیباکی اور حق گوئی ہے ۔ وہ جس بات کو صحیح سمجھتے نہایت جرأت کے ساتھ اس کا اظہار کرتے اور اس سلسلے میں لالچ ، خوف ، تعزیر ، قید و بند ، غرض کسی چیز کو خاطر میں نہ لاتے ۔ چنانچہ ان کی اس جرأت کے پیش نظر مائیکل اڈوائر نے کہا تھا کہ :

''محمد علی اور ظفر علی خاں دونوں پیدائشی صحافی ہیں[۱۱] ۔''

حکومت ان سے خائف رہتی تھی ۔ کامریڈ کی بندش کے بعد 'ہمدرد' پر بھی سخت سنسر شپ عائد کر دی گئی. . . اس سلسلے میں مولانا نے خود ایک لطیفہ بیان فرمایا ہے کہ ایک بار اداریے کی جگہ چڑیا اور چرطوئے کی کہانی لکھ کر سنسر کے پاس بھیج دی گئی تو اس نے اسے بھی شائع کرنے کی اجازت نہ دی ۔ جب

پوچھا گیا کہ یہ کہانی تو بے ضرر ہے ، اسے 'پاس' نہ کرنے کے کیا معنی ؟ سنسر کرنے والے نے کہا ''ہمدرد والوں کا کیا اعتبار ، ممکن ہے اس میں بھی کوئی زہر بھر دیا ہو اور جواب دہی میرے سر پر آ پڑے - روزی کا معاملہ ہے'' ۱۲ -

۲ - تکمیل مقصد

مولانا محمد علی صحافت کے اصولوں اور اداریہ نگاری کے تقاضوں سے باخبر ہونے کے باوجود اداریوں سے اپنے مشن کی تکمیل میں مدد لیتے تھے - چنانچہ ان کے اداریے خاصے طویل ہیں اور ان میں جگہ جگہ اشعار بھی استعمال کیے جاتے ہیں - مگر اس سلسلے میں انہوں نے خود ہی فرما دیا تھا کہ ''اداریے کے مختصر یا طویل ہونے کا انحصار ضرورت پر ہے -''

چنانچہ وہ 'مقصد کی وضاحت' اور اپنی بات ذہن نشین کرانے کی غرض سے عموماً طویل اداریے لکھتے تھے - بعض اداریے تو باقاعدہ 'مقالات' معلوم ہوتے ہیں -

۳ - صیغہ' واحد متکلم کا استعمال

وہ اداریوں میں صیغہ' واحد متکلم استعمال کرتے ہیں اور اپنی رائے کو اپنی رائے کے طور پر پیش کرتے ہیں - 'ہمدرد' یا 'ادارہ' کی رائے کے طور پر نہیں - ہر معاملے میں وہ اپنے نقطہ' نظر اور یقین کے مطابق ایک واضح اور ٹھوس فیصلہ صادر کرتے ہیں -

۴ - دینی جذبات

ان کے اداریوں میں دینی مقاصد اور محرکات بہت نمایاں ہیں :

۱ - اسلام کی سربلندی اور کفر و الحاد کی قوتوں کا خاتمہ

۲ - برصغیر پاکستان و ہند کی آزادی

۴ - بر صغیر کے مسلمانوں کی بہبود و بھلائی

کسی اداریے میں ایک جذبے کی کارفرمائی ہے ، کسی میں دوسرے کی - جہاں بھی جس جذبے کا اظہار ہوا ہے 'خلوص' اور یقین کے ساتھ ہوا ہے -

۵ - ہمہ گیری

مولانا اپنے اداریے عموماً کسی خبر یا اہم مسئلے یا رجحان پر مبنی کرتے ہیں مگر پھر اداریے کو اس خبر یا واقعے تک محدود رکھنے کے بجائے خبر یا واقعے کو اپنے نقطۂ نظر ، جذبات اور احساسات کے پس منظر میں دیکھتے ہیں اور اسے وسیع تر ، عمومی اور ہمہ گیر بنا دیتے ہیں - مثال کے طور پر ۱۹ جنوری ۱۹۲۷ع میں اسمبلی ہال دہلی کی رسم افتتاح کے موقع پر اداریہ لکھا تو انگریزوں کی سامراجی ذہنیت اور محکوم ہندوستانیوں کی مردہ حمیت کی تمام تفصیلات بیان کر ڈالیں - 'کانگریس کی مہاسبھا نوازی' کو اداریے کا موضوع بنایا تو ہندوؤں کی روش اور مسلمانوں کے ساتھ زیادتی کی پوری تفصیل بیان کر دی - مگر بعض اوقات وہ اداریے کا محور اپنی ذات کو بناتے ہیں ، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو ملک و ملت کی خدمت کے لیے وقف سمجھتے تھے اس لیے وقتاً فوقتاً اپنے اعمال و افعال اور سرگرمیوں کا مفصل حال بیان کرتے رہتے تھے تاکہ ان کی تمام سرگرمیاں لوگوں کے سامنے آ جائیں - چنانچہ ان کے اداریوں کے موضوعات میں اس قسم کے عنوان بھی ملتے ہیں ''میری ہجرت'' 'میری مصروفیات' 'فسانۂ غم دل' 'ملت کا خدمت گزار' 'ملت کا بھکاری' 'افسردگی اور بے چینی' وغیرہ وغیرہ -

۶ - اسلوب

مولانا محمد علی جوہر انگریزی کے بہت بڑے عالم تھے، اس لیے

اردو ، فارسی اور عربی پر قادر ہونے کے باوجود اپنے ہمعصر اکابر صحافیوں کی طرح عربی اور فارسی کے زیادہ الفاظ استعمال نہیں کرتے ۔ ان کی زبان آسان اور سیدھی سادی ہے ، البتہ کہیں کہیں موضوعات کی نسبت سے قرآن کریم کی آیات یا عربی و فارسی الفاظ استعمال کرتے ہیں ۔ بحیثیت مجموعی ان کی زبان آسان ہے مگر اسے اپنے جوش و جذبہ اور طنز کے نشتروں سے مؤثر بنا دیتے ہیں ۔ ان کے اداریوں میں ان کے ہمعصروں کی طرح اشعار بھی استعمال کیے جاتے ہیں مگر زیادہ تر اردو اشعار ، کہیں کہیں فارسی اشعار بھی استعمال کیے گئے ہیں ۔ بعض جگہوں پر اردو اشعار بکثرت استعمال ہوتے ہیں ۔ چونکہ وہ خطیب بھی تھے اس لیے ان کے اداریوں میں بھی خطابت کا رنگ موجود ہے ۔

مثالیں

''جب یہ قانون قدرت رہا اور یہی مشیت ایزدی ہے تو ہم کو کیا کرنا چاہیے ؛ بس یہی کہ مفاد عام کے متعلق جو ہمارا ضمیر و وجدان ہم کو بتائے اس کو ایمانداری کے ساتھ اپنے بھائیوں کے سامنے ظاہر کر دیں ۔ ان سے مشورہ کریں ، بحث و تمحیص میں پوری آزادی ہو ۔ جس چھید سے مسلمان ایک بار کاٹا جا چکا ہے اس میں تو وہ بالکل انگلی نہ ڈالے ۔ اور جو تجربے سے بد باطن، اور بد اندیش، خود غرض اور بے ایمان ثابت ہو چکے ہیں ان کی اچھی سے اچھی رائے کو بھی نقادانہ نظر سے دیکھے ۔''

(ہمدرد ۱۳ دسمبر ۱۹۲۶ء اداریہ بعنوان 'میری رقابتیں' سے اقتباس)

۔ ۔ ۔ ۔''ہم نے اور ہمارے چند ساتھیوں نے 'ذوق نغمہ' میں کمی محسوس کر کے جس قدر تلخ نوائی کی ، اور محمل کو گراں پا کر جس قدر حدی کو تیز کیا ، اسے یا ہم جانتے ہیں یا ہمارا خدا ۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز جو چیز ہے وہ یہ ہے کہ

ہم مسلمانانِ عالم کی موجودہ ذہنیت کو بدل کر انہیں از سر نو تاسیس خلافت راشدہ کی طرف مائل کرنا چاہتے ہیں تاکہ ایک بار پھر مسلمانانِ عالم ایک ہی رشتے میں منسلک ہو جائیں ۔ ۔ ۔''

(ہمدرد ۲۹ فروری ۱۹۲۸ء ۔ اداریہ بعنوان 'فسانۂ غم دل' سے اقتباس)

۔ ۔ ۔ ''میں نے ۱۹۲۰ء میں بھی علی گڑھ کو خود نہیں چھوڑا ، بلکہ مسلح پولیس کے ذریعے سے نکلوایا گیا ؎

بدوش خلق نعشم عبرت صاحب دلاں باشد
کسے بر پائے خود از کوئے جاناں بر نمی آید

میں ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۵ء تک کورٹ کا ممبر رہا ، لیکن میں اس وقت تک کورٹ میں شرکت سے انکار کرتا رہا جب تک اس نام نہاد مسلم یونیورسٹی کا نظام حکومت چند حکومت پرستوں کے ہاتھ سے نکل کر ملت اسلامیہ میں اور اس کے نمائندوں کے ہاتھ میں نہ آ جائے ؎

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

اس سے قریب کی نسبت اسی وقت ہو گی جب واں کے نکالے ہوئے اپنی مات کے حکم سے پھر بلائے جائیں ؎

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں ۔''

(ہمدرد ، ۲۶ اپریل ۱۹۲۸ء ۔ اداریہ بعنوان 'میرا اسراف اور فکر معاش' سے اقتباس)

حوالہ جات

1. Mohammad Ali My Life, A Fragment p. 45 -

2. Writings and Speeches of Maulana Mohammad Ali, p. 45.

3. Ibid, p. 178.

۴ - بحوالہ سیرۃ محمد علی ، از رئیس احمد جعفری صفحات ۲۳۲ تا ۲۳۵

5. Jamil-ud-din Ahmad, : "Maulana Mohammad Ali," article published in 'Selections from Comrade, p. 187.

۶ - ہمدرد - ۱۲ اپریل ۱۹۲۹ع -

۷ - خواجہ احمد عباس : محمد علی ، ص ۱۵ -

۸ - بحوالہ سیرۃ محمد علی ، صفحات ۳۰۳ - ۳۳۴ -

۹ - رئیس احمد جعفری ، سیرۃ محمد علی - (تعارف) بعنوان نگاہ اولین از ڈاکٹر ذاکر حسین خاں -

۱۰ - ایضاً دیباچہ از مولانا عبدالماجد دریابادی

11. Michael O'Dwyer : "India as I knew it."

۱۲ - بحوالہ سیرۃ محمد علی

مولانا ابوالکلام آزاد اداریہ نگاری

مولانا ابوالکلام آزاد جید عالم ، بے مثال خطیب ، بلند پایہ ادیب اور نڈر صحافی تھے - بچپن ہی سے اخبار بینی اور مضمون نویسی کا شوق تھا - کمسنی میں کلکتے سے ایک ادبی گلدستہ 'نیرنگ عالم' جاری کیا جو آٹھ ماہ بعد بند ہوگیا - پھر 'الصباح' کی ادارت، سنبھالی - ساتھ ساتھ 'مخزن' اور دوسرے جرائد میں مضامین بھی لکھتے رہے - 'تحفۂ محمدیہ' اور 'خدنگ نظر' کو بھی ترتیب دیتے رہے - نومبر ۱۹۰۲ع میں 'لسان الصدق' جاری کیا - کچھ عرصہ 'الندوہ' کی ادارت کے فرائض ادا کیے- دوبار 'وکیل' کے مدیر مقرر ہوئے - 'دارالسلطنت' کے بھی مدیر رہے - بالآخر اپنا رسالہ جاری کرنے کی ضرورت محسوس کی - اس ضمن میں خود ہی لکھتے ہیں :

''اتنے عرصے میں بہت سی باتوں میں تغیر ہو چکا تھا اور تغیرات کا سلسلہ پوری سرعت کے ساتھ جاری تھا - اس مرتبہ میرے پولٹیکل خیالات میں خالصتاً ہند کے متعلق وہ تبدیلی ہوئی جس نے آگے چل کر میرے عہد الہلال کے مسلک کی طرف راہنمائی کی - - اس زمانے میں میں نے یہ رائے قائم کی کہ جو مقاصد میرے پیش نظر ہیں وہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتے جب تک

ایک طاقتور اور وسیع انتظام و اہتمام کے ساتھ اپنا ذاتی اخبار نہ نکالا جائے اور ذاتی پریس نہ ہو۔''

۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو ہفت روزہ 'الہلال' کلکتے سے اس شان کے ساتھ نکلا کہ صحافتی دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ 'الہلال' ظاہری اور معنوی دونوں اعتبار سے انقلابی حیثیت رکھتا تھا۔ ۱۶ نومبر ۱۹۱۴ء کو حکومت نے الہلال پریس کی دو ہزار روپے کی ضمانت ضبط کرلی اور دس ہزار روپے کی مزید ضمانت طلب کی۔ ۱۴ اور ۲۱ اکتوبر ۱۹۱۴ء کا مشترکہ شمارہ بھی (جس کے مندرجات 'سقوط انٹورپ' اور 'حدیث الجنود' کی بنا پر ضمانت ضبط کی گئی تھی) ضبط کر لیا گیا۔ نئی ضمانت جمع نہ کرائی جا سکی اور نومبر ۱۹۱۴ء میں رسالہ بند ہو گیا۔ اگلے سال مولانا نے 'البلاغ' نکالا جو خالص مذہبی ہفت روزہ تھا۔ کچھ عرصہ بعد مولانا کی نظربندی کی وجہ سے 'البلاغ' بھی بند ہو گیا ۱۹۲۷ء میں الہلال دوبارہ شروع کیا گیا مگر اس وقت مولانا کی دوسری مصروفیات زیادہ بڑھ چکی تھیں اس لیے چھ ماہ سے زیادہ نہ چل سکا۔ ۱۹۲۱ء میں انھوں نے کلکتے سے پیغام جاری کر دیا اور اس کے مسلک کی نگرانی کرتے رہے۔ مولانا نے بعد کے ادوار میں سیاست میں بھرپور حصہ لیا اور کانگریس اور مسلم لیگ کی لڑائی میں کانگریس کا ساتھ دیا؛ برصغیر کی تقسیم کی مخالفت کی۔ لیکن بحیثیت صحافی اور اداریہ نویس انھوں نے جو کچھ کیا، ذیل میں اس کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

مولانا کا نظریۂ صحافت

مولانا نے ۲۷ جولائی ۱۹۱۲ء کے الہلال میں لکھا تھا:

''ہم اس بازار میں سودائے نفع کے لیے نہیں بلکہ تلاش زیان و نقصان میں آئے ہیں۔ صلہ و تحسین کے نہیں بلکہ نفرت و

دشنام کے طالب گار ہیں ۔ عیش کے پھول نہیں بلکہ خلش و اضطراب کے کانٹے ڈھونڈتے ہیں ۔ دنیا کے زر و سیم کو قربان کرنے کے لیے نہیں بلکہ خود اپنے تئیں قربان کرنے آئے ہیں ۔''

اور

'' ہمارے عقیدے میں تو جو اخبار اپنی قیمت کے سوا کسی انسان یا جماعت سے کوئی اور رقم لینا جائز رکھتا ہے وہ اخبار نہیں بلکہ اس فن کے لیے ایک دھبا اور سر تا سر عار ہے ۔ ہم اخبار نویس کی سطح کو بہت بلندی پر دیکھتے ہیں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض الٰہی ادا کرنے والی جماعت سمجھتے ہیں ۔ ۔ پس اخبار نویس کے قلم کو ہر طرح کے دباؤ سے آزاد ہونا چاہیے اور چاندی اور سونے کا تو سایہ بھی اس کے لیے سم قاتل ہے۔'' ۔ ۔ ۔

گویا مولانا کے نزدیک صحافت اعلیٰ و ارفع مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ تھا ۔ اور صحیح صحافی یا صحیح اخبار وہ تھا جو خوف ، طمع ، دباؤ اور مصلحت سے بلند ہو کر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا مقدس فرض ادا کرے ۔ مولانا کے نزدیک نہ صرف اخبار کا ان اعلیٰ مقاصد سے سرمو انحراف کرنا گناہ تھا بلکہ وہ اس بات کو بھی نا پسند کرتے تھے کہ اخبارات میں معاصرانہ چشمک ہو اور ان کے قیمتی کالم بے سود مواد سے پر ہوں ۔ 'زمیندار' اور 'وطن' و 'پیسہ اخبار' میں معاصرانہ چشمک شروع ہوئی تو مولانا نے لکھا :

'' ۔ ۔ ۔ ۔ کیکر سنگھ نے غلام پہلوان سے عاجز آ کر اس کی کنپٹی پر مکے کی ایک سخت ضرب لگا دی تھی ۔ اسی طرح جب یہ قلم و کاغذ کے پہلوان عاجز آ جاتے ہیں تو ایک دوسرے کو گالیاں دینا شروع کر دیتے ہیں ۔ فحش مغلظات سے بھی انہیں دریغ نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ہم اپنے معاصرین سے بہ منت التجا کرتے ہیں کہ

خدا کے لیے اپنی ملت پر نہیں تو خود اپنے اوپر رحم کریں اور مسلمانوں کی موجودہ ذلت و رسوائی پر قناعت کر لیں ۔ نفسانیت اور خودپرستی کی حد ہو گئی ہے اور خدا کی طرف سے سب نے منہ موڑ لیا ۔ تعجب ہے کہ ساری دنیا آپ پر ہنس رہی ہے اور آپ کو ایک لمحے کے لیے اپنے آپ پر رونا نہیں آتا ۔ ملک و ملت کی خدمت شاید اس طریقے سے الگ ہو کر بھی کی جا سکتی ہے ۔ یہ تو کچھ ضرور نہیں کہ جب تک آپ ایک دوسرے کو چور ثابت نہ کر لیں گے اس وقت تک آپ کی زیر اصلاح قوم آپ کو امین نہ سمجھے گی ؂

تو بہ خویشتن چہ کر دی کہ با کنی نظیری
بہ خدا کہ واجب آمد ز تو احتراز کردن''

(الہلال ۲۰ اگست ۱۹۱۲ء)

مولانا کے اس مشورے کو دوسروں نے قبول کیا ہو یا نہ کیا ہو، خود ان کے اخبارات ان کے اپنے تصور صحافت کے مطابق تھے ۔

مولانا کے اداریے

مولانا ابوالکلام آزاد نے یوں تو 'نیرنگ عالم' 'الصباح' 'تحفہ محمدیہ' 'خدنگ نظر' 'الندوہ' 'وکیل' 'دارالسلطنت' وغیرہ کی بھی ادارت کے فرائض انجام دیے اور اداریے و مضامین لکھے ۔ مگر کم و بیش ہر جگہ یہی مشکل پیش آئی کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتے تھے اخبارات کے مالک حالات کی نزاکت کے باعث اس کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے ۔ اسی بنا پر انہوں نے اپنا اخبار جاری کرنے کی ضرورت محسوس کی ۔ گلدستہ ''نیرنگ عالم'' انہوں نے خود جاری کیا تھا مگر یہ بچپن کا کھیل تھا ۔ چودہ پندرہ سال کی عمر میں اشتراک سے لسان الصدق جاری کیا تو ملک میں ان کے تبحر علمی کی دھوم مچ گئی ۔ اس

رسالے میں علمی و ادبی اور مذہبی مضامین زیادہ ہوتے تھے۔ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے، علم کا دریا رواں ہو جاتا۔ ۴ اپریل ۱۹۰۳ع کے 'لسان الصدق' میں ''دارالسلطنت ہند میں ایک عمدہ اردو پریس کی کمی'' کے زیر عنوان افتتاحیہ لکھا تو طریقہ ہائے طباعت اور کتابوں کی پوری تاریخ بیان کر ڈالی۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''یہ انقلاب بھی کس قدر قابل تعجب ہے کہ انڈیا میں جو شہر سب سے پہلے مشرق زبانوں کے عمدہ پریسوں کا مخزن تھا اور جو تمام ہندوستان میں عربی، فارسی، اردو کتابوں کی اشاعت کا سب سے اعالی مرکز سمجھا جاتا تھا، وہاں ایک پریس بھی ایسا نہ ہو جہاں سے اردو زبان کی کوئی کتاب یا رسالہ کسی قدر عمدہ حالت میں چھپ کر نکلے۔۔۔ 'لسان الصدق' کو جو مشکل اپنی ظاہری حالت کے سنبھالنے میں پیش آ رہی ہے وہ اسی کمی کی بدولت ہے۔۔۔

ہندوستان میں سب سے پہلے زیادہ تر ٹائپ کے پریس جاری ہوئے۔ قدیم سے قدیم کتاب جو اتھو کی چھپی ہوئی ہماری نظر سے گزری ہے وہ ایک جرنیل کے بیان میں فارسی کا مختصر رسالہ ہے۔۔۔ اس کے علاوہ منشی جواہر سنگھ زخمی کی کتاب جو نصیرالدین حیدر کے زمانے میں چھپی تھی۔۔۔ سب سے قدیم کتاب جو کلکتے کی چھپی ہوئی ہماری نظر سے گزری ہے وہ تحفہ اثنا عشری ہے جس کی لوح پر شاہ عبدالعزیز کا نام مدظلہ العالی یا کسی اور دعائیہ جملے کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔۔۔ الخ''

'الہلال' اور 'البلاغ' کا دور مولانا کے فکر کی پختگی اور مشن کی تکمیل کے لیے صحافت کو بطور ذریعہ استعمال کرنے کا

دور ہے ۔ اس لیے ان کی اسی دور کی اداریہ نگاری ہی اعلیٰ درجے کی اداریہ نگاری ہے ۔ قاضی محمد عبدالغفار کے الفاظ میں ''مولانا کی ذہنی جوانی کا سب سے زیادہ مؤثر مظاہرہ الہلال تھا[۱]۔''

مولانا ابوالکلام آزاد کا مشن مسلم معاشرے کی اصلاح تھا ۔ اور انھوں نے اس کے لیے دعوت کا راستہ اختیار کیا ، خطابت میں بھی اور صحافت میں بھی ۔ داعی فلسفی کی طرح معاملات و مسائل کا منطقی تجزیہ نہیں کرتا ؛ وہ عموماً رگ جاں پر چوٹ لگاتا ہے اور دعوت کو مؤثر بنانے کے لیے الفاظ کے حسن ، جملوں کی خوبصورت در و بست ، ادبیت ، تشبیہات ، استعارات ، تلمیحات ، جوش و جذبہ اور خطابت کے عنصر سے کام لیتا ہے ۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے علم و فضل کی شہ نشیں سے دعوت دی اور ان ساری چیزوں سے کام لیا ۔ وہ اپنے مقام پر کھڑے ہو کر اپنے خاص انداز میں دعوت دیتے رہے ۔ انھیں اس سے سروکار نہیں تھا کہ پڑھنے یا سننے والوں کی ذہنی سطح کیا ہے ۔ وہ ان کی باتیں سمجھتے بھی ہیں یا نہیں ۔ یا دوسرے ان کے متعلق کیا سوچتے اور کیا کہتے ہیں ۔ وہ اپنے خلوص اور جذبۂ صداقت کی پوری قوت سے دعوت دیتے اور سوتوں کو جگاتے ہیں ۔ مثلاً :

''کیا دنیا میں جس طرح بہار و خزاں کے موسم آتے ، ربیع و خریف کی ہوائیں چلتیں اور جاڑے اور گرمیوں کا سورج بدلتا ہے ، اسی طرح دلوں کی شورشوں کا بھی کوئی موسم ہے ؟ روحوں کی بے قراری کی بھی کوئی فصل ہے ؟ دیوانگی اور سراسیمگی کا بھی کوئی وقت ہے جس کی ہوائیں چلتی ہیں اور جن کے بادل نمودار ہوتے ہیں ؟ میں نہیں جانتا کہ ایسا ہو مگر میں پاتا ہوں کہ میرے دل کی دیوانگی ٹھہر ٹھہر کے اٹھتی اور میری روح کی شورش گزر گزر کے لوٹتی ہے ۔ میں کچھ عرصے سے اس دریا کی مانند جو اتر گیا ہو چپ تھا ، لیکن آج اس سمندر کی

مانند جس کی تہہ سے موجیں جوش مار رہی ہوں ، پھر آہوں سے بھر گیا ہوں ، فریادوں سے معمور ہو گیا ہوں ، شورشوں سے لبریز ، اور دیوانگیوں کے سر جوش سے میرا ساغر ضبط چھلک گیا ہے ۔ آج مجھے پھر اس خاک کی تلاش ہے جس کو اپنے سر و چہرہ پر اڑا سکوں ۔ پھر ان کانٹوں کی جستجو ہے جن کو اپنے دل و جگر میں چبھو سکوں ۔ میں دیوانوں کا متلاشی ہوں اور مجھے بیماروں کی بستی کی ضرورت ہے ۔ میں ہوشیاری سے اکتا گیا اور تندرستی نے مجھے عاجز کر دیا ۔ آہ ! میں چاہتا ہوں کہ جی بھر کر روؤں اور جس قدر چیخ چیخ کے نالہ و فریاد کر سکتا ہوں ، کرتا رہوں ۔ میری چیخیں تمھارے عیش و نشاط کو مکدر کر دیں ۔ میرا نالہ و بکا تمھارے عیش کدوں کو ماتم کدہ بنا دے ۔ میری آہوں سے تمھارے چہروں کی مسکراہٹ معدوم ہو جائے ۔ میں تم کو غم و ماتم سے بھر دوں ۔ میں تم کو درد و حسرت کا پتلا بنا دوں ۔ تمھاری آنکھیں ندیوں کی طرح بہہ جائیں ۔ تمھارا دل تنور کی طرح بھڑک اٹھے ۔ تمھاری زبانیں دیوانوں کی طرح چیخ اٹھیں اور تمھاری غفلت ، عیش اور بے دردی نشاط کی وہ بستی جو مدتوں سے آباباد چلی آ رہی ہے ، اس طرح اجڑ جائے کہ پھر کبھی آباد نہ ہو ؎

روے بازار مراد امروز عرفی با من است
دیدۂ تر می‌فروشم ، دامن تر میخرم

(البلاغ ۳ و ۱۰ مارچ ۱۹۱۶ع

پنڈت جواہر لعل نہرو نے اردو صحافت میں مولانا آزاد کے اس داعیانہ انداز کا ذکر یوں کیا ہے :

''ابوالکلام آزاد نے ان سے (مسلمانوں سے) ایک نئی زبان میں خطاب کیا ۔ صرف ان کے خیالات اور نقطۂ نظر ہی میں جدت ہ

تھی ، بلکہ ان کی تحریر کا رنگ بھی نیا تھا ۔ یہ ایک ایسا انداز تخاطب تھا جس سے ہندوستانی مسلمان آشنا نہ تھے ۔ وہ علی گڑھ کی قیادت کے محتاط لب و لہجہ سے واقف تھے ۔ اور سر سید ، محسن الملک اور نذیر احمد اور حالی کے انداز بیان کے علاوہ ہوا کا کوئی زیادہ گرم جھونکا ان تک پہنچا ہی نہ تھا ۔ الہلال مسلمانوں کے کسی مکتب خیال سے متفق نہ تھا ۔ وہ ایک نئی دعوت اپنی قوم اور اپنے ہموطنوں کو دے رہا تھا ۔ ۔ ۔ (مولانا) کا ذہن ایک معجون مرکب تھا عہد وسطیٰ کے متکلمانہ خیالات ، اٹھارویں صدی کی عقلیت اور عہد حاضر کے رجحانات کا ــــ ابوالکلام آزاد نے قدامت پرستی کے قلعے پر حملہ کیا ۔ ۔ ۔ نوجوان مصنف اور اخبار نویس نے مسلمانوں کے تعلیم یافتہ حلقے میں ہلچل مچا دی ۔ ۔ ۔ ۔ ۲ ''

مولانا کی 'دعوت' در پیش حالات و واقعات سے بے تعلق نہیں ہوتی تھی ۔ وہ الہلال اور البلاغ میں اہم قومی اور مذہبی مسائل پر بحث کرتے تھے ۔ اخبار زمیندار کی ضبطی ، اصلاح ندوہ کی بحث ، مسجد کانپور کا المیہ ، علی گڑھ یونیورسٹی کا مسئلہ جنگ بلقان و آزادیٔ صحافت ، غرض انہوں نے ہر اہم قومی ، بین الاقوامی یا مذہبی موضوع پر قلم اٹھایا اور اپنے منفرد داعیانہ انداز میں اس پر اظہار خیال کیا ۔ مسجد کانپور کو شہید کیا گیا تو آپ نے 'الہلال' میں افتتاحیہ میں لکھا :

''کانپور کے مقدس فرزندان اسلام جو شہید ہوئے ان کی پاک روحیں خدا کے حضور میں پہنچ چکی ہیں جہاں نہ مسٹر ٹائیلر کو قتل عام کی دسترس ہے نہ مسٹر سم کو شعائراللہ کی بے حرمتی کا موقع حاصل ہے ؛ نہ پولیس کو بیگناہوں کے گھروں میں گھس کر انہیں پابہ زنجیر کرنے کا حق ہے ۔ (آیۃ : (ان کا پروردگار

ان کو اپنی مہربانی اور رضامندی سے ایسی بہشت میں رہنے کی خوشخبری دے رہا ہے جہاں دائمی آسائشیں ملیں گی ۔ یہ لوگ ہمیشہ بہشت کی راحت میں مقیم رہیں گے ۔ بے شک اللہ کے یہاں اجر و ثواب کا بڑا ذخیرہ موجود ہے) لیکن شہیدوں کے اہل و عیال جن کے گھرانے تو خدا کی رحمت سے مطہر ہو چکے ہیں ، اس وقت ابتلا میں ہونے کی وجہ سے عوام میں مطرود و مخذول ہو رہے ہیں ۔ ان کی حالت عام نصرت و تعاون کی حاجتمند ہے ۔ جو لوگ اپنے گھروں سے گرفتار کرکے قید کیے گئے ہیں وہ اور بھی قابل رحم ہیں ۔ ۱۵ اگست ۱۹۱۲ء کو میں خود مجسٹریٹ کانپور سے ملا تھا کہ مجھے زندان کانپور کے گرفتاران بلا سے ملنے کی اجازت ہی دی جائے جو شہادت مسجد کے سلسلے میں پابہ زنجیر ہوئے ہیں ؛ مجسٹریٹ نے اس کو منظور کرنے سے انکار کر دیا ۔

ہمیں اس کا خوف نہیں کہ مسلمان ایک مسجد کے اعادۂ حرمت کی کوشش میں مقتول و مجروح ہوئے کہ یہ ان کی خصوصیت میں ہے ۔ ایک ہزار تین سو برس ہوئے کہ مسجد خلیل کی بقائے حرمت کے لیے سربکف ہیں ۔ لیکن اس کا خوف ہے کہ حکومت جن غیر قانونی گولیوں سے اپنی وفادار رعایا کو مجروح کر رہی ہے ، انھی سے وہ خود تو مجروح نہیں ہو گئی ۔ ۔ ۔'' یہ لکھنے کے بعد پھر اپنا مخصوص داعیانہ انداز اختیار کر لیتے ہیں :

''تعجب ہمیشہ اس واقعے پر ہوتا ہے جو نادر و غریب ہو، اور شکایت ہمیشہ اس سے ہوتی ہے جس سے توقع ہو ۔ مجھ کو نہ تو اس واقعے پر تعجب ہوا اور نہ شکایت پیدا ہوئی ۔ میرے سامنے تاریخ ہے اور قوموں کی سرگزشتیں ہیں ۔ مجھے معلوم ہے کہ طاقت نے ہمیشہ غرور کیا ہے اور حکومتوں نے ہمیشہ حق و حیات کے سائلوں کو ایسا ہی جواب دیا ہے ۔ میں روز اول ہی سے جانتا تھا کہ یہ سب کچھ یکے بعد دیگرے ہونے والا ہے اور وقت

اوز موسم کے تغیر کا انتظام کیا جا رہا ہے۔۔۔۔''

''وقت نازک ہے اور موسم مخالف ہے۔ غفلت کے جھونکے چلنے لگے ہیں اور جھنجھوڑنے والے ہاتھ بے حرکت ہو گئے ہیں۔ حریف قوی و شاطر، مقابل فریب خوردہ، دسائس و مطامع دلفریب اور ایمان کی آزمائش امتحان طلب ہے۔ سفر ابھی شروع ہوا ہے اور تجربے کی زاد راہ سے مسافر تہی دست ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ قدرت کی بخشی ہوئی ایک ہی فرصت ہشیاری ضائع کر دی جائے۔۔۔۔''

'الہلال' کے اس قسم کے اداریوں اور مضامین کے پیش نظر الہ آباد کے اخبار پائنیر (Pioneer) نے لکھا تھا:

''الہلال ہفتہ وار با تصویر مجلہ ہے جو کلکتے سے اردو زبان میں شائع ہوتا ہے۔ دہلی کا ایک مسلمان ابوالکلام آزاد اس کا ایڈیٹر ہے۔ ان صوبوں اور ہندوستان کے دیگر حصوں کے مسلمانوں میں اس کی اشاعت بہت زیادہ ہے۔ جنگ کے ابتدا سے اس کا رویہ جرمنی کی حمایت میں رہا ہے۔ حیرانی ہے کہ حکومت ان تحریروں کو کس طرح برداشت کر رہی ہے۔۔۔۔ مضامین کا انداز تحریر طعن آمیز اشاروں، استعاروں اور تعریض سے پر ہوتا ہے۔ ایڈیٹر اپنے ہم مذہب لوگوں میں یہ عقیدہ پیدا کرنا چاہتا ہے کہ جرمنی کو کبھی شکست نہیں ہو سکتی اور برطانیہ اس کے حملوں کو روکنے کی ہمت نہیں رکھتا[۴]۔''

'الہلال' اور 'البلاغ' کے اداریوں اور مضامین میں تین اجزائے ترکیبی ملتے ہیں۔ پہلا اور غالب جزو 'اسلام' ہے جس کی وجہ سے ان کی تحریروں میں اسلام کا تصور اجتماع اور نظریہ 'خلافت اللہ' بار بار نمایاں ہوتا ہے۔ دوسرا جز مسلم قومیت اور اس کے مادی منافع و مصالح ہیں جس کا تعلق مسلمانوں سے ہے لیکن اسلام کی

روح سے نہیں - تیسرا جزو ہندوستان کی وہ وطنی قومیت کی تحریک ہے جس کا مقصد 'سوراج' تھا ، اور اسے اسلام کی 'ہیئت اجتاعیہ' سے کوئی تعلق نہیں - انہوں نے جہاں 'الدین والسیاست' ، 'الاصلاح و الافساد' وغیرہ ایسے موضوعات پر لکھا ، وہاں اصلاح ندوہ کی بحث میں بھی حصہ لیا - اخبار زمیندار کی ضانتوں کی ضبطی اور آزادی صحافت کے مسئلے پر بھی لکھا اور مسجد کانپور کے المیہ اور جنگ بلقان کو بھی اداریوں کا موضوع بنایا -

بمبئی کے گورنر نے مسلمانوں کی حالت کو امید افزا بتایا اور مسلم یونیورسٹی کے قیام کو دلیل کے طور پر پیش کیا اور حکومت کے ساتھ تعاون کرنے پر زور دیا تو انہوں نے ۱۸ اگست ۱۹۱۲ء کے الہلال میں اداریے میں لکھا :

'ہزایکسی لینسی کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم اس نصیحت پر برابر نصف صدی سے عمل کر رہے ہیں - ہم نے ہمیشہ گورنمنٹ پر اعتاد کیا ہے اور اس اعتاد کے لیے جس قربانی کی ضرورت ہوئی ہے ، ہم نے کبھی دریغ نہیں کیا - اسی اعتاد کی خاطر ہم نہ صرف اپنے بائیس کروڑ ہمسایوں کے بلکہ اپنے بھی دشمن رہے اور ایک کی خاطر سارے جہان کی دشمنیاں مول لے لیں - کون سی قیمتی سے قیمتی شے ہمارے لیے ہو سکتی تھی جو ہم نے اس نصیحت پر نثار نہ کر ڈالی - ہم نے گورنمنٹ کی چوکھٹ پر سجدے کیے ہیں اور اس کے ابروے بے مہر کو ہمیشہ محراب عبادت یقین کیا ہے لیکن ؎

کمر در خدمتت عمریست می بندم چہ شد قدرم
برہمن می شدم گر این قدر زنار می‌بستم

ہزایکسی لینسی کی نصیحت یقیناً محبت اور ہمدردی سے خالی نہ ہوگی مگر ان کو ہم بدبختوں کی دل کی تپش کیا معلوم ؟ حکومت کے

بستر پر لیٹ کر مشکل ہے کہ محکومی کی خاک پر لوٹنے والوں کا درد سمجھا جا سکے۔ ان کی معذوری واضح ہے ؎

زدامنے کہ کشادیم ما تہی دستان
دمیدۂ سر شاخ بلند را چہ خبر

(ملکہ سبا) کی زبانی کیسا اٹل قانون قرآن کریم نے سنا دیا ہے: ان الملوک اذا دخلوا قریۃ افسدوہا و جعلوا اعزۃ اہلہا اذلۃ وکذالک یفعلون ۔۔۔۔ الخ"

۲۵ مارچ ۱۹۱۴ء میں مسلمانوں کا ایک وفد لارڈ ہارڈنگ سے ملا۔ لارڈ ہارڈنگ نے 'حاکم وقت کی اطاعت' کو مسلمانوں کا بنیادی عقیدہ قرار دیا۔ اس پر مولانا نے یکم اپریل ۱۹۱۴ء کے الہلال میں لکھا:

"۔۔۔۔ تاہم ایک غلط فہمی جو اس کے ساتھ مل گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہزایکسی لینسی کو اسلام کے بنیادی عقائد کی صحیح خبر نہیں دی گئی۔ انھوں نے عقیدۂ توحید کے ساتھ حکمران کی وفاداری کا بھی اس طرح ذکر کیا ہے گویا یہ بھی مثل عقیدے کے اسلام کا اساسی اعتقاد ہے، حالانکہ یہ صحیح نہیں، اور بہت جلد انہیں اس غلطی کا اعتراف فرما لینا چاہیے۔ اسلام کا اصل اصول صرف عقیدۂ توحید ہے، اس کے بعد اعتقاد رسالت و قرآن اور بعض ضروری اعمال و عبادات؛ 'حکمران کی وفاداری' ان میں داخل نہیں اور نہ تو قرآن میں بتلائی گئی ہے اور نہ احادیث میں اسے مسلمانوں کا بنیادی اعتقاد قرار دیا گیا ہے۔ البتہ بعض جاہل اور خبیث روحیں کبھی کبھی کسی کو خوش کرنے کے لیے کہہ دیا کرتی ہیں کہ اسلام کا بنیادی اصول 'وفاداری' ہے۔ مگر (آیت) 'بیشک وفاداری ہی وہ چٹان ہے جس پر اسلام کی عمارت قائم کی گئی ہے۔ مگر خدائے واحد کی وفاداری نہ کہ کسی

اور کی ۔ البتہ مسلمانوں کو امن پرستی اور حق کے تحفظ کے ساتھ اطاعت کیشی کا حکم مثل اور صدہا جزئی اور عام اخلاق احکام کے دیا گیا ہے ۔ مگر نہ تو یہ کوئی اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے اور نہ عقیدۂ توحید کی حرمت اس کو گوارا کر سکتی ہے کہ خدا کی وفاداری کے ساتھ اس کے بندوں کی وفاداری کا ذکر کیا جائے ؎

صنمے در دل ماہ یافتہ راہ نحن لانعبد الا ایاہ''

جنگ بلقان کے سلسلے میں ۱۳ نومبر ۱۹۱۲ء کے الہلال میں لکھا :

'' ۔ ۔ ۔ ترکوں کی مشکلات کی کوئی انتہا نہ تھی ۔ اگر فوجی تیاری کے یہ معنی ہیں کہ کسی طے شدہ پیش آنے والی جنگ کے لیے فوجی قویٰ اور اس کے متعلقات کو ہر طرح سے مکمل کر دینا تو یہ حقیقت کسی دلیل کی محتاج نہیں کہ اس جنگ کے لیے بلقانی اتحاد کامل بیس برس سے تیار ہو رہا تھا اور دول کی ہر طرح کی اعانت اس کے ساتھ تھی ۔ اس کے مقابلے میں عثمانی گورنمنٹ کا یہ حال تھا کہ اول تو اعلان جنگ کے وقت تصادم احزاب اور تزاحم اغراض مختلفہ سے حکومت ایک متصل بحران میں مبتلا تھی ۔ جنگ کا اعلان ایسے وقت ہوا کہ جنگ طرابلس کی وجہ سے ہر وہ فوجی نقل و حرکت جس کا تعلق کچھ بھی سمندر سے تھا ، اٹالین بیڑے کے مراقبے کی وجہ سے محال ہو رہی تھی ۔ صلح کے بعد ترکی کو نقل و حرکت کی مہلت ضرور ملی مگر ۱۳ اکتوبر کو بلغاریہ نے حملہ شروع کیا ہے اور ۱۵ کو روچی میں کاغذات صلح پر آخری دستخط ہوئے ہیں ، اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ اعلان جنگ کی سب سے زیادہ قیمتی فرصت میں ترکی قویٰ اجتماع سے بالکل مجبور رہے ۔

یورپین ترکی میں جس قدر فوج موجود تھی اول تو ضروری نقاط مدافعت میں اس کا اجتماع کافی نقل و حرکت کا محتاج تھا، پھر سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ ایک ہی وقت چار مختلف حریفوں کا مقابلہ بالکل مختلف مقامات میں درپیش تھا اور وہ باہم ایک دوسرے سے اس طرح الگ تھے کہ بغیر کسی دوسری طاقت کو راہ سے ہٹائے ایک مقام کی فوج دوسرے مقام کی فوج کو مدد نہیں دے سکتی تھی ۔ ۔ ۔ ۔"

۲۲ نومبر ۱۹۱۲ء کو مولانا نے اس موضوع پر 'ہلال اور صلیب' کے زیر عنوان پھر اداریہ لکھا لیکن دوسرے انداز میں :
"۔ ۔ ۔ جنگ طرابلس جب شروع ہوئی تھی تو ترکوں کی غفلت اور بربادی پر دوستوں نے حسرت کے آنسو بہائے اور دشمنوں نے غلغلہ ہائے شادمانی بلند کیے ۔ لیکن پھر اس کے بعد کیا ہوا ؟ سال بھر تک دنیا نے کیا دیکھا ؟ عثمانی افسروں کی شجاعت اور جانفروشی ہی نہیں بلکہ بادیہ نشینان عرب کی گیارہ گیارہ برس کی لڑکیوں نے بھی اپنی عظمت کا اقرار کرا لیا ۔

یہی حال موجودہ جنگ کا ہے ۔ بلقانیوں کی مکذوبات نے تمام دنیا کو ترکوں کی طرف سے مایوس کر دیا ۔ دوستوں کی رائیں بھی متزلزل ہو گئیں ۔ لوگ بے اختیار کہہ اٹھے کہ عثمانی خون کی آگ اب بجھ گئی ۔ خود مسلمانوں میں بعض منافقین نے اپنے نفاق کے اظہار کے لیے اس فرصت کو غنیمت سمجھا اور ہندوستان کی حزب المنافقین کے ایک سرگرم ممبر نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ :
"چونکہ ترک اپنی حفاظت نہیں کر سکتے اس لیے قربانی کی کھالوں کی قیمت دینے کی کچھ ضرورت نہیں ؛ ہمارے قومی کام بہت سے رکے پڑے ہیں ۔"

میں جب بھی قرآن کریم کھولتا ہوں تو صاف نظر آتا ہے کہ غزوۂ طرابلس کو جس طرح بہت سی باتوں میں آغاز اسلام کے

غزوۂ بدر سے مشابہت تھی بالکل اسی طرح اس جنگ کو اسمآ و معناً جنگ احزاب سے ہے جس کا حال 'سورۂ احزاب' میں بیان کیا گیا ہے - فی الحقیقت جس طرح وہ جنگ مسلمانوں کے لیے ایک بہت بڑی آزمائش اور نفاق و ضعف ایمانی کے ظہور کے لیے ایک ابتلائے الٰہی تھی ، بالکل اسی طرح اس جنگ کو بھی خدا نے ہمارے لیے ایک وسیلۂ آزمائش بنایا - (آیت) . . . .

جس قدر حالات سامنے آئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ تو عثمانی نسل نے اپنی آٹھ سو برس کی روایات کو ابھی بھلایا ہے اور نہ فرزندان اسلام کی جانفروشیوں نے پرستاران صلیب کے مقابلے میں شکست کھائی ہے - اب بھی ہر ترک سپاہی 'ترک سپاہی' ہے اور اپنے شرف اسلامی کو بھولا نہیں ہے

ہست مجلس بر آں قرار کہ بود
ہست مطرب بر آں ترانہ ہنوز''

مولانا نے ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۳ء کے 'الہلال' میں 'جنگ' کا بحیثیت مجموعی ذکر کرتے ہوئے 'حدیث الجنود' کے زیر عنوان افتتاحیہ میں لکھا : ''جو جنگ دنیا کے نصف حصے میں قتل و غارت کا سب سے بڑا دار ارضی تمثیل کر رہی ہے اس کے میدانوں سے باہر بھی قوتوں کا تصادم اور طاقتوں کی کشاکش کا ایک معرکہ تقابل و تسابق بپا ہے - یہ حقیقت اور تصنع کا ایک عظیم الشان مقابلہ ہے جو شاہد سلطان حقائق اور انسانی دسائس و خدع کی سب سے بڑی اور سب سے وسیع جنگ کا فیصلہ کرے گا - پہلی جنگ اگر اپنے رقبے کی وسعت ، اپنے سامانوں کی ہیبت اور نتائج و اطراف کی دہشت میں دنیا کا سب سے بڑا حادثہ ہے تو یہ جنگ بھی حقیقت کے قہر و استیلا ، انسانی خدع و حیل کے انتہائی جد و جہد اور آلات اسلحہ ، تصنع و دسائس کی نئی نئی نمائشوں کا تاریخ عالم میں سب سے بڑا واقعہ ہوگی - - - -

اس میدان جنگ کے حریف کی قوتیں دوسری قسم کی ہیں اور یہ وہ تجربہ ہے جو یکساں نتائج کے ساتھ دنیا میں ہمیشہ کیا جا چکا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ سب سے بڑا تجربہ ہو اور اس کی وسعت عدیم النظیر ہو۔ تاہم نتیجہ وہی نکلے گا جو ہمیشہ نکل چکا ہے۔ 'ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا'۔ حقیقت کی طاقت قیصر اور دول متحدہ کی طاقت سے زیادہ محکم ہے اور اس کی دیواروں کے ڈھانے کے لیے کوئی توپ نہیں ڈھالی جا سکتی۔

بالآخر دونوں جنگوں کے حریف افگن نتائج ایک ہی وقت میں ظاہر ہوئے اور ایک طرف 'انتورپ' کے مشہور عالم استحکامات کی تسخیر کا اعلان ہوا، دوسری طرف سے سلطان حقیقت نے بھی اپنے منتظرہ اور ناممکن التبدیل قہر و تسلط کا آخری فیصلہ کر دیا۔۔۔۔"

علی گڑھ یونیورسٹی کا باقاعدہ نام رکھنے کا مرحلہ پیش آیا تو مولانا نے تجویز پیش کی، اس کا نام علی گڑھ یونیورسٹی کی بجائے "مسلم یونیورسٹی کہ رکھا جائے۔ چنانچہ ۵ مارچ ۱۹۱۳ء کے "الہلال" میں انھوں نے لکھا:

"تو پھر اے ہندوستان کے مسلمانو! کیا تم چاہتے ہو کہ تمھارا تمام سرمایہ، تمھاری تمام عمر کی پونجی، تمھارا تمام بنا بنایا کھیل یعنی مدرسۃالعلوم علی گڑھ، جس پر کئی ایک بزرگان قوم کی زندگیاں صرف ہو چکی ہیں، جس پر قوم کا بے شمار روپیہ صرف ہو چکا ہے، جس پر قوم کی نگاہیں اٹھتی ہیں اور جو قوم کی تمام امیدوں کا مرکز ہے، گورنمنٹ کے حوالے کر دیا جائے؟

ہندوستان کے مسلمانو! کیا تم اس بات پر رضا مند ہو کہ مدرسۃالعلوم کی رہی سہی آزادی کا بھی خاتمہ ہو جائے؟ اور کیا تم اس بات کے لیے تیار ہو کہ یونیورسٹی اگر تمھیں مل جائے تو

اس کا نام ''مسلم یونیورسٹی'' نہ ہو بلکہ ''علی گڑھ یونیورسٹی'' ہو - جو آزاد ، اسلامی اور مکمل یونیورسٹی نہ ہو بلکہ گورنمنٹ کے زیر اثر غیر اسلامی اور محدود یونیورسٹی ہو ؟ اگر ان تمام باتوں کا جواب نفی میں ہے تو پھر اے مسلمانو ! ہر وقت کیوں کوشش نہیں کی جاتی کہ مسلمانوں کا کالج مسلمان ہی رہے ؟

اسلوب

مولانا کے اداریوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کی تحریر بہت مربوط ہوتی ہے - بڑے بڑے انشا پردازوں کی تحریروں میں حک و اضافہ اور تغیر و تبدل سے بعض اوقات بہت حسن و خوبی پیدا کی جا سکتی ہے - لیکن ان کے یہاں الفاظ کی نشست و برخاست کچھ اس طرح ہوتی ہے کہ رد و بدل سے سوائے قباحت اور بد نمائی کے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا - الفاظ ان کے سامنے دست بستہ کھڑے نظر آتے ہیں - محاورے اور ترکیبیں مولانا بلا تکان استعمال کرتے ہیں گویا کہ انھی کی تحریروں کے لیے نازل ہوئی ہوں -

الفاظ و محاورات اور آیات و استعارات کا استعمال اگرچہ ان کی تحریروں کو بہت ثقیل بنا دیتا ہے جس کے باعث قاری بعض اوقات دلائل کی بجائے الفاظ کے در و بست میں الجھ کر رہ جاتا ہے ، مگر ان کی عبارت آرائی انسان کو حیرت انگیز طریقے پر اپنی طرف کھینچ لیتی ہے - ایک اقتباس ملاحظہ ہو :

''ہمارے سامنے تو صرف دو ہی راستے ہیں (من شاء فلیومن و من شاء فلیکفر) کفر و اسلام ، شرک و توحید ، نور و حکمت ، صداقت و کذب ، حق و باطل ، ہر شخص مختار ہے کہ دونوں میں سے ایک اختیار کر لے (لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی) لیکن جدید فن اخلاق کے ماہرین کہتے ہیں کہ گو یہ سچ ہو مگر

ان دونوں کے درمیان ایک برزخی اور بین بین راہ بھی ہے اور وہی ہم کو بھی اختیار کرنی چاہیے ، اسی میں فلاح اور اسی میں ہر دلعزیزی ہے - کفر و اسلام دونوں کو ساتھ لیجیے- بت پرستی و توحید دونوں کو دل میں رکھیے - اہرمن اور یزداں دونوں کو رام کیجیے - ایک ہی طرف کیوں جھکیے جب دونوں دروازے کشادہ ہو سکیں - صرف کعبے ہی کے کیوں ہو رہیے ، جب بت کدے سے بھی راہ و رسم قائم رہ سکے -''

الہلال میں مولانا نے بہت کچھ قلم برداشتہ لکھا ، لیکن کیا مجال جو طرز نگارش کی دلکشی اور دلربائی میں ذرا فرق آنے پائے- مولانا جو کچھ لکھتے ، کامل یقین اور خلوص سے لکھتے - اس لیے ان کا ایک ایک لفظ جوش و خروش میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے - جوش اور تاثیر کا عنصر ان کے یہاں اس کثرت اور شان سے ملتا ہے کہ ان کا اسلوب منفرد بن گیا ہے جو ایک خاص دلکشی لیے ہوئے ہے - ساتھ ہی ساتھ وہ واقعات کی تصویر کشی بھی کرتے جاتے ہیں اور اس طرح تحریر میں ایک ڈرامائی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے - ہر لفظ اور ہر فقرہ متحرک معلوم ہوتا ہے - ان کی تحریروں میں طنز بھی موجود ہے جس کی زد جدیدیت ، علم و دانش کے زعم باطل اور افرنگیت پر پڑتی ہے - کہیں کہیں وہ خیالات کی بے پناہ آمد اور تبحر علمی کی بدولت اصل موضوع سے ہٹ کر اس کے دور دراز گوشوں میں چلے جاتے ہیں اور اصل مدعا کی طرف دیر سے آتے ہیں - عام قاری کے لیے تسلسل قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے - لیکن اسلوب کی تاثیر قاری کو مسحور کیے رکھتی ہے - الفاظ کی در و بست ایسی ہوتی ہے کہ پڑھنے والا مسحور ہو کر دلائل کے استحکام سے بے پرواہ ہو جاتا ہے - عربی اور فارسی پر عبور رکھنے کے باعث دونوں زبانوں کے الفاظ ، ضرب الامثال اور اشعار بکثرت استعمال کرتے ہیں - چنانچہ عام قاری بعض مقامات پر

تحریر سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے ۔ اگرچہ حسرت موہانی نے ان کی نثر کو یوں خراج تحسین ادا کیا ہے ؎

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا

لیکن یہ حقیقت ہے کہ مولانا نے اپنے تبحر علمی اور عربی و فارسی کے علم کی بلند شہ نشیں پر بیٹھ کر لکھا ہے ، عام قاری بھی ان کی تحریر سے محظوظ ہوتا ہے ، اثر بھی لیتا ہے ، لیکن پوری تحریر کو سمجھ نہیں سکتا ۔ سکسینہ کی رائے یہ ہے کہ مولانا نے عربی اور فارسی کے غیر مانوس الفاظ سے اردو زبان کو مشکل بنا دیا ہے ۔

خصوصیات

مندرجہ بالا مثالوں اور 'الہلال' اور 'البلاغ' کے تفصیلی جائزے سے مولانا ابوالکلام آزاد کی اداریہ نگاری کی یہ خصوصیات سامنے آتی ہیں :

۱۔ جرأت اور بیباکی

ان کے اداریوں کی بھی نمایاں خصوصیت جرأت اور بیباکی ہے ۔ حکومت کی سختیوں ، قید و بند ، مخالفوں کی قوت ، طمع اور کسی قسم کی مصلحت کو خاطر میں لائے بغیر سچی بات کہتے ہیں ۔

۲ ۔ وسعت نظر

ان کی دوسری تحریروں کی طرح ان کے اداریوں میں بھی وسعت نظر اور تبحر علمی غالب ہے ۔ وہ ہر مسئلے کو اپنے ایمان ، یقین اور فلسفۂ زندگی کے وسیع تر پس منظر میں دیکھتے ہیں اور

مختلف معاملات و مسائل میں جو فیصلہ دیتے ہیں اس کی بنیاد منطق ، واقعات کے تجزیے یا استدلال پر نہیں ہوتی بلکہ ان کے اس علم پر ہوتی ہے جو ان کو بطور عالم ، مفکر ، تاریخ دان اور داعی کے حاصل ہے ۔ کان پور کی مسجد کا المیہ ہو یا بلقان کی جنگ ، وہ اسے حق و باطل ، ظالم و مظلوم کی آویزش کے رنگ میں دیکھتے ہیں اور قانون فطرت کی روشنی میں نتائج اخذ کرتے ہیں ۔

۳ ۔ اسلام

مولانا کے اداریوں کی روح 'اسلام' اور اسلام سے ان کی والہانہ محبت ہے ۔ وہ جگہ جگہ قرآن مجید کی آیات اور احادیث کے حوالے دیتے ہیں ۔ ہر مسئلے اور واقعے کو عموماً قرآن مجید کی روشنی میں دیکھتے ہیں اور اسلامی تعلیمات ہی کی روشنی میں راہنمائی کرتے ہیں ۔ اس طرح ان کے اداریے بلند پایہ عالمانہ تحریر کی صورت اختیار کر لیتے ہیں ۔

۴ ۔ احساس ذات

مولانا اپنے اداریوں میں بھی اپنے علم و فضل کے بلند مقام سے اظہار خیال کرتے ہیں اور جگہ جگہ اپنے لیے لفظ 'میں' اور مخاطبوں کے لیے 'تم' یا 'تو' کے الفاظ استعمال کرتے ہیں ۔ گویا انھیں اپنی بلند حیثیت کا احساس ہے اور انھیں یہ علم ہے کہ ان کے مخاطب ان کی سطح سے نیچے ہیں ۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مولانا مقرر بھی تھے اور ان کی تحریر میں بھی خطابت کا انداز کارفرما ہے ۔ گویا لکھتے وقت بھی وہ قارئین سے اسی طرح مخاطب ہوتے ہیں جیسے جلسے کے حاضرین سے ہوا جاتا ہے ۔ پھر عوام الناس کو اس انداز سے خطاب کرنا اس دور کا دستور بھی تھا ۔

۵ ۔ دعوت

مولانا کے اداریوں میں 'دعوت' کا عنصر غالب ہے اور اس

عنصر نے ان کے اداریوں میں لسانی اعتبار سے محبوبیت پیدا کر دی ہے - وہ جو کچھ کہتے ہیں دل سے کہتے ہیں اور جوش و جذبہ سے کہتے ہیں - پھر اس میں خطابت کا رنگ بھی مل جاتا ہے - داعی مخلص اور پر جوش ہو تو اس کی باتیں اثر ضرور کرتی ہیں - سننے والا اپنی کوتاہیوں ، مصلحتوں یا خودغرضیوں کی بنا پر بیشک ان پر عمل نہ کرے لیکن اثر ضرور لیتا ہے -

۶ - اثر و جاذبیت

مولانا کے اداریے لسانی اعتبار سے مشکل ہونے کے باوجود مؤثر ہیں اور اپنے اندر خاص قسم کی جاذبیت لیے ہوئے ہیں - ان کی تحریر پر زور اور پر رعب ہے - متوازن فقروں کی تکرار ، ہم قافیہ ، الفاظ کی فراوانی ، مختصر بات کو بار بار مختلف پیرایوں میں بیان کرنے اور اشعار کے استعمال سے ان کی تحریر میں حسن اور جاذبیت کے عناصر پیدا ہو جاتے ہیں ، لیکن یہ ایسا حسن ہے جس میں بناوٹ اور تصنع کا دخل نہیں ہے -

حوالہ جات

۱ - آثار ابوالکلام ، ص ۲۸ -

2. Jawahar Laal Nehroo, Discovery of India.

3. بحوالہ Aspeers of Abul Kalam Azad مرتبہ عبداللہ بٹ

مولانا غلام رسول مہر کی اداریہ نگاری

مولانا غلام رسول مہر نے میدان صحافت میں اپنی آمد کے بارے میں راقم کو بتایا کہ: ''عالم اسلام کا حال ابتر تھا۔ مسلمانوں کی رہی سہی امید ''ترکی'' سے وابستہ تھی۔ انگریز اسے بھی ختم کرنا چاہتے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ اپنا اخبار جاری کرکے مسلمانوں کے لیے جو کچھ ممکن ہو کروں۔ پروفیسر سید عبدالقادر مرحوم نے مشورہ دیا کہ پہلے کچھ مدت کسی اخبار میں کام کرو؛ تجربہ حاصل ہو جائے تو پھر اخبار جاری کرنا مناسب ہوگا۔ مفصل گفتگو کے بعد سید صاحب کی رائے صائب معلوم ہوئی اور میں زمیندار میں کام کرنے پر راضی ہو گیا۔ اس زمانے میں مولانا ظفر علی خاں مرحوم منٹگمری (حال ساہیوال) جیل میں تھے۔ مولانا اختر علی خاں مرحوم میانوالی جیل میں تھے۔ سالک مرحوم بھی گرفتار تھے۔ ان کے خلاف مقدمہ چل رہا تھا۔ کچھ عرصے بعد انہیں ایک سال قید کی سزا دے کر میانوالی جیل میں بھیج دیا گیا۔ کم و بیش ایک مہینے کے بعد پروفیسر سید عبدالقادر شاہ مرحوم نے مجھے لاہور بلایا۔ وہ موچی دروازے اور اکبری دروازے کے درمیان سرکار روڈ پر کسان بلڈنگ میں رہتے تھے۔ میں ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے شفاعت اللہ خاں مرحوم کو بلا لیا جو زمیندار کے مہتمم عمومی تھے۔ میں ان سے شناسا تھا۔ انہوں نے کہا کہ گاندھی جی بردولی سے سول نافرمانی کا آغاز کرنے والے ہیں، اس پر اداریہ لکھ دو۔

اگرچہ کچھ کرنے کا جوش و جذبہ تو بہت تھا مگر اس سے پہلے کسی اخبار میں کوئی مضمون نہیں لکھا تھا۔ میں نے حامی بھر لی۔ پروفیسر مرحوم سے تبادلۂ خیال کیا، صبح اٹھا، کاغذ پنسل لے کر سامنے گول باغ میں جا بیٹھا اور ''طلوع صبح امید'' کے عنوان سے ایک اداریہ لکھا۔ یہ میری پہلی سیاسی تحریر تھی جو نومبر ۱۹۲۱ع کے ''زمیندار'' میں چار قسطوں میں شائع ہوئی۔ چند روز بعد میں گھر گیا۔ وہاں کسی نے والدہ مرحومہ کو بتا دیا تھا کہ میں اس جگہ کام کرنے کے لیے لاہور گیا ہوں جہاں سے کئی ایڈیٹر قید ہو چکے ہیں۔ والدہ سخت خفا تھیں۔ انھوں نے کہا: ''میں نے کبھی نہیں کہا کہ تم ملازمت کرو یا اور کسی کام کا انتظام سوچو۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ تم اپنی زندگی جیلوں میں گذارو۔'' میں نے اقرار کر لیا کہ آپ کی رضامندی کے بغیر ہرگز نہ جاؤں گا۔ شفاعت‌اللہ خاں صاحب کو خط بھی لکھ دیا۔ ایک دو مقالے گھر سے لکھ کر بھیجے۔ پھر ''زمیندار'' طلبئ ضمانت کے باعث کچھ عرصے کے لیے بند ہو گیا۔ نئی ضمانت داخل کرنے کے بعد شفاعت‌اللہ خاں اور مرتضیٰ احمد خاں میکش جو ''زمیندار'' میں آ گئے تھے، گھر پہنچے۔ انھوں نے خود والدہ کو اطمینان دلایا اور میرے لیے لاہور آنے کی اجازت لے لی۔ چنانچہ میں فروری ۱۹۲۲ع میں مستقل طور پر لاہور آ گیا''۔

مولانا غلام رسول مہر زیادہ تر اداریے لکھتے تھے۔ کبھی کبھار کوئی اور مضمون بھی لکھ دیتے تھے یا ترجمہ کر دیتے تھے۔ ایک سال بعد مولانا سالک رہا ہو کر آ گئے تو انھوں نے فکاہی کالم لکھنے کے ساتھ ساتھ شذرات لکھنے کا کام بھی سنبھال لیا۔ البتہ افتتاحی مقالات مہر صاحب ہی لکھتے رہے۔ ان دنوں زمیندار چھوٹے سائز (۱۸ × ۲۲) پر نکلتا تھا۔ اداریے

صفحہ ۲ پر چھپتے تھے - ۱۹۲۳ع میں زمیندار کا سائز ۲۲×۲۹ کر دیا گیا - دسمبر ۱۹۲۴ع میں مولانا ظفر علی خاں بھی رہا ہو کر آ گئے - مگر افتتاحیہ نگاری کا کام زیادہ تر مولانا مہر ہی کے سپرد رہا - مارچ ۱۹۲۷ع تک وہ زمیندار میں کام کرتے رہے - پھر بعض اسباب کی بنا پر آپ اور سالک صاحب زمیندار سے علیحدہ ہو گئے اور نئے اخبار کے اجرا کی تجویز سوچی - چنانچہ ۴ اپریل ۱۹۲۷ع کو ان دونوں نے روزنامہ ''انقلاب'' جاری کیا جو اکتوبر ۱۹۴۹ع تک زندہ رہا - انقلاب بھی شروع میں چھ صفحات پر چھپتا تھا - اداریہ اور شذرات صفحہ ۲ پر ہوتے تھے - اس کے علاوہ اس صفحے پر افکار و حوادث اور مضامین وغیرہ چھپتے تھے - کچھ مدت بعد اخبار کے آٹھ صفحات کر دیے گئے - ۱۹۴۹ع میں انقلاب کی بندش کے بعد مولانا مہر تالیف و تصنیف میں مصروف ہو گئے اور اب تک متعدد معرکۃالآرا کتابیں تصنیف و تالیف کرچکے ہیں ، اور بطور محقق ، نقاد ، مؤرخ ، مترجم ، عالم اور صحافی بلند پایہ حیثیت رکھتے ہیں -

مولانا مہر کے اداریے

مولانا مہر نے جس وقت اداریہ نگاری شروع کی بر صغیر پاک و ہند میں ہنگاموں اور تحریکوں کا زور تھا - جوش و جذبہ کی فضا تھی اور اخبارات بھی تحریکوں کو چلانے ، کامیاب بنانے اور جوش و جذبہ کی فضا پیدا کرنے میں برابر کا حصہ لیتے تھے - وہی اخبار زیادہ پڑھا جاتا تھا جو ملک کی فضا سے ہم آہنگ ہوتا اور اسی اداریہ نویس کا طوطی بولتا جس کی تحریر پر جوش اور جذبات انگیز ہوتی - مولانا نے اس قسم کی فضا میں پہلی بار اداریوں میں عقل ، استدلال اور منطق کے ساتھ بات کرنے کی نمایاں کوشش کی - مولانا سالک کے الفاظ میں :

''انقلاب کسی بھی حالت میں جذبات انگیزی اور ہنگامہ

آرائی میں شامل نہ ہوتا تھا بلکہ متانت اور سنجیدگی سے سیاسی معاملات پر بحث کرتا تھا ۔ اور اکثر ایسی باتیں بھی کہہ جاتا تھا جو عوام کو اچھی معلوم نہ ہوتی تھیں[۱]'' مولانا کی کوشش یہ ہوتی کہ جو کچھ وہ جس طرح خود محسوس کرتے تھے پڑھنے والا بھی اسی طرح محسوس کرے ۔ رفتہ رفتہ ان کا منفرد انداز پختہ اور مسلم ہوتا گیا ۔ زمیندار کے ساتھ وابستگی کے دوران میں بھی اگرچہ ان کے مدلل اور جامع اداریوں کی منفرد حیثیت نمایاں ہو چکی تھی، ''انقلاب'' میں آ کر ان کے اداریوں کا منفرد انداز پختہ اور مستحکم ہوگیا ۔ انقلاب میں ان کی اداریہ نگاری کے دور کو 'مباحث' کا دور کہا جا سکتا ہے ۔ چنانچہ ان مباحث میں معلومات پر مبنی اعداد و شمار اور حقائق اور استدلال کا عنصر غالب ہوتا تھا ۔ مولانا مہر اور ''انقلاب'' کے موقف کے سلسلے میں میاں محمد شفیع کی یہ رائے خاصی وقیع ہے :

''مسلمانوں کے اردو اخبارات میں ''انقلاب'' بہت بڑی بیک گراؤنڈ کا اخبار تھا ۔ نہرو رپورٹ سے راؤنڈ ٹیبل کانفرس نمبر ۳ تک اس روزنامے نے جس ہمت و شدت سے مسلمانوں کے قومی نقطہ نگاہ کی ترجمانی کی تھی اس سے پڑھے لکھے مسلمانوں میں ''انقلاب'' کا بہت چرچا تھا ۔ مولانا غلام رسول مہر قلم کے دھنی تھے اور اپنے زور قلم سے دن کو رات اور رات کو دن ثابت کر دیا کرتے تھے ۔ اسی طرح ان کے ساتھ مولانا عبدالمجید سالک باغ و بہار کے ایڈیٹر تھے ۔ اپنے افکار و حوادث کے کالم کے ذریعے وہ جو چاہتے کہہ سکتے تھے ۔ یہ دونوں بزرگ علامہ اقبال کے ذاتی نیاز مند تھے لیکن صوبائی سیاست میں ان کا انداز فکر حضرت علامہ اقبال سے جداگانہ تھا ۔ سوچنے کی بات ہے کہ ایک مکتب فکر کے حضرات مہر و سالک مخالف ہوں تو وہ اپنے زور قلم سے کیا کیا نہ گل کھلائیں گے ۔ چنانچہ انقلاب کے کالموں میں

نت نئے اور بھانت بھانت طریقوں سے مسلم لیگ کی گت بنتی تھی[۲] ۔"

مولانا اپنے نقطۂ نظر کے مطابق جس بات کو صحیح سمجھتے اس کو نہایت مدلل اور مؤثر پیرائے میں پیش کرتے۔ مسلم لیگ اور اس کی پالیسی سے اختلاف کے باوجود بر صغیر پاکستان و ہند کے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ اور ہندوؤں کے عزائم کو بے نقاب کرنے اور ناکام بنانے کے سلسلے میں انھوں نے بہت کام کیا۔

مہر صاحب کا انداز فکر یہ تھا کہ درپیش مسائل کو دلائل اور منطق کے ساتھ لوگوں کے ذہن نشین کرایا جائے، آسان اور عام فہم زبان میں سمجھایا جائے۔ ہنگامہ خیزی اور بے جا جوش و خروش سے وقتی طور پر ہنگامہ پیدا ہو جاتا ہے، مگر اس طرح دیرپا اور مستقل اثر قائم نہیں رہتا۔ چنانچہ وہ اداریے کے لیے موضوع کا انتخاب کرنے کے بعد خوب غور و خوض کرتے، متعلقہ واقعات کی چھان بین کرتے، حقائق اور اعداد و شمار جمع کرتے اور بالآخر اداریے میں اپنے مؤقف کے حق میں دلائل کا انبار لگا دیتے۔

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ لکھتے ہیں : "میری رائے میں سرسید کی صحافتی عقلیت کا انداز ہمارے زمانے میں کسی نے اختیار کیا تو وہ مولانا مہر مدیر انقلاب ہیں[۳] ۔"

مولانا مہر کی اداریہ نگاری کا ایک وصف یہ ہے کہ وہ اس دور کے اداریہ نگاروں کی عام روش کے برعکس زیر بحث مسئلے کو قارئین کے ذہن نشین کرانے کی بار بار اور مسلسل کوشش کرتے۔ اگرچہ دوسرے اخبارات میں بھی بعض اوقات طویل اور قسط وار اداریے چھپتے تھے مگر مولانا مہر زیر بحث مسئلے کے

مختلف پہلوؤں پر مختلف عنوانات کے تحت کئی کئی دن تک اداریوں میں روشنی ڈالتے اور یہ کوشش کرتے کہ مسئلہ تمام پہلوؤں سمیت قارئین کے ذہن نشین ہو جائے۔ دوسرے اخبار عموماً متعلقہ مسئلے پر ایک اداریہ چھاپتے اور پھر اس مسئلے کو فراموش کر دیتے۔ مگر مولانا مہر جب کسی مسئلے کو اٹھاتے تو اسے کسی نتیجے تک پہنچانے کی کوشش کرتے۔ مثال کے طور پر زمیندار میں انھوں نے سب سے پہلے ''طلوع صبح امید'' کے عنوان سے جو اداریہ لکھا وہ زمیندار کے چار شماروں میں مسلسل شائع ہوا اور متعلقہ مسئلے کے تمام پہلو لوگوں کے سامنے آ گئے۔ انقلاب میں آنے کے بعد نہرو رپورٹ ختم کرنے کو ضروری سمجھا تو اس مسئلے پر تسلسل و تواتر کے ساتھ پر زور اداریے لکھے۔ برصغیر کی آزادی کے لیے ہندو مسلم اتحاد کو لازمی خیال کیا تو اس پر بار بار لکھا اور عدم اتحاد کے مضمرات کے تمام پہلو دلائل اور براہین کے ساتھ پیش کیے۔ کشمیری مسلمانوں کا سوال اٹھایا تو ان کی مظلومیت اور ان پر ڈوگرہ مظالم کے تمام پہلو باری باری اور تفصیلی طور پر اجاگر کیے۔ ہندوستان میں سرکاری یا نیم سرکاری اداروں میں مسلمانوں کی نمائندگی اور تناسب کے موضوع پر قلم اٹھایا تو مسلمانوں کی نمائندگی کے ہر پہلو کو اعداد و شمار اور حقائق کے ساتھ پیش کیا۔

مولانا مہر کے اداریے جامع مقالات ہوتے تھے اور اکثر و بیشتر ادارتی صفحے کے نصف حصے پر اور بعض اوقات تین چوتھائی صفحے پر محیط ہوتے تھے۔ اداریے میں زیر بحث مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر ذیلی عنوانات کے تحت روشنی ڈالتے تھے۔ بحیثیت مجموعی مولانا نے اپنے اداریوں میں برصغیر کی آزادی کے طریق عمل کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ بیرون ملک اسلامی ممالک مثلاً ترکی، مصر، الجزائر، مراکش، عرب، حجاز، شام، فلسطین اور عراق

کی آزادی پر بار بار لکھا۔

مثالیں

مندرجہ ذیل مثالوں سے مولانا مہر کی 'اداریہ نگاری' کے انداز، اسلوب، ہیئت اور ان کے انداز فکر کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

۱ - "۱۹۳۰ء کا سوراج

خالص ہندو دستور کے نفاذ کی کوشش

کانگرس اور نام نہاد "کن ونشن" کے اجلاس ختم ہوئے تو اس کے ساتھ ہی ۱۹۳۰ء کے 'سواراج' کا غلغلہ بلند ہو گیا ہے۔ اس 'سواراج' کی حقیقت کیا ہے؟ یہ ہے کہ کانگرس نے ایک قرارداد کے ذریعے سے نہرو رپورٹ وائسرائے کی خدمت میں پیش کر دی ہے۔ ساتھ ہی کہہ دیا کہ اگر ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء تک اس رپورٹ کے مطابق ہندوستان میں نظام حکومت رائج نہ ہوا تو کانگرس عدم ادائے محاصل وغیرہ کی تحریکات شروع کر دے گی۔ ہم اس قرارداد پر اپنی ایک قریبی اشاعت میں تبصرہ شائع کر چکے ہیں اور بتا چکے ہیں کہ ہندوستان کی آزادی کے لیے صحیح اور منصفانہ اصول پر جتنی کوششیں کی جائیں گی ہم ملت اسلامیہ کے ایک ایک فرد کو ان کی اعانت پر آمادہ کرتے رہیں گے، لیکن نہرو کمیٹی کے تجویز کردہ دستور اساسی کو نافذ کرانے کے لیے جو قدم اٹھایا جائے گا اسے ہر اعتبار سے ناکام بنانا ہمارا سب سے بڑا قومی اور وطنی فرض ہوگا۔

مسلمانوں کو انتباہ

ہم ہندوستان کی آزادی، ہندوستان کی فلاح و بہبود اور ہندوستان کی بہتری و برتری کے لیے تو قربانیاں کر سکتے ہیں، مگر ہندو راج

کی سکیموں کو نافذ کرانے میں اعانت و رفاقت نہیں کر سکتے ۔ ہر مسلمان کو متنبہ اور آگاہ رہنا چاہیے کہ اسے نہرو رپورٹ کے لیے عدم ادائے محاصل کی تحریک یا اس نوع کی کسی دوسری تحریک یا کسی خاص آئینی و موالاتی تحریک میں شریک نہیں ہونا چاہیے ، بلکہ ابھی سے فیصلہ کر لینا چاہیے کہ اگر خدا نخواستہ ہندوستان کی کسی جماعت نے یا کانگرس نے جو ہمارے خیال کے مطابق آج کل خالصتہً ہندو مقاصد کا آلہؑ کار بنی ہوئی ہے ، کوئی ایسی تحریک شروع کی تو ہر مسلمان کے لیے اس کی پر زور اور شدید مخالفت لازمی ہوگی ۔

مسلم اجتماعات اور نہرو رپورٹ

وائسرائے یا کمشن یا برطانوی پارلیمنٹ کو اب نہرو رپورٹ کی حقیقی حیثیت کے متعلق کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہ سکتا ۔ مسلمانوں کی ایک بھی جماعت اس کی حامی نہیں ۔ جمیعۃ العلما اس کی کھلم کھلا مخالفت کر چکی ہے ۔ لاہور لیگ اسے مسترد کر چکی ہے ۔ مرکزی مجلس خلافت اس سے اختلاف کر چکی ہے . . .

ہندوؤں کی نئی چال

یہ ہندوؤں کی نئی چال ہے ۔ وہ جانتے ہیں کہ مسلمان اس رپورٹ کو یا اس میں پیش کردہ دستور اساسی کو مان نہیں سکتے ۔ لہٰذا اب انہوں نے اسے منظور کرانے کا زیادہ پر پیچ ''راستہ''اختیار کیا ہے ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جب عدم ادائے محاصل وغیرہ کی تحریک شروع ہو گی تو اکثر مسلمان اس کی ظاہری و نمائشی ہنگامہ آرائی سے متاثر ہو کر ہندوؤں کے ساتھ ہو جائیں گے اور اسی طرح باؤ ہو میں رپورٹ کی منظوری اور نفاذ کا بندوبست ہو جائے گا ۔ مسلمانوں کو چاہیے وہ کہ کسی تحریک کی نمائشی دل فریبی و دل کشی سے متاثر ہو کر اپنا گلا کٹوانے پر آمادہ نہ ہو جائیں ۔ ہمارے لیے

ہندوستان کی آزادی کی کوشش ضروری ہے ، لیکن اس کی شکل یہ نہیں کہ ہم نہرو رپورٹ کی منظوری اور نفاذ کے لیے ترک موالات شروع کر دیں یا عدم ادائے محاصل میں شریک ہوں۔ ہم ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے ہیں ، لیکن اس لیے نہیں کہ ہندو راج کے لیے راستہ صاف کریں اور اپنے حقوق کے گلے پر چھری پھیر دیں یا اپنی ملت کے مستقبل ہی کو فنا کر ڈالیں۔

اسلامی جماعتوں کا فرض

ہر اسلامی جمیعۃ" اور ہر اسلامی ادارے کا فرض ہے کہ وہ ابھی سے کانگرس کی اس قرارداد کی مخفی فریب کاریاں عام مسلمانوں پر واضح کر دے اور انہیں بتا دے کہ نہرو رپورٹ کے لیے جو تحریک شروع ہوگی ، ہر مسلمان کے لیے لازمی ہوگا کہ وہ اس کی سخت سے سخت مخالف کرے۔ پہلے بعض فریب کار ہندو

اور بعض فریب خوردہ مسلمان سائمن کمشن کے بائیکاٹ کے جلسوں میں نہرو رپورٹ کے حق میں قرار ادیں منظور کر چکے ہیں اور اس نوع کے چند واقعات سے متاثر ہو کر مرکزی مجلس خلافت کے اکابر کو اعلان کرنا پڑا تھا کہ مسلمان اس فریب سے بچیں اور اس شرارت سے متنبہ رہیں۔ اب پھر وہی دور فریب شروع ہونے والا ہے - لوگوں کو آزادی' ہند کے نام پر قربانیوں کی دعوت دی جائے گی اور مقصود یہ ہو گا کہ نہرو رپورٹ کا پیش کردہ دستور اساسی نافذ ہو جائے۔ مہاتما گاندھی بھی اس باب میں ہندوؤں کے ہمنوا بلکہ ہندو مقاصد کے داعی بنے ہوئے ہیں اور پنڈت مالوی نے گزشتہ سال کے وسط میں ۱۹۳۰ء تک جس سواراج کے حصول کا اعلان کیا ہے ، یہ اسی کے لیے جد و جہد کا ابتدائی پروگرام ہے -

حکومت کو انتباہ

ہم حکومت ہند ، وائسرائے کمشن اور برطانوی پارلیمنٹ

سے یہ کہہ دینا چاہتے ہیں کہ ایک بھی اسلامی جماعت نہرو رپورٹ کی حامی نہیں اور گنتی کے چند مسلمان ہیں جو انفرادی حیثیت سے نہرو رپورٹ پر دستخط کر چکے ہیں ۔ سات کروڑ کی وسیع ملت اسلامیہ میں سے ایک فرد بھی اس دستور اساسی کو ماننے کے لیے تیار نہیں ۔ اگر حکومت نے اس رپورٹ کو منظور کر لیا تو یہ سات کروڑ مسلمانوں کے حقوق کو تباہ کرنے کی خواہش کا اظہار ہوگا . . . الخ'' (انقلاب ۷ فروری ۱۹۲۹ع ۔

مولانا مہر کا یہ اداریہ نصف صفحے پر محیط ہے ۔

۲۔ ''دہلی کا ایک پیغام مظہر ہے کہ پنڈت موتی لال نہرو کی قیام گاہ پر پنڈت مالویہ ، مسٹر جیکر ، مسٹر کیلکر ، ڈاکٹر مونجے وغیرہ جمع ہوئے تاکہ آئندہ انتخابات میں کام کے لیے ایک مشترکہ بورڈ کے قیام کا بندوبست کریں ۔ اس اجتماع کے نتائج کی تفصیلات ہمارے سامنے نہیں ہیں ، لیکن ہر شخص کو معلوم ہے کہ آج پنڈت نہرو ، مالویہ ، مسٹر جیکر وغیرہ کے درمیان رشتۂ اتحاد نہرو رپورٹ نے پیدا کر دیا ہے اور اسی کو غالباً انتخاب کا ٹکٹ بنایا جائے گا ؛ ورنہ پنڈت مالویہ وہی ہیں جو پچھلے انتخابات کے موقع پر لالہ لاجپت رائے آنجہانی وغیرہ کی معیت میں کانگرس اور پنڈت موتی لال نہرو کے مقابلے پر جمے بیٹھے تھے اور انھوں نے کانگرس کو جا بجا شکستیں دی تھیں ۔ پنڈت مالویہ آج بھی ویسے ہی ہیں جیسے کہ ۱۹۲۶ع میں تھے ۔ آج بھی انھیں عدم تعاون سے اتنی ہی نفرت ہے جتنی کہ گزشتہ انتخابات کے موقع پر تھی ۔

مسلمانوں کی مجلس انتخاب

ہم مسلمانوں سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا وہ بھی زندہ قوم کے افراد کی طرح کام کے لیے تیار ہیں ؟ مسلم کانفرنس کے ارباب

بست و کشاد اور اکابر کی سعی و کوشش سے دہلی کے گزشتہ اجتماع میں ایک کمیٹی بن چکی ہے جس نے یہ کام اپنے ذمے لیا ہے اور اس کی ایک مجلس ماتحت اس وقت بڑی کمیٹی کا دستور العمل ترتیب دینے میں مصروف ہے۔ یہ حالات بڑے امید افزا ہیں۔ لیکن حقیقی اطمینان اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک وسیع پیمانے پر سرگرمی کے ساتھ کام شروع نہ ہو جائے۔ مسلم کانفرنس کا ٹکٹ اس کی وہ قرارداد ہے جو یکم جنوری ۱۹۲۹ع کو دہلی میں منظور ہوئی تھی۔ یہ قرارداد اب تک طول و عرض ہند کے ہر حصے میں پہنچ چکی ہے۔ صد ہا وسیع اور عام اجتماعات میں اس پر مہر تصدیق ثبت ہو چکی ہے۔ اس قرارداد میں اگرچہ بالصراحت نہرو رپورٹ کی مخالفت نہیں کی گئی، لیکن قرارداد جس اصول پر مبنی ہے وہ تقریباً سب کے سب نہرو رپورٹ کے اصول اساسی کی جڑ کاٹ رہے ہیں۔ کانفرنس کی قرارداد مسلمانوں کے بڑے بڑے اجتماع اور ان کے مختلف الخیال طبقات و عناصر کے وسیع سے وسیع حصے کے خیالات و جذبات کا آئینہ ہے اور بلا شائبہ مبالغہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ہندوؤں کے خیالات نہرو رپورٹ میں شاید اس جامعیت سے نہیں آئے جس جامعیت کے ساتھ مسلمانوں کے خیالات مسلم کانفرنس کی قرارداد میں آ گئے ہیں ...... الخ''

(انقلاب ۳، اپریل ۱۹۲۹ع)

اسی اداریے میں آگے ''انتخاب کا ٹکٹ'' اور ''حالات کی نزاکت'' کے زیر عنوان مزید بحث کی گئی ہے۔

۳ - ''ہندوؤں کی بندوق، مزدور جماعت کے کندھے پر

پروپیگنڈا کا وسیع جال پھیل چکا ہے

آج دنیا میں پروپیگنڈا حصول مقاصد کا بہترین ذریعہ سمجھا

جاتا ہے اور ہمارے ہندو بھائیوں نے اس ذریعے سے زیادہ کام لینے کا مصمم عزم کر لیا ہے۔ وہ بظاہر مختلف ٹکڑیوں اور جماعتوں میں بٹ گئے ہیں مگر حقیتاً سب جماعتیں ملی ہوئی ہیں اور سب ایک مقصد کو سامنے رکھ کر اپنے اپنے دائروں میں کام کر رہی ہیں۔ ہندو جانتے ہیں کہ ہندوستان کی سیاسی زندگی کے فیصلے کا یہ نہایت اہم موقع ہے اور بقول مالوی جی (لاہور میں سٹوڈنٹ یونین وغیرہ کے روبرو جو تقریریں کی تھیں وہ ملاحظہ فرمائیے) اس وقت جو فیصلے ہوں گے آئندہ دس سال تک ان میں رد و بدل کا کوئی امکان نہ رہے گا۔ اس لیے انہوں نے اپنی ساری قوتیں اس بات پر لگا دی ہیں کہ فرقہ وار نیابت باقی نہ رہے اور رہے تو اس کی حیثیت اتنی معمولی ہو کہ وہ ہندوؤں کی اکثریت کے مقاصد 'اقتدار' عامہ پر اثرانداز نہ ہو سکے۔ ان کی ایک جماعت کانگریس کا جھنڈا اٹھائے کھڑی ہے لیکن اصلاً اس کی غرض یہ ہے کہ فرقہ وارانہ نیابت اڑ جائے اور مسلمان فرقہ واری کی بنا پر ہندوؤں سے جو کچھ واپس لے سکتے ہیں اس کا کوئی موقع نہ آئے اور نہرو رپورٹ اس جماعت کی مقصد برآری کا ذریعہ ہے۔

متعدد زبانیں ایک آواز

یہ جماعت کئی حصوں میں منقسم ہے۔ بعض لوگ حکومت کی زبردست مخالفت کا اعلان کر رہے ہیں، بعض مزدور جماعت سے امیدیں لگائے بیٹھے ہیں اور اظہار خیالات میں بہت نرم اور نیاز مند ہیں، مثلاً پنڈت مدن موہن مالوی۔ بعض دوسرے لوگ جو اپنے آپ کو بہت تیز اور شعلہ مزاج ظاہر کر رہے ہیں، جب ضرورت محسوس کرتے ہیں تو انتہائی بے تکلفی سے وائسرائے کے ساتھ چائے پی آتے ہیں اور کچھ عرض معروض بھی کر آتے ہیں، مثلاً پنڈت نہرو، مہاتما گاندھی وغیرہ۔ ایک جماعت انگلستان میں بھی کام کر رہی ہے اور لالہ لاجپت رائے آنجہانی نے بعض مزدور ارکان

سے جو تعلقات خصوصی پیدا کر لیے تھے ، ان سے فائدہ اٹھا کر پارلیمنٹ کے ارکان یا مزدور حکومت کو اپنا ہمنوا بنا رہی ہے ۔

جعلی خبریں

ایک اور جماعت ہے جس کے کارکنوں کا کام محض یہ ہے کہ کوئی معاملہ ہو یا نہ ہو وہ جھوٹ خبر وضع کرکے دنیا میں پھیلا دیتے ہیں ۔ اس سے ایک طرف تو عام ہندوؤں کو پروپیگنڈے کی ایک شکل پر لگانا مقصود ہوتا ہے اور دوسری طرف برسر اقتدار لوگوں کو یہ جتلانا مقصود ہوتا ہے کہ اگر تم ہمارا بتایا ہوا راستہ اختیار کرو گے تو تمہاری قدر ہوگی ۔ 'فری پریس' نے اس جماعت کے پروپیگنڈے کا کام سنبھال لیا ہے ۔ اس کے کاروبار میں جو توسیع ہوئی ہے وہ بھی شاید اس لیے ہوئی ہے کہ موجودہ دور میں ہندوؤں کا پروپیگنڈا اچھے پیمانے پر چل سکے ۔ ۔ ۔ الخ''

(انقلاب ۳۰ جولائی ۱۹۲۹ء)

۴ - ''یوم النبی ؐ کے جلسے اور ان کی برکات

سیرۃ کمیٹیوں کو مستقل بناؤ

یوم النبی ؐ پر ہندوستان کے طول و عرض میں جو عظیم‌الشان جلسے ہوئے ان کی کیفیت محتاج بیان نہیں ۔ اگرچہ تحریک بہت کم وقت میں کی گئی تھی اور ہندوستان بھر میں اسے کامیاب بنانے کے لیے جس قدر تبلیغ و اشاعت اور عملی کام کی ضرورت تھی ، اس کے لیے قطعاً کوئی سامان موجود نہ تھا ۔ لیکن حضور خواجۂ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر مبارک کی برکات ملاحظہ فرمائیے کہ ہندوستان کے ہر قابل ذکر مقام پر سیرۃ کمیٹیاں بن گئیں اور ان کی سرپرستی میں یوم النبی ؐ نہایت شاندار طریق پر منایا گیا ۔ ۔ ۔

مسلمان اور حب رسول

بلا شبہ، ہم میں اسلام کی کوئی خصوصیت باقی نہیں رہی یا کم از کم بحیثیت جماعت نہیں رہی ہے۔ لیکن ان رنجدہ اور درد انگیز حالات کے باوجود آج بھی ہندوستان کا ہر مسلمان اپنے آقا و مولا صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر زندگی اور حرارت کے بڑے بڑے ثبوت فراہم کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔

تحریک سیرۃ کو مستقل بناؤ

آخر میں ہم اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ تحریک سیرۃ کو مستقل بنا کر کامیابی کی انتہائی منزل پر پہنچانا چاہیے اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی بکھری ہوئی قوموں کو مجتمع کرنے اور ان میں زندگی کی نئی روح پھونکنے کا نہایت مؤثر ذریعہ سمجھا دیا ہے ۔ ضروری ہے کہ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے ۔ آج بھی جب نہ کوئی مرکزی نظام موجود تھا ، سیرۃ کمیٹیوں کا ایک جال پورے ہندوستان میں پھیل گیا ہے اور ایسی کمیٹیاں بن گئی ہیں جن میں تمام اسلامی طبقوں کے نمائندے شریک ہیں ۔ اگر اس نظام کو مستقل بنا دیا جائے ، اس کا ایک عمدہ مرکزی ادارہ ہو جس کی ہدایات کے تحت تمام کمیٹیاں کام کریں ، تو ہمیں یقین ہے کہ احیائے ملت اور اصلاح احوال ملت کا اتنا بڑا کام انجام پا سکتا ہے جسے کوئی دوسرا ادارہ اب تک انجام نہیں دے سکا ۔ ۔ ۔ ۔ الخ ''

(۳۰ اگست ۱۹۲۹ء)

اس کے بعد اس اداریے میں 'ذکر رحمت اللعالمین کا اعجاز' ، 'اتحاد مسلمین کی نئی راہ' ، 'فریضہ' تشکر' و تحریک سیرۃ کو مستقل بناؤ' ، 'کشفی اور قرشی' کے ذیلی عنوانات کے تحت یوم النبی ؐ کو ملت اسلامیہ کی اصلاح کا ذریعہ بنانے کے سلسلے

میں تجاویز دی گئی ہیں اور یوم منانے کا اہتمام کرنے والوں کی تعریف کی گئی ہے۔

۵۔ ''عیداضحیٰ اور قیام امن

ہندو مسلم سے درد مندانہ اپیل

عید میں اب صرف دو روز باقی ہیں اس لیے ہم پھر ایک مرتبہ تمام ہندوؤں اور مسلمانوں سے درد مندانہ اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس مبارک مذہبی دن کو فتنہ و فساد اور قتل و خونریزی سے پاک رکھیں۔ ہم بارہا عرض کر چکے ہیں کہ قربانی مسلمانوں کا حق ہے اور جو جو جانور حلال اور طیب قرار دے گئے ہیں، انھیں قربان کرنا ان کے اپنے صوابدید پر موقوف ہے۔ کسی ہندو بھائی کو کسی طرح بھی یہ حق حاصل نہیں کہ مسلمان سے قربانی کے معاملے میں متعرض ہو۔ ہم جانتے ہیں کہ بعض مقامات کے عاقبت نااندیش اور امن ناآشنا ہندوؤں نے بعض مواقع پر مسلمانوں کی اقلیت کو بے حد رنج اور صدمہ پہنچانے کی کوششیں کیں۔

گزشتہ سال بھی اسی طرح کے حوادث رونما ہوئے تھے۔ ہم ان بھائیوں سے انصاف اور امن کے نام پر اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس نوع کے ناگوار واقعات کے اعادہ سے محترز رہیں۔ اکابر ہنود کا فرض ہے کہ وہ ہر اس مقام پر اپنے ذمہ دار اور ذی اثر آدمی بھیج دیں جہاں اس قسم کے تلخ واقعات پیش آ چکے ہیں یا جہاں پر اس طرح کا کوئی اندیشہ کیا جا سکتا ہے۔ کانگریس کمیٹیوں کو خاص طور پر اس معاملے کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ ان کی غفلت اور بے پروائی سے کسی مقام پر حالات نازک اور رنجیدہ صورت اختیار کر لیں۔

مسلمانوں سے اپیل

مسلمان بھائیوں سے ہماری اپیل ہے کہ وہ اپنے صوابدید کے

مطابق قربانیاں کریں۔ مگر اس امر کا خیال رکھیں کہ ان کا کوئی فعل ہندوؤں کے لیے خواہ مخواہ باعث رنج و اذیت نہ بنے . . . .

حکومت توجہ کرے

سب سے آخر میں ہم حکومت سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اسے ہر مقام پر جہاں ہندوؤں کی کثرت ہے اور مسلمان کم ہیں یا ہندو طاقتور ہیں اور مسلمان کمزور، ہر قسم کی احتیاطی تدابیر عمل میں لانی چاہئیں ، تاکہ کسی جماعت یا گروہ کی عاقبت نا اندیشی صورت حال کو ناگوار نہ بنا سکے ۔ اگر حکومت نے تمام مخدوش مقامات میں پہلے ہی قیام امن کے پورے انتظامات کر لیے تو ہمیں یقین ہے کہ کسی مقام پر بھی فتنہ و فساد کی آگ نہیں بھڑک سکے گی ۔ ۔ ۔'' (انقلاب ۱۹ مئی ۱۹۲۹ء)

۲۰ - ۲ مارچ ۱۹۲۹ء کے شمارے میں مولانا نے

''تعلیمی کمیٹی کی سفارشات
ہندوؤں کی انصاف سوزی کا نیا مظاہرہ''

کے زیر عنوان نصف صفحے کا اداریہ لکھا ہے ۔ اس کا آغاز وہ یوں کرتے ہیں :

''سائمن کمشن کی تعلیمی کمیٹی (ہارٹوگ کمیٹی) کی جو سفارشات ہندوستان ٹائمز کے نامہ نگار سیاسی نے بے نقاب کی ہیں ان کا خلاصہ اس اشاعت کے کسی دوسرے حصے میں درج ہے ۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ کس حد تک صحیح ہیں ۔ لیکن اگر صحیح ہیں تو ہمیں یہ ظاہر کر دینے میں ایک لمحے کے لیے تامل نہیں کہ مسلمانوں اور دوسری پسماندہ قوموں اور جماعتوں کی تباہ حالی جس انصاف اور جس قیام توازن کی محتاج تھی اس کمیٹی نے قطعاً اطمینان بخش انتظام نہیں کیا ۔ سفارشات میں جا بجا پس ماندہ

اقوام کا ذکر ہے اور ان کی حوصلہ افزائی کی ضرورت کا احساس بھی موجود نظر آتا ہے ۔ لیکن ہارٹوگ کمیٹی کے سامنے اب تک مسلمانوں کی طرف سے جو یادداشتیں پیش ہو چکی ہیں انہیں مد نظر رکھتے ہوئے قیام توازن کے لیے جو کچھ عمل میں آنا ضروری تھا اس کا مناسب بندوبست نہیں کیا گیا ۔''

اس کے بعد اسی مسئلے پر 'اہم تعلیمی یادداشتیں'، 'ہندوؤں کا جنون' 'نا انصافی' 'پنجاب کے الم انگیز حقائق'، 'ہندوستان ٹائمز کا غوغا' کے زیر عنوان مسئلے کے تمام پہلوؤں پر شرح و بسط کے ساتھ بحث کی گئی ہے ۔

۷ ۔ ''کیا فلسطین میں یہود نوازی جاری رہے گی ؟

برطانوی نو آبادیوں کے وزیر کا فتنہ پرور اعلان

برطانوی نوآبادیوں کے وزیر نے یہودیوں کے ایک وفد سے صاف اور غیر مشتبہ طور پر کہہ دیا ہے کہ حکومت برطانیہ کے سامنے فلسطین کی حکم داری یا اعلان بالفور کے ترک کا قطعاً کوئی سوال نہیں ۔ گویا حکم داری بدستور قائم رہے گی ، اور اعلان بالفور کے ماتحت صیہونیت کی جو تحریک شروع ہے اس پر قطعاً کوئی اثر نہیں پڑے گا ۔ اور جس طرح اب تک یہودیوں پر خاص نوازشیں جاری ہیں اسی طرح آئندہ بھی جاری رہیں گی ۔ اور جس طرح اب تک عربوں کے حقوق مٹتے رہے ہیں اسی طرح آئندہ بھی مٹتے رہیں گے ۔ ۔ ۔''

(انقلاب ۹ ستمبر ۱۹۲۹)

اس کے بعد اس ادارے میں مسئلہ فلسطین کا مدلل حل بیان کیا گیا ہے ۔

خصوصیات

۱ - وسعت معلومات

مولانا غلام رسول مہر کے تبحرعلمی کے باعث ان کے اداریوں میں معلومات کے انبار ملتے ہیں - ہر مسئلے کے ہر پہلو اور ہر پہلو کی جزیات تک ان کی نظر کے سامنے ہوتی ہیں - اپنی ان معلومات کو وہ استدلالی حربے کے طور پر اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو ان کے ساتھ اتفاق کرنا ہی پڑتا ہے - ان کے اداریوں کی اس خصوصیت کے پیش نظر ہی 'بہ قول شورش کاشمیری' سید عطاءاللہ شاہ بخاری کہا کرتے تھے : ''مہر صاحب کے افتتاحیے ایک دفعہ دماغ کو فتح کر لیں تو پھر ان کے کاٹے کا کوئی علاج نہیں[۴]'' ان کے اداریوں میں وسعت معلومات کا ثبوت احمد ندیم قاسمی کے ان الفاظ سے بھی ملتا ہے :

''علم و فن کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس پر مولانا مہر پوری طرح حاوی نہ ہوں - اسلامی تاریخ ، برصغیر کی تاریخ ، دور غلامی میں آزادی کی مختلف تحریکوں کی تاریخ ، قیام پاکستان سے پہلے کی ربع صدی کی سیاسیات کی تاریخ ، اردو ادب ، فارسی ادب ، ان سب موضوعات پر مولانا سے گفتگو کیجیے تو معلومات کا دریا ہے جو رواں ہو جاتا ہے[۵]'' ---یہ تبحر علمی ان کے اداریوں میں بھی موجود ہے -

۲ - بر موقع و بر محل

مولانا کا ذہن رسا فوراً مسائل کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے اور اداریے کے لیے ہمیشہ صحیح موضوع کا انتخاب کرتے ہیں - چنانچہ ان کے اداریے حالات سے ہم آہنگ ، اور ہمیشہ ان مسائل پر ہوتے تھے جو واقعی اہم اور دور رس ہوتے تھے - ان کے اداریوں کے برمحل اور حالات کے تقاضوں کے مطابق ہونے کی وجہ ان کی

عصری سیاسیات پر گہری نظر اور تاریخ سے مکمل واقفیت ہے۔ آپ کے اداریوں کے انہی اوصاف کے پیش نظر آپ کو مولانا محمد علی جوہر کی طرف سے 'ہمدرد' کی ادارت سنبھالنے کی دعوت دی گئی تھی[6] اور مولانا ابوالکلام آزاد نے ان کو لکھا تھا کہ ''اخبار خلافت'' روزانہ جو مرکزی خلافت کمیٹی کی جانب سے بمبئی میں جاری ہوا، آج کل سخت بدنظمی کی حالت میں ہے ---- میں چاہتا ہوں کہ آپ بالفعل اس کی ایڈیٹری کا چارج لے لیں[7]''

۳ - صحت

واقعات کی صحت کے اعتبار سے بھی ان کے اداریے بلند حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ کسی موضوع پر لکھنے سے پہلے ہر پہلو کی چھان بین کرتے، پوری تحقیق کے بعد معلومات جمع کرتے اور اس طرح اداریوں میں واقعات کا صحیح پس منظر پیش کرتے اور حالات کا ٹھیک ٹھیک تجزیہ کرتے ہیں۔

۴ - منطق

مولانا مہر کے اداریے سادہ اور منطقی ہونے کے باوجود مؤثر ہیں - اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ صرف وہی بات لکھتے جس پر ان کو یقین ہوتا۔ چنانچہ خلوص کے ساتھ کہی ہوئی بات ہمیشہ مؤثر ہوتی ہے، خواہ وہ کسی بھی انداز میں کہی جائے۔ گویا :

''یہ کہنا شاید بے محل نہ ہو کہ استدلالی انداز تحریر میں مہر صاحب کا سا اداریہ نگار ہم نے اب تک نہیں دیکھا۔ معلومات کی وسعت اور اس پر استدلال کی قوت مہر صاحب کے اداریوں کو فن اور آرٹ کا درجہ دے دیتی ہے۔''

(روزنامہ ''پیام وطن'' دہلی سالگرہ نمبر، ۱۲ دسمبر ۱۹۵۵ء)

۵ - دعوت

جس دور میں مولانا مہر نے اداریہ نگاری کی وہ بامقصد صحافت کا دور تھا ؛ یعنی ہر اخبار کے سامنے ایک مشن ہوتا تھا ۔ نظری اعتبار سے اب بھی صحافت کے مقاصد وہی ہیں جو اس دور میں تھے لیکن اس دور میں مشنری جذبہ کا غلبہ تھا اور 'دعوت' کا طریقہ عام تھا۔ مولانا مہر اپنے دور کے اس طریقے کی بنا پر نہیں بلکہ ضرورتاً کبھی کبھی اداریوں میں داعیانہ انداز بھی اختیار کر لیتے تھے مثلاً :

" ۔ ۔ ۔ کیا کبھی مسلمانوں نے سوچا ہے کہ وہ اس ملک میں اتنے کمزور ، اتنے ذلیل ، اتنے رسوا کیوں ہیں ؟ ان کی اس ذلت و رسوائی کا راز یہ ہے کہ ان میں اتحاد نہیں ۔ ان کی طاقتوں میں تنظیم نہیں ۔ آؤ ، ایک دفعہ فیصلہ کرلو کہ تمھیں اس دنیا میں عزت و اقتدار کے ساتھ رہنا ہے ، اور یاد رکھو کہ عزت و اقتدار کی نعمت صرف اس قوم کو ملتی ہے جو متحد و منظم ہو ۔ آپس میں بھی لڑو اور دشمن پر بھی فتح پاؤ ، یہ دنیا میں نہ آج تک کبھی ہوا ہے اور نہ ہو گا ۔ تم بہت آزما چکے ہو جی چاہے تو اور آزما دیکھو ۔ ۔ ۔ الخ "

(انقلاب ۱۲ جولائی ۱۹۳۵ء)

۶ - اشعار کا استعمال

مولانا ظفر علی خاں اور مولانا ابوالکلام آزاد اپنے اداریوں میں حسب موقع عربی ، فارسی اور اردو اشعار استعمال کرتے تھے ۔ مولانا غلام رسول مہر نے بھی ابتدائی دور میں اپنے اداریوں میں کہیں کہیں حسب موقع اشعار استعمال کیے ، لیکن بعد میں اشعار کا استعمال ترک کر دیا اور شاذ و نادر ہی کوئی شعر استعمال کیا۔ ابتدائی دور میں زمیندار کی ضمانت ضبط ہونے پر انھوں نے

۷ فروری ۱۹۲۲ء کو زمیندار میں اپنے اداریے میں اس شعر کو عنوان بنایا ہے

اے پدر گر قیامت را برآری سر ز خاک
سر برآور ایں قیامت درمیان خلق بیں

اسی طرح ۲۰ فروری ۱۹۲۲ء کو انھوں نے قانون کی خلاف ورزی کے التوا کے مسئلے پر جو اداریہ لکھا اس پر یہ شعر لکھا ہے

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

اسلوب

جس وقت مولانا مہر نے اداریہ نگاری شروع کی ، اس وقت جذباتیت اور ادبیت سے بھرپور اداریہ نگاری کمال کو پہنچی ہوئی تھی - انھوں نے اس فضا کا اثر قبول کیا - چنانچہ ان کے ابتدائی اداریوں میں جذبے کا عنصر زیادہ ہے اور اسلوب تحریر پر مولانا ابوالکلام آزاد کا اثر رہے - مثلاً :

''ہم کس طرح اپنے دل کے خونچکاں ٹکڑوں کو دنیا کے سامنے رکھ دیں کہ ایک ایک آنکھ میں اشک ہائے غم کے دریا موجزن ہو جائیں - ہم کس طرح اپنے زخم ہائے جگر کے ٹانکے کھول دیں کہ ایک ایک قلب جذبات درد و الم کے طوفان سے معمور ہو جائے - ہم کس طرح اپنے سینے کو چیر کر اس کے داغوں کی قیامت خیز بہار کو وقف تماشا کر دیں کہ ایک ایک زبان آہ و فغاں کی شورشوں کا محشرستان بن جائے - آہ! کہاں ہیں وہ آنکھیں جو کاروان اسلام کی مصیبتوں پر خونتابہ فشانی کرنے کی دعویدار ہیں ؟ کہاں ہیں وہ قلب جو قافلۂ حق و صداقت کے

مٹنے پر تڑپنے اور لوٹنے کے لیے مضطرب ہیں ، اور کہاں ہیں وہ زبانیں جو حریت و آزادی کے حسن کی آرائش و زیبائش چھن جانے پر اپنے نالہ و شیون سے عرش کے کنگروں کو ہلا دینا چاہتی ہیں کہ جبر و تشدد کی طاغیت نے قیامت برپا کر دی ، ظلم و جور کے شیطانوں کی زنجیریں اتار دی گئیں ۔ غضب و دشنام کا جہنم بھڑک اٹھا اور ستم و تعدی کا سمندر تلاطم پر اتر آیا ۔ ۔ ۔ الخ''

(زمیندار ۷ فروری ۱۹۲۲ع)

لیکن رفتہ رفتہ ان کے اداریوں میں عقلیت ، منطق اور استدلال کے عناصر زیادہ ہوتے گئے اور آپ کے اسلوب میں بھی تبدیلی آ گئی ۔ ان کی تحریر سلیس ہو گئی ۔ ایک ہی خیال ، احساس یا جذبے کی تکرار کا انداز ختم ہو گیا اور مفہوم کی ادائیگی میں تسلسل و ربط پیدا ہوگیا ۔ اس سلسلے میں ذیل میں تین مختلف ادوار کے اداریوں کے اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں ۔

۱ - ''اب ہر اس شخص پر جس نے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ بینائی اور بصیرت کے ساتھ کافر نعمتی کا مصمم ارادہ نہ کر لیا ہو ، پھر آشکارا ہو چکا ہے کہ ملک و قوم سے غداری کے مجرم مسلمان نہیں بلکہ ہندو ہیں جنھوں نے ملت اسلامیہ کی سیاسی ہستی کو فنا کر کے ہندوستان میں غیر ممزوج ہندو راج قائم کرنے کی حرص میں اس بد نصیب سرزمین کو آزادی کی دولت سے محروم رکھنے کے تمام سامان جمع کر دیے ہیں اور تہیہ کر لیا ہے کہ یا تو ہندوستان میں خالص ہندو راج قائم ہو گا یا ملک ہمیشہ اغیار کا غلام رہے گا ۔ ۔ ۔ الخ''

(انقلاب ۱۲ ستمبر ۱۹۳۱ع)

اس دور کے اداریے خاصے عام فہم ہیں مگر کہیں کہیں مشکل الفاظ استعمال ہوئے ہیں ، اور طویل جملے لکھنے کا

رجحان موجود ہے۔

۲۔ ''سب سے بڑھ کر مسرت اس بات پر ہے کہ یہ اتحاد ایک مفید، ضروری، قابل عمل، ہمہ گیر، تعمیری اور اصلاحی پروگرام پر مبنی ہے جو صوبے کے تمام طبقات کی جائز ضروریات پر حاوی ہے۔ یہ پروگرام پسماندہ، ضرورتمند اور مصیبت زدہ طبقات کے لیے بے حد نفع بخش اور فائدہ رساں ہونے کے علاوہ کسی آگے بڑھتے ہوئے اور ترقی پاتے ہوئے طبقے کے جائز حقوق سے متعارض نہیں ہے ۔۔۔ الخ''

(انقلاب ۷ اپریل ۱۹۳۶ء)

اس دور میں زبان مزید سلیس ہو گئی ہے مگر طویل جملے لکھنے کا رجحان موجود ہے۔

۳۔ ''ان خبروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالباً پنجاب و بنگال کی تقسیم کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ لیکن ہمیں اب تک یقین نہیں آتا کہ لیگ پنجاب و بنگال کی تقسیم قبول کر لے گی۔ اس لیے کہ یہ پاکستان کے اس تصور کی کھلی ہوئی تخریب ہے جس پر ۱۹۴۰ء کی قرارداد لیگ مبنی تھی۔ اور مسلمانوں کی سیاست پر یہ سب سے بڑی ضرب ہوگی۔ ہم اس سلسلے میں مزید تبصرے کو فی الحال ملتوی کرتے ہیں، لیکن اتنا ضرور کہہ دینا چاہتے ہیں کہ پنجاب و بنگال کی تقسیم مسلمانوں کو کسی حالت میں قبول نہیں کرنی چاہیے۔ اور ہمیں اب تک یہ امید ہے کہ لیگ ہائی کمان کے افراد اس مصیبت عظمیٰ سے ملت اسلامیہ کو بچانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں گے ۔۔۔ الخ''

(انقلاب ۴ جون ۱۹۴۷ء)

یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ مولانا مہر نے ستائیس سال تک تسلسل اور تواتر کے ساتھ اداریے لکھنے کا

ایک ریکارڈ قائم کیا؛ اگرچہ بعض نامور صحافی بعض حیثیتوں سے میدان صحافت پر زیادہ عرصے تک چھائے رہے؛ مثلاً سر سید احمد خاں تیس بتیس سال تک صحافت سے وابستہ رہے، اور مولانا ظفر علی خاں بھی نصف صدی تک صحافت کے میدان میں گرجتے برستے رہے۔ لیکن یہ بزرگ اپنی دوسری سیاسی اور قومی مصروفیتوں کے باعث مسلسل اداریے نہ لکھ سکے۔ اس کے برعکس مولانا مہر نے بیرون ملک سفر کے چند وقفوں کے سوا، تسلسل اور تواتر کے ساتھ اداریے لکھے اور اگر ان کے تمام اداریے یکجا کر لیے جائیں تو بیسیوں ضخیم جلدیں مرتب ہو سکتی ہیں۔ چونکہ مولانا واقعات کی مکمل چھان بین کرنے کے بعد حقائق، اعداد و شمار اور دلائل کے ساتھ اداریے لکھتے تھے، اس لیے ان کے اداریے مستند تاریخ کے اوراق قرار دیے جا سکتے ہیں۔ مولانا غلام رسول مہر کے ہم عصر صحافیوں میں سے کسی اور کے اداریوں کو یہ اعزاز حاصل نہیں، اگرچہ چند دوسری حیثیتوں سے ان کے بعض ہم عصروں کے اداریے زیادہ قابل قدر ہی کیوں نہ ہوں۔

غرض! ''ہندوستان اور پاکستان کے اخبار نویسوں میں وہ کامیاب ترین افتتاحیہ نگار ہیں۔ ان کا استدلال نہایت مضبوط ہوتا ہے اور مطالعہ بہت گہرا ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ وہ محض اخبار پڑھ کر اخبار نویس نہیں بنے بلکہ سیاست کے صحیح پس منظر سے واقف ہیں اور بہت سے سیاسی واقعات کی ترتیب میں ان کا حصہ رہا ہے[۸]۔''

حوالہ جات

۱۔ سالک، عبدالمجید: سرگزشت، لاہور ۱۹۶۶ع

۲۔ روزنامہ احسان اشاعت مورخہ ۸ ستمبر ۱۹۵۳ع مقالہ میاں محمد شفیع ایم۔ اے۔

۳ - مولوی محمد امین زبیری : جدید اردو نثر ، مقالہ ''سرسید کا اثر اردو ادبیات پر'' از ڈاکٹر سید محمد عبداللہ ، ص ۱۶۳ -

۴ - شورش کاشمیری : ''چہرے'' ص ۱۸۷ -

۵ - روزنامہ جنگ - اشاعت ۱۴ مئی ۱۹۶۷ء مضمون احمد ندیم قاسمی -

۶ - بحوالہ خط محمد عرفان - نقوش ، مکاتیب نمبر -

۷ - نقش آزاد ص ۵ -

۸ - نئی دنیا - دہلی ، سالگرہ نمبر ، بحوالہ نقوش - شخصیات نمبر -

حمید نظامی کی اداریہ نگاری

''...میں نے اپنی زندگی کے بہترین سال تحریک پاکستان کی خدمت میں بسر کیے ہیں ، اور جہاں تک اس سلسلے میں ''نوائے وقت'' کی خدمات کا تعلق ہے ، بعض ایسے بزرگوں کی خدمات کو جو وزیران باتدبیر میں شامل ہیں ، ہزار سے بھی ضرب دی جائے تو پلڑا نوائے وقت ہی کا بھاری رہے گا ۔ میں پاکستان سے وفاداری کا سبق لینے کے لیے کسی وزیر کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے سے انکار کرتا ہوں ۔ نہ میں کسی وزیر کو آسمانی مخلوق ماننے کے لیے تیار ہوں ۔ میرا عقیدہ ہے کہ اگر اخبار نویس ایماندار ہے تو وہ قوم کی نظروں میں کسی وزیر سے فروتر نہیں ۔

''پاکستان سے وفاداری اور محبت ہی کا تقاضا ہے جو ہمیں اس پر مجبور کر رہا ہے کہ ہم ارباب اختیار کی ناراضگی کا خطرہ مول لے کر حکومت پر نکتہ چینی کے حق سے دستبردار ہونے سے انکاری ہیں ؛ ورنہ نام نہاد عزت دوسری طرف ہے ، دولت دوسری ہے ، آرام دوسری طرف ہے ۔ ہم 'پھولوں' کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے اور صرف کانٹے چننے پر مصر ہیں تو صرف اس لیے کہ ہمارا ایمان ہے کہ پاکستان کی بہتری اسی میں ہے کہ اس ملک کے اخبار آزاد رہیں ۔ . . . اگر آپ کسی مسئلے کے بارے میں ہمیں یقین دلا دیں کہ ہم غلطی پر ہیں تو ہمیں

اصلاح احوال اور تلافی مافات میں کوئی عذر نہ ہو گا ۔ مگر کسی لالچ ، ترغیب یا تعریص کے ذریعے آپ مجھے اس پر مجبور نہیں کر سکتے کہ میں اپنی رائے بدلوں ۔ میں قلم کی عصمت کو ماں ، بہن کی عصمت سے کم مقدس نہیں سمجھتا ۔ میں پھانسی پر لٹک جانے کو اس کا سودا کرنے پر ترجیح دوں گا ۔ ۔ ۔ الخ‘‘

یہ اقتباس حمید نظامی مرحوم کے اس اداریے کا ہے جو انہوں نے ۹ جون ۱۹۵۰ء کے ’نوائے وقت‘ میں اس وقت کے وزیر اطلاعات کے نام ’مکتوب مفتوح‘ کی صورت میں لکھا تھا اور اس سے ان کے نظریہ‘ صحافت ، ان کے خیالات بطور صحافی و اداریہ نویس ، ان کی حیثیت اور اسلوب کی ایک واضح تصویر سامنے آ جاتی ہے ۔

حمید نظامی مرحوم نوائے وقت کے اجرا سے پہلے اسلامیہ کالج لاہور کے رسالہ ’کریسنٹ‘ کے مدیر اور ایک ادبی و سیاسی ماہنامہ ’ساربان‘ کے نائب مدیر رہ چکے تھے ۔ اس کے علاوہ ان کے بعض مضامین اور تراجم ’ہمایوں‘ اور دوسرے جرائد میں بھی شائع ہو چکے تھے ۔ ۱۹۴۰ء میں ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا میں تین ماہ تربیت حاصل کی جس کے بعد لاہور میں اورینٹ پریس آف انڈیا کے ناظم مقرر ہوئے ۔ ڈاکٹر مبشر حسن ، ڈاکٹر محمد باقر ، میاں محمد شفیع (م ، ش) اور محمد اسلم صدیقی کے ساتھ مل کر انہوں نے ۲۹ مارچ ۱۹۴۰ء کو پندرہ روزہ ’’نوائے وقت‘‘ جاری کیا ۔

پندرہ روزہ نوائے وقت کا اجرا دو مقاصد کے تحت ہوا تھا ۔ اردو کی ترویج اور علامہ اقبال کے پیغام کی اشاعت ، لیکن ڈاکٹر محمد باقر کے الفاظ میں :

’’مرحوم حمید نظامی کے قلم کی گیرائی کا یہ عالم تھا (اور وہ صرف سیاسی موضوعات پر لکھتے تھے) کہ کم از کم

حمید نظامی

دو مرتبہ کلکتے کے مشہور اخبار سٹیٹسمین نے اس کالم کا انگریزی میں ترجمہ کر کے اسے شائع کیا ۱ ۔''

حمید نظامی کا یہ کالم ''لیل و نہار'' کے عنوان سے چھپتا تھا ۔ قائد اعظم نے انھیں مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی میں لینے کی خواہش ظاہر کی ، لیکن انھوں نے ادب کے ساتھ معذرت کر لی اور صرف صحافت کے میدان میں کام کرنا پسند کیا ۔ ۱۵ نومبر ۱۹۴۲ع کو نوائے وقت ہفت روزہ ہو گیا اور مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے لیے زیادہ سرگرمی سے کام کرنے لگا ۔ مسلم لیگ نے پنجاب میں ایک روزنامے کی ضرورت محسوس کی تو حمید نظامی نے شیخ حامد محمود صاحب کے اشتراک سے ۲۲ جولائی ۱۹۴۴ع کو اس اخبار کو روزنامہ بنا دیا ۔ ۹ مارچ ۱۹۴۶ع کو نوائے وقت سے دو ہزار کی ضمانت طلب کی گئی ، جو جمع کرا دی گئی ۔ پاکستان بننے کے بعد اپریل ۱۹۵۱ع میں دولتانہ وزارت کے عہد میں نوائے وقت کا ڈکلریشن منسوخ کر دیا گیا اور اس کا پریس سربمہر کر دیا گیا ۔ حمید نظامی نے 'جہاد' جاری کر لیا ۔ حکومت کے دباؤ کے تحت کسی پریس میں اس کا چھپنا مشکل ہو گیا تو انھوں نے 'نوائے پاکستان' جاری کیا ۔ آخر ایک سال بعد نوائے وقت پھر شائع ہونے لگا ۔

حمید نظامی کے اداریے

حمید نظامی مرحوم ایڈیٹر ، اداریہ نویس اور صحافی کے فرائض اور اوصاف کے بارے میں واضح نقطہ نظر رکھتے تھے ۔ ان کے نزدیک اچھے صحافی کے پاس ''علم ہونا چاہیے ، ایمانداری ہونی چاہیے ۔ مطلب یہ کہ جس چیز پر لکھنا ہو اس کے متعلق علم اور معلومات ہوں اور پھر ایمانداری سے وہ ان چیزوں پر لکھے ۲ ۔''

حکومت پر تنقید کے ضمن میں ان کا نظریہ تھا کہ :

''حکومت پر تنقید ضرور ہونی چاہیے ، لیکن وہ دیانت پر مبنی ہونی چاہیے اور یہ چیز ہمیشہ مدنظر ہونی چاہیے کہ تنقید سے قوم میں بد دلی اور منفی رجحان پیدا نہ ہو ۔ لوگ تنقید پڑھ کر مایوس نہ ہو جائیں کہ اس ملک کا تو کچھ بن ہی نہیں سکتا ۔ یہ تاثر مرتب نہ ہونا چاہیے ۔ دوسرا یہ کہ تنقید برائے تنقید نہ ہونی چاہیے اور نہ صرف یہ دکھانے کے لیے "کہ ہم نکتہ چینی کر رہے ہیں" ۔''

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے ، نوائے وقت مسلم لیگ کے مقاصد کی تبلیغ اور تحریک پاکستان کو مقبول اور مضبوط بنانے کے لیے روزنامہ بنا تھا اور حمید نظامی اس تحریک میں دل و جان سے شریک تھے ۔ چنانچہ پاکستان بننے تک اخبار کے دوسرے صفحات کی طرح اداراتی صفحہ بھی زیادہ تر اسی مقصد کے

لیے وقف رہا ۔ نظریاتی لحاظ پر حمید نظامی اور ان کے اخبار نے جو کام کیا اور اس سلسلے میں ان کو جو مشکلات برداشت کرنی پڑیں اس کے بارے میں ظہور عالم شہید لکھتے ہیں :

''نوائے وقت نے جب پنجاب میں ہندو کانگرس ، غلط اندیش سکھوں ، نگریز کے پٹھو یونینسٹوں اور سادہ لوح یا گم کردہ راہ نیشنلسٹ مسلمانوں کے خلاف ہمہ گیر جنگ لڑی تو مسلمان آبادی کی باشعور رائے عامہ نے اخبار کی پوری سرپرستی کی . . . . اس عرصے میں حمید نظامی اور حامد محمود کے لیے حکومت نے کئی پریشانیاں بھی پیدا کیں ۔ ایک دفعہ منظور شدہ کوٹا سے زیادہ نیوز پرنٹ استعمال کرنے کے الزام میں دونوں کو گرفتار کر لیا گیا . . . قیام پاکستان تک صوبے کی یونینسٹ وزارت جہاں ایک طرف مقدمے بناتی رہی وہاں اس وزارت کے مقربین نوائے وقت کے لیے ترغیبات کا جال بھی پھیلاتے رہے ۔''

اس سلسلے میں ڈاکٹر عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں کہ :

''میدان میں کوئی ایسا اخبار نہ تھا جو کسی نہ کسی رنگ میں صوبائی وزارت سے متاثر نہ ہو ۔ ایسے میں نوائے وقت وہ اخبار تھا جو اتحاد (Unionist) پارٹی کا پورا مخالف ، نیز صوبائی اور آل انڈیا دونوں دوائر میں آل انڈیا مسلم لیگ کا ترجمان تھا ۔ مسلم لیگ عوامی تحریک بن چکی تھی اور نوائے وقت اس عوامی تحریک کا سب سے بڑا عکاس اور ترجمان تھا ۔ پھر ۱۹۴۶ع کے عام انتخابات آئے ۔ ''شہباز'' نے زمیندارہ لیگ (یونینسٹ پارٹی) کی پوری حمایت کی ۔ ''انقلاب'' نے زمیندارہ لیگ کی نہ حمایت کی نہ مخالفت کی ۔ 'زمیندار' ، 'احسان' اور 'نوائے وقت' نے مسلم لیگ کی پوری تائید کی ، لیکن عوام کو نوائے وقت کی تائید پر زیادہ اعتماد تھا ۔ اس کے بعد پبلک سیفٹی ایکٹ کے خلاف لیگ نے سول نافرمانی شروع کی تو اس میں نوائے وقت پیش پیش تھا ۔ اس لیے نوائے وقت عوام کا محبوب اخبار بن گیا [۵] ۔''

ظہور عالم شہید صاحب ہی نے تحریک پاکستان میں نوائے وقت کے کردار کا ذکر کرتے ہوئے مزید لکھا ہے :

''اگر یہ کہا جائے تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہو گا کہ اس زمانے میں نوائے وقت نہ ہوتا تو مسلمانوں کی تحریک اتنے قلیل عرصے میں انہیں کبھی اپنی منزل مقصود سے ہم کنار نہ کر سکتی [۶] ۔''

اگرچہ حمید نظامی 'انگریزوں' ، 'ہندوؤں' ، 'یونینسٹوں' اور 'نیشنلسٹ' مسلمانوں کے خلاف چومکھی لڑائی لڑتے تھے اور فریقین کے جوش و خروش کی وجہ سے اس دور کی فضا بھی جوش و جذبہ سے معمور تھی ۔ لیکن حمید نظامی نے کبھی اعتدال کا دامن نہ چھوڑا ۔ وہ انتہائی ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ بہت سادہ مگر

منطقی اور مدلل انداز میں لکھتے ۔ جناح ، گاندھی ملاقات نتیجہ خیز ثابت نہ ہونے پر طاقتور ہندو پریس نے قائداعظم کے خلاف ہنگامہ بپا کیا تو حمید نظامی نے ''ہندو مسلم منافرت کی آگ'' کے زیر عنوان اداریے میں لکھا :

گاندھی جناح گفتگو نے مصالحت ناکام رہی ۔ خدا گواہ ہے کہ مسلمانوں کو اس ناکامی پر افسوس ہے اس لیے کہ وہ دل سے اس بات کے خواہاں تھے کہ آپس کا جھگڑا ختم ہو اور ہندو مسلمان مل کر برطانیہ سے اپنی آزادی کا مطالبہ کریں . . . چنانچہ پچھلے ایک ہفتے میں ایک بھی مسلمان لیڈر یا اخبار نے کوئی ایسی بات نہیں کہی یا لکھی جس سے دونوں قوموں کے تعلقات بگڑنے کا احتمال ہو . . . اس کے برعکس ہندو لیڈروں اور اخبارات کا رویہ روز بروز شر انگیز ہوتا جا رہا ہے ۔ اور مسٹر جناح کے خلاف بہتان اور اتہام زیادہ گھناؤنی شکل اختیار کرتے جا رہے ہیں ۔ ہندو اخبارات اب یہ کہہ رہے ہیں کہ جناح آزادی کا دشمن ہے ۔ جناح امپیریلزم کا ایجنٹ ہے ۔ جناح مسلمانوں کا نمائندہ نہیں ۔ ان کی کوشش یہ ہے کہ مولوی فضل حق اور ملک خضر حیات کی قسم کے مسلمانوں کی پیٹھ پر تھپکی دے کر انھیں مسلمانوں کے نمائندوں کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا جائے ۔ اگر یہ اکابر مسلمانوں کی ترجمانی کے اہل ہوتے یا مسلمانوں کی طرف سے ہندوؤں کے ساتھ بات چیت کرنے کے قابل ہوتے تو یہ جھگڑا کبھی کا مٹ چکا ہوتا ۔ کیونکہ انھیں تو ہندوؤں سے کوئی اختلاف نہیں ۔ حصول و تقسیم اختیار و اقتدار میں وہ کانگرس اور ہندوؤں کے ہم نوا و ہم خیال ہیں ۔ ہندوستان کی وحدت کے مسئلے پر ان کی اور کانگرس کی رائے ایک ہے ۔ ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کے مقام و موقف کے متعلق ان میں اور کانگرسیوں میں کوئی اختلاف نہیں ۔ ہندو اخباروں نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت مسلمانوں کے

ساتھ نہیں بلکہ ان اکابر کے ساتھ ہے ...... فی الواقع مسلمانوں کی اکثریت ان لوگوں کے ساتھ ہے تو جھگڑا ہی کیا باقی رہ گیا... مگر ہندو لیڈر اور ہندو اخبارات خوب جانتے ہیں کہ کون کس کا نمائندہ ہے اور مسلمانوں کی ترجمانی اور نمائندگی کا حق دار کون ہے۔ ان کی موجودہ سرگرمیوں کا مقصد صرف مسلمانوں میں اختلاف پیدا کرنا اور انہیں آپس میں لڑانا ہے۔....

''علمائے کرام اور مسلم لیگ

جمیعت العلمائے بنگال نے اپنے سالانہ اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان کی حمایت کی ہے اور مسلمانوں کو ہدایت کی ہے کہ وہ اس ملی نصب العین کے حصول کے لیے مسلم لیگ کی تنظیم میں شامل ہوں اور اسے تقویت پہنچائیں۔ ہندوستان کے علمائے کرام کے متعلق ایک غلط فہمی بہت عام ہے اور وہ یہ کہ ہندوستانی علمائے اسلام پاکستان اور مسلم لیگ کے خلاف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ علمائے اسلام کی غالب اکثریت اس وقت بھی مسلم لیگ کے ساتھ ہے، اور علما میں پاکستان کے مخالف تو شاذ و نادر ہی ہوں گے۔ علمائے کرام کے متعلق یہ بہتان اس لیے عام ہو گیا کہ لیگ کے دشمن پریس نے ان علما کے بیانات اور سرگرمیوں کو بہت زیادہ اہمیت و شہرت دی جو کسی نہ کسی وجہ سے مسلم لیگ کے مخالف ہیں اور مسلم لیگ کے حامی و مؤید علما کے متعلق ان اخباروں میں کبھی ایک سطر بھی شائع نہیں ہونے پائی... الخ''

(نوائے وقت ۶ اکتوبر ۱۹۴۴ء)

تحریک پاکستان اور برصغیر کی تقسیم کے سلسلے میں 'سکھوں' کا مسئلہ ابھرا تو حمید نظامی نے ''مسئلہ پاکستان اور سکھ'' کے زیر عنوان اداریہ لکھا:

''اکالیوں کا اخبار ''اجیت'' اپنی ۱۸ ستمبر کی اشاعت میں

رقم طراز ہے :

'میں نے پہلے بھی لکھا تھا اور اب پھر دہراتا ہوں کہ مسلمان بھائیوں نے سکھوں کے سلسلے میں جو رویہ اختیار کیا ہے وہ غلط ہے۔ ہمیں یہ ماننے کے لیے مجبور کیا جا رہا ہے کہ ہمارا مسئلہ صرف پنجاب، دوسرے الفاظ میں مسلمانوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے جواب میں ہم یہی کہتے ہیں کہ یہ بھی ایک ٹھوس سچائی ہے کہ مسلمان سکھوں کی رضامندی کے بغیر پاکستان ہرگز حاصل نہیں کر سکتا۔ اسے یہ بھی احساس کرنے پر مجبور ہونا پڑے گا کہ پاکستان کا مسئلہ ہندوؤں سے نہیں بلکہ سیدھا سکھوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے سکھوں سے بات چیت نتیجہ خیز ثابت ہو سکتی ہے۔' تلواروں اور کرپانوں کی نمائش کے دوران میں عقل کی یہ بات نہایت خوش آیند خیال ہے۔

مسلمانوں نے کب کہا ہے کہ وہ ہندوؤں اور سکھوں کی مرضی و رضامندی کے بغیر پاکستان حاصل کر سکتے ہیں۔ پاکستان کا مقصد فرقہ وارانہ مسئلے کا دائمی حل ہے، نہ کہ دائمی سول وار۔ مسلمانوں کا ہرگز یہ منشا نہیں کہ وہ کسی ایک قوم سے بے انصافی کریں یا اپنے قومی اقتدار کے لیے اس کے مفادات کو نظرانداز کر دیں۔ ''یہ بھی ایک ٹھوس سچائی ہے۔'' کا مطلب یہ ہے کہ ''اجیت'' اس امر کا اعتراف کرتا ہے کہ سکھوں کا مسئلہ فی الواقعہ صرف مسلمانوں سے وابستہ ہے اب رہی اس کی مسلمانوں کو یہ دعوت کہ وہ سکھوں سے بات چیت کریں تو مسلمانوں نے اس سے کب انکار کیا ہے؟ اجیت سے بہت قبل خود قائد اعظم نے سکھوں کے ذمہ دار لیڈروں کو اس کی دعوت دی کہ وہ متنازعہ فیہ مسائل کے حل کے لیے ان سے ملیں یا اپنے شکوک و شبہات اور مطالبات انھیں لکھ کر بھیجیں۔ بد قسمتی سے ماسٹر تارا سنگھ نے ان کی پیش کش کو بالکل غلط رنگ میں لیا اور اس کا جواب

نامناسب انداز میں دیا - گیانی کرتار سنگھ جو سکھوں میں نہایت بلند مرتبہ کے مالک ہیں ، ہم سے اس حقیقت کا اعتراف کر چکے ہیں - سیاسی مصلحتیں اجازت نہیں دیتیں کہ اس وقت ان ملاقاتوں کی روئداد یا تفصیل بیان کی جائے جوگیانی جی سکھوں کے نمائندے کی حیثیت سے وقتاً فوقتاً مسٹر جناح سے کرتے رہے - لیکن غالباً گیانی جی بھی اس کی تائید ہی فرمائیں گے کہ وہ جب کبھی کسی مقصد کے لیے مسٹر جناح کے پاس آئے ، مسٹر جناح نے ان کی توقع سے زیادہ پذیرائی کی اور مدد فرمائی - ان حقائق کو جانتے ہوئے بھی خدا جانے سکھ لیڈر کن مصلحتوں کے پیش نظر مسٹر جناح اور مسلم لیگ سے گفت و شنید سے احتراز کر رہے ہیں ، اور پبلک جلسوں میں ایسی تقریریں کر رہے ہیں جن کی تکذیب خود ان کا دل کرتا ہے - ہم سکھ لیڈروں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنی تجاویز واضح شکل میں مسلم لیگ کے سامنے رکھیں ، اور مسلم لیگ کی طرف سے یقین دلاتے ہیں کہ مسلمان ماسٹر تارا سنگھ کے الفاظ میں انہیں اپنے حضور ''عرضی گزارنے'' کے لیے نہیں کہہ رہے بلکہ وہ ایک باعزت قوم کی طرح دوسری باعزت قوم کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں اور یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کن شرائط پر اس دست مؤدت کو قبول کر سکتی ہے -''

(نوائے وقت . ۲ ستمبر ۱۹۴۴ء)

قیام پاکستان سے قبل ان کے بیشتر اداریوں کے مرکز و محور تحریک پاکستان اور 'قائد اعظم' ہی ہوتے تھے - چنانچہ کبھی وہ ''ہندو پریس کا خطرناک کھیل'' کے زیر عنوان ہندوؤں اور ان کے اخبارات کے پراپیگنڈے کا سدباب کرتے ، کبھی ''خالصہ جی ہوشیار!'' کے زیر عنوان اداریہ لکھ کر سکھوں کو ہندوؤں کے عزائم سے آگاہ کرتے - لیکن نہایت مدلل ، متین اور عام فہم انداز میں ضرورت کے وقت صحافتی تقاضوں کے پیش نظر دوسرے اہم

مسائل و امور پر بھی اداریے لکھتے تھے ۔ مثلاً دوسری عالمگیر جنگ کا خاتمہ قریب نظر آنے لگا تو انھوں نے ''جنگ کی پانچویں سالگرہ'' کے عنوان سے ادارتی شذرہ لکھا :

''آج سے پانچ سال پہلے برطانیہ نے جرمنی کے خلاف اعلان کیا اور اسی دن شام کو آل انڈیا ریڈیو سے تقریر کرتے ہوئے لارڈ لنلتھگو نے بھی لرزتی ہوئی آواز میں یہ اعلان کیا کہ ہندوستان جرمنی سے برسرپیکار ہے ۔ ان پانچ سالوں میں تہذیب کے علمبرداروں نے خوب ہی ایک دوسرے کا گلا کاٹا اور چکی کے ان دو پاٹوں میں ''بے تہذیب'' بھی بری طرح پسے ۔ نازی جرمنی طوفان کی طرح پولینڈ سے بڑھتے بڑھتے سارے یورپ پر چھا گیا ۔ اس کے بعد اٹلی اور جاپان نے بھی جوع الارض سے بے تاب ہو کر انسانی خون سے ہاتھ رنگے یکم ستمبر کو جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر دیا ۔ ۱۹ اپریل کو جرمنوں نے پولینڈ پر قبضہ کر لیا ۔ ۱۵ مئی تک ہالینڈ ، بلجیم اور لکسمبرگ جرمنوں کے سامنے ہتھیار ڈال چکے تھے ۔ ۱۷ مئی کو جرمنوں نے فرانس پر حملہ کر دیا اور ۲۹ مئی کو برطانیہ نے بصد مشکل اپنی ⅓ فوج کو ڈنکرک سے نکالا اور ۲۲ جون کو فرانس نے ہتھیار ڈال دیے ۔ ۱۷ اپریل ۱۹۴۳ع کو یوگو سلاویہ پر جرمنی کا قبضہ ہوگیا اور یکم جون کو یونان بھی پوری طرح ان کے زیر تسلط تھا ۔ جون ۱۹۴۱ع تک تو یہی حال تھا کہ کوئی طاقت فسطائی سیلاب کو نہ روک سکے گی ۔ لیکن روس کی سرخ فوج نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا اور اب پانچ سال بعد پانسہ بالکل پلٹ چکا ہے ۔ اٹلی ختم ہو چکا ہے اور روم اتحادی فوجوں کے قبضے میں ہے ۔ پولینڈ ، بلغاریہ ، رومانیہ ، فسطائی کیمپ سے نکل چکے ہیں اور دوسری بلقانی ریاستیں بھی اس رستے پر چلنے والی ہیں۔ بلجیئم کی جنگ ختم ہو کر عنقریب جنگ خود جرمنی کی سرحد میں داخل ہو جائے گی ۔ یورپ کی

جنگ کے متعلق اب وثوق کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دسمبر تک ختم ہو جائے گی ، اور مشرق بعید میں جاپان میں اب اتنی سکت نہیں رہی کہ وہ اٹلی اور جرمنی کی شکست کے بعد زیادہ دیر تک جنگ جاری رکھ سکے ۔ جنگ جیتنے کے بعد اتحادیوں کی ذمہ داری اور بڑھ جائے گی ؛ حالات یہی کہتے ہیں ۔ امن کا جیتنا جنگ جیتنے سے زیادہ ضروری اور زیادہ مشکل ہے ۔ اگر اتحادی اس میں ناکام رہے تو بیس سال بعد دنیا کو ایک تیسری عالمگیر جنگ لڑنی پڑے گی ۔''

(نوائے وقت ۵ ستمبر ۱۹۴۴ع)

اگرچہ حمید نظامی نے اردو اداریے کو مختصر اور جامع بنانے کی روایت قائم کی ، مگر 'مختصر نویسی' ان کے نزدیک حتمی اصول نہیں تھا ۔ اہم اور سنگین مسئلہ درپیش ہونے کی صورت میں وہ طویل اداریے بھی لکھتے تھے ۔ مثلاً قیام پاکستان کے بعد بھارت میں جو خونریزی ہوئی اس پر انہوں نے مندرجہ ذیل اداریہ لکھا ۔ یہ اداریہ انتہائی 'جذباتی' فضا میں لکھا گیا تھا ، مگر 'اعتدال' اور توازن کے عناصر اس میں بدستور موجود ہیں :

''امرت سر سے سبق

۱۱ اگست کو لاہور کی فرقہ وارانہ حالت خراب ہو گئی اور پریس کے بند ہو جانے کی وجہ سے ہم پانچ دن اخبار شائع نہ کر سکے ۔ اس مختصر وقفے میں ملک میں بہت سے اہم واقعات رونما ہوئے ۔ پنجاب میں لیگ وزارت قائم ہو گئی ۔ ہندوستان آزاد ہو گیا اور پاکستان کی آزاد و خود مختار، سلطنت، جو صرف چند ماہ پہلے شاعر کا خواب سمجھی جاتی تھی ، معرض وجود میں آ گئی ۔ مگر ہمارے نزدیک ان سب واقعات سے زیادہ اہم اور توجہ طلب سانحہ امرتسر کی تباہی ہے ۔ پنجاب میں مسلمانوں کے اس دوسرے سب سے بڑے

شہر میں یہ قتل عظیم اس ہفتے کا ہی نہیں ، پنجاب کی تاریخ میں سکھا شاہی کے بعد پوری ایک صدی کا سب سے الم ناک واقعہ ہے ۔ امرت سر پر جو قیامت گزر گئی ہے اس کی تفاصیل اخبارات میں شائع نہیں ہو سکیں ۔ خبررساں ایجنسیوں اور آل انڈیا ریڈیو نے اس معاملے میں افسوسناک بد دیانتی سے کام لیا ۔ جو خبریں دوسرے ذرائع سے لاہور میں پہنچیں وہ سنسر کی پابندیوں کے باعث شائع نہیں ہو سکیں ۔ اس کے برعکس لاہور میں جو ہنگامہ ہوا باوجودیکہ وہ امرت سر کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا تھا ، خبررساں ایجنسیوں اور آل انڈیا ریڈیو نے اس کی خوب تشہیر کی اور اخبارات نے بھی اسے زیب عنوان بنایا ۔

ہمیں احساس ہے کہ سنسر کی پابندیاں ابھی تک قائم ہیں ۔ یہ پابندیاں نہ بھی ہوتیں تو ہمیں یہ احساس ہی کافی تھا کہ فرقہ وارانہ فضا بے حد مخدوش ہے اور ہمارے قلم سے ایک لفظ بھی ایسا نہیں نکلنا چاہیے جو اشتعال کا باعث بن کر جلتی پر تیل کا کام دے ۔ لیکن ان احساسات کے علاوہ ہمیں اپنی اس ذمہ داری کا بھی احساس ہے جو قوم کی طرف سے ہم پر عائد ہوتی ہے ۔

اگر ہم امرت سر کے معاملے میں اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہ ہوں گے تو قوم کے بدترین مجرم ہوں گے ۔ امرت سر سے متعلق قوم کو اندھیرے میں رکھنا اسے دھوکا دینے کے مترادف ہے ۔ رونگٹے کھڑے کر دینے والی تفصیلات کو نظرانداز کرتے ہوئے امرت سر کے متعلق یہ کہنا ناگزیر ہے کہ اس شہر میں بے گناہ مرد ، عورتوں اور بچوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کیا گیا ۔ امرتسر کے غیور مجاہد گزشتہ چھ ماہ سے حیرت انگیز پامردی اور استقلال کے ساتھ اپنی انفرادی عزت اور قومی آبرو کو بچا رہے تھے ۔ انھوں نے انتہائی نامساعد حالات میں منظم غنڈہ گردی کا مقابلہ کیا اور اسے ناکام بنایا ، مگر یکایک ایسا پانسہ پلٹا کہ وہ

بے بس و مجبور ہو کر رہ گئے اور غنڈوں کے منظم و مسلح گروہوں نے ان پر وہ وحشیانہ مظالم ڈھائے کہ تاریخ میں اس کی چند ہی مثالیں مل سکیں گی ۔ ایک ہندو سپرنٹنڈنٹ پولیس نے مسلمان پولیس سے ہتھیار چھین کر اسے نہتا کر دیا ۔ یہ سگنل تھا غنڈہ عناصر کے لیے کہ اب وہ من مانی کارروائی کر سکتے ہیں ۔ غنڈوں کے مسلح گروہ بے بس مظلوموں پر حملہ آور ہوئے ۔ ان کی ہم قوم پولیس اور فوج نے انہیں روکنے کی بجائے ان کی حوصلہ افزائی کی ۔ مجروحین اول تو ہسپتال ہی نہ پہنچ سکے اور اگر پہنچے تو کوئی ان کی مرہم پٹی کے لیے بھی آمادہ نہ تھا ۔ غنڈوں کے ہم قوم اور ہم مذہب ڈاکٹروں اور کمپونڈروں نے طبابت کے معزز پیشے کے اخلاق کی دھجیاں اڑاتے ہوئے اپنی بے توجہی سے ان مظلوموں کو مار ڈالا ۔ امرتسر کے وہ غیرت مند جو مسلسل چھ ماہ تک غنڈہ گردی کی قوتوں کو قدم قدم پر شکست دیتے رہے تھے جب چاروں طرف سے اس طرح گھر گئے تو ہجرت اور فرار کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ نہ رہا ۔ وہ اپنی عمر بھر کا اثاثہ وہیں چھوڑ کر صرف اپنی جان بچا کر امرتسر سے نکلے ۔ مگر اکثر بے گناہوں کو اسی کوشش میں شہید کر دیا گیا ۔ امرتسر میں مسلمانوں کی آبادی پونے دو لاکھ تھی ۔ شریف پورہ کی نواحی بستی کے علاوہ اس وقت تک سارا امرتسر مسلمانوں سے خالی ہو چکا ہے اور جب تک یہ اخبار آپ کے ہاتھوں میں پہنچے گا شریف پورہ پر کیا بیت چکی ہوگی اس کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے ۔

امرتسر کا یہ المناک سانحہ مسلمان قوم اور مسلمان لیڈروں کے لیے ایک انتباہ ہے ۔ امرتسر کے مسلمان تھوڑے تھے کمزور نہیں تھے ۔ ان کی جمعیت کافی مضبوط و منظم تھی ۔ ہمت اور بہادری میں وہ مسلمانان پنجاب کا سرمایۂ ناز تھے مگر اس کے باوجود وہ ایک ہفتے کے اندر برباد کر دیے گئے ۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی

کہ سرکاری مشینری پر غیر مسلمانوں کا مکمل قبضہ ہو گیا تھا۔ امرتسری مسلمان بے سر و سامانی کی حالت میں پیٹ پر پتھر باندھ کر غنڈوں کا مقابلہ کر سکتے تھے اور وہ کرتے رہے، مگر جب پوری سرکاری مشینری فوج اور پولیس سمیت غنڈوں کی پشت پر ہو تو مسلمانوں کے لیے اس کا مقابلہ ناممکن تھا۔ 'امرتسر' مسلمانوں کے لیے وارننگ ہے۔ اگر اب بھی ان کی آنکھیں نہ کھلیں تو امرتسر کی تاریخ جالندھر، ہوشیارپور، لدھیانہ اور لاہور میں بھی دہرائی جا سکتی ہے۔ جالندھر اور ہوشیار پور سے جو رپورٹیں آ رہی ہیں وہ بےحد تشویشناک ہیں۔ اگر فوری تدابیر اختیار نہ کی گئیں تو ان اضلاع کے مسلمانوں کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ ہمارے لیڈر امن کی اپیلیں کر رہے ہیں ہم ان کی تائید کرتے ہیں۔ ہمارے لیڈر اقلیتوں کی حفاظت کا یقین دلا رہے ہیں ہم ان کے ہم نوا ہیں۔ مگر جب ہمارے لیڈر ماسٹر تارا سنگھ کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انھوں نے امن کے لیے اپیل شائع کی تو ہم ان کی فریب خوردہ ذہنیت کا ماتم کرتے ہیں۔ خطرے کو سامنے دیکھ کر کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرنے سے خطرہ نہیں ٹل جائے گا۔ نہ امن کے لیے کھوکھلی اپیلیں امن قائم کرنے میں مددگار ثابت ہوں گی۔ لیڈروں کو اپنے پیروؤں کے جذبات سمجھنے چاہئیں۔ امرتسر کے مسلمانوں کی رشتہ داریاں سارے پنجاب میں ہیں۔ امرتسر کے پناہ‌گزین لاہور، گوجرانوالہ، وزیر آباد، سیالکوٹ، گجرات اور راولپنڈی ہر جگہ پہنچ رہے ہیں۔ جس مسلمان کا باپ، بھائی یا بہن امرتسر میں غنڈہ گردی کا شکار ہو چکے ہیں اس کا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ امن کی کھوکھلی اپیل اس مسلمان کو متاثر نہیں کر سکتی۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ اس کے لیڈر امن قائم کرنے کے لیے کوئی مؤثر قدم اٹھائیں ورنہ اس کی قیادت سے دستبردار ہو جائیں۔ مسلمان ایک بڑے نازک دور سے گزر رہے ہیں۔

کبوتر قسم کے لیڈر ان کی قیادت کے اہل نہیں ہیں - انہیں فولادی دل اور فولادی بازو رکھنے والے رہنماؤں کی ضرورت ہے -

عوام بعض موجودہ لیڈروں سے بھی بدظن ہو رہے ہیں - جہاں کہیں چار مسلمان جمع ہوتے ہیں وہ لیڈروں کو برا بھلا کہتے ہیں اور ان پر الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے مسلمانوں کو قتل کرا دیا - یہ رجحان بے حد خطرناک ہے اور قوم کے لیے خطرناک ہے - اگر ہمیں کوئی متبادل لیڈر شپ سامنے نظر آتی تو کیوں اندیشہ نہ ہوتا اور ہم عوام کی اس کوشش میں ان کا ساتھ دیتے جو ناکارہ لیڈر شپ کو ہٹا کر اس کی جگہ بہتر لیڈر شپ کو لانے کے لیے کی جاتی - مگر اس وقت بد قسمتی سے ہمیں کوئی متبادل لیڈر شپ نظر نہیں آتی اگر موجودہ لیڈروں کے خلاف عوامی نفرت و بد اعتمادی کا جذبہ اسی طرح بڑھتا رہا تو مسلمانان پنجاب کی سیاست میں خطرناک انار کی پیدا ہو جائے گی - موجودہ لیڈر شپ نے عوام کے جذبات کو پہچان کر ان کی تسکین نہ کی تو وہ ختم ہو جائے گی - ہمیں اس صاف گوئی کے لیے معاف فرمایا جائے کہ قائد اعظم کی برکتیں اور دعائیں بھی اس لیڈر شپ کو نہ بچا سکیں گی - چونکہ کوئی نئی لیڈر شپ سردست اس کی جگہ لینے کے لیے موجود نہیں ہے اس لیے موجود، لیڈر شپ کے خاتمے سے جو خلا پیدا ہوگا جب تک وہ پر نہیں ہوگا ، اس وقت تک پنجاب میں سیاسی انارکی رہے گی جس کے نتائج بے حد خطرناک ہوں گے -

لیڈروں کے سامنے سب سے مقدم کام مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کا ہے اور انہیں اس کے لیے ہر ممکن تدبیر اختیار کرنی چاہیے - نہ صرف خان افتخار حسین ڈاکٹر بھارگو اور سردار سورن سنگھ کو غیر مبہم الفاظ میں متنبہ کر دیں کہ انہیں مشرقی پنجاب میں ایک ایک مسلمان کی جان کی قیمت ادا کرنی پڑے گی ، بلکہ قائد اعظم اور مسٹر

لیاقت علی خاں بھی لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور پنڈت نہرو پر زور دیں کہ وہ اپنے ملک میں غنڈہ گردی کو روکنے کے لیے فوری اور مؤثر قدم اٹھائیں ۔ مشرقی پنجاب کے پناہ گزینوں کو از سرنو مغربی پنجاب میں آباد کرنے کی تدابیر اختیار کی جائیں ۔ ہزاروں اشخاص کو زیادہ عرصے تک ریلیف کیمپوں میں نہیں رکھا جا سکتا ۔ انھیں روزگار پر لگایا جائے ۔ مغربی پنجاب کے مسلمان صحیح معنوں میں انصار ہیں اور مشرقی پنجاب کے ان مسلمانوں کو جن کی بدولت انھیں پاکستان ملا ہے اس آڑے وقت میں سہارا دیں اور ان کے دست و بازو بنیں ۔ ہزاروں افراد کو صرف لاہور میں رکھنا ناممکن ہے ، انھیں مختلف اضلاع پر تقسیم کر دیا جائے اور ہر شخص کو اس کی استعداد کے مطابق کام پر لگایا جائے ۔

۲ ۔ مغربی پنجاب میں جو سرکاری زمینیں پڑی ہیں ان کی نیلامی بند کی جائے ۔ اسی طرح زمین انعام میں دینے کا سلسلہ بھی بند کیا جائے ۔ یہ ساری زمینیں مشرقی پنجاب کے مہاجرین کے لیے محفوظ کی جائیں ۔ یونینسٹ وزارت نے جن لوگوں کو قوم فروشی کے صلے میں مربعے انعام میں دیے تھے وہ مربعے ضبط کرکے پنجاب کے مسلمانوں میں تقسیم کیے جائیں ۔

۳ ۔ ریلوے کے دفتروں ، ریلوے کے ورکشاپوں ، اور دوسرے سرکاری دفتروں میں کافی آسامیاں خالی ہیں ؛ یہ آسامیاں مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کے لیے مخصوص کی جائیں ۔

۴ ۔ فوج ابھی تک امن قائم کرنے میں ناکام رہی ہے بلکہ اس نے اپنی شہرت بھی داغدار کر لی ہے ۔ لاہور سے گورکھے اور ڈوگرے فوراً ہٹا لیے جائیں اور صرف لاہور میں ہی نہیں جہاں بھی فوج متعین کی جائے اس میں مسلمان اور غیر مسلم سپاہی اور افسر برابر ہوں ۔ اس کے بغیر عوام میں اعتماد پیدا نہیں ہوگا تو

کم از کم مغربی پنجاب کی حکومت جنرل گریسی سے صاف لفظوں میں کہہ دے کہ ہم آپ کے شکر گزار ہیں لیکن ہمیں آپ کی امداد کی ضرورت نہیں۔

۵۔ حکومت مغربی پنجاب اپنی پولیس کو امن قائم رکھنے کے لیے وسیع اختیارات دے۔ پولیس کے خلاف اہل غرض کی جھوٹی فرقہ وارانہ شکایتوں کی بنا پر اپنی رواداری کے کھوکھلے مظاہرے کے لیے کوئی کارروائی نہ کی جائے جو پولیس میں بد دلی پھیلانے کی موجب ہو۔ پولیس پر کڑا ڈسپلن قائم رکھا جائے مگر اس کے لیے نوکر شاہی کے فرسودہ طریقوں کو استعمال کرنے کی بجائے پولیس کو یہ احساس دلایا جائے کہ وہ بھاڑے کے ٹٹو نہیں بلکہ اپنی سلطنت کے سپاہی ہیں۔

۶۔ حکومت تلوار پر سے پابندی کو فوراً منسوخ کرے اور معزز شہریوں کو دفاعی ہتھیاروں کے لائسنس بھی فراخ دلی سے دیے جائیں۔

۷۔ ہم شروع سے اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی کے مطابق سرکاری افسر مقرر کیے جائیں۔ افسوس کہ ہماری اس گزارش پر توجہ نہ دی گئی۔ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کی تباہی کا سب سے بڑا سبب یہی بے تدبیری ہے کہ پوری سرکاری مشینری ہندوؤں اور سکھوں کے حوالے کر دی گئی۔ اگر ان مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے ہدف ظلم نہیں بنانا ہے تو اب بھی مشرقی پنجاب کی حکومت کے ساتھ مل کر یہ معاہدہ کیا جائے کہ دونوں صوبوں میں دونوں قوموں کی آبادی کے مطابق دونوں قوموں کے سرکاری افسر رکھے جائیں اور دونوں حکومتیں ان سرکاری ملازموں کے حقوق و مفاد کے تحفظ کی ضمانت دیں۔

۸ - امن قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہر بس کے سب طبقوں کا تعاون حاصل کیا جائے ۔ یونینسٹ وزارت اور جنکنز راج کے لعنتی احکام منسوخ کیے جائیں اور تمام اخبارات کی ضمانتیں واپس کر دی جائیں ۔ ہندو اخبارات اس وقت سب سے زیادہ زیر ضمانت ہیں ان کی ضمانتیں واپس کر دی جائیں (غلط فہمی کے ازالے کے لیے یہ لکھنا ضروری ہے کہ 'نوائے وقت' اس وقت زیر ضمانت ہے اور ہماری یہ تجویز ذاتی فائدے کے خیال سے نہیں پیش کی جا رہی ہے) ۔

۹ - سرحدی اضلاع میں سرحد پر جو مسلمان آبادی ہے وہ ہمیشہ خطرے میں رہے گی ۔ بہتر ہوگا کہ مشرقی پنجاب کی حکومت سے مل کر ان اضلاع میں تبادلۂ آبادی کی سکیم کو عملی جامہ پہنایا جائے اور مشرقی پنجاب کے سرحدی دیہات سے مسلمان آبادی کو پاکستان میں منتقل کر دیا جائے ۔

۱۰ - سب سے آخری مگر سب سے ضروری گزارش یہ ہے کہ لیڈر اخباری بیانات پر اکتفا کرنے کی بجائے نہ صرف خود بنفس نفیس عوام تک پہنچیں بلکہ قائد اعظم کو بھی اس دھوکے میں رکھنے کی بجائے کہ 'پنجاب میں سب خیریت ہے' سارے حالات بلا کم و کاست ان کے سامنے رکھیں اور مرکزی لیگ ہائی کمان اور صوبائی لیگ ہائی کمان کے ارکان سے مل کر وہ آزردہ عوام کے پاس جائیں ، ان کی داستان درد سنیں ، ان کے زخموں پر مرہم رکھیں اور انھیں یقین دلائیں کہ ہم ایسی تدابیر اختیار کر رہے ہیں کہ آئندہ کسی علاقے میں مسلمانوں پر ظلم نہیں ہو سکے گا ۔ ہماری یہ گزارشات لیڈروں سے ہیں ؛ مسلمان عوام سے ہماری مؤدبانہ مگر پر زور گزارش یہ ہے کہ وہ لیڈروں کو جو اب ان کے وزیر بھی ہیں کام کرنے کا موقع دیں ۔ مانا کہ یہ اصحاب نا تجربہ کار ہیں ۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ مثالی لیڈر یا مثالی وزیر نہیں ہیں

مگر اپنی خوبیوں اور خامیوں ، معائب و محاسن کے باوجود یہ جو کچھ بھی ہیں آپ کے آدمی ہیں - آپ نے ہی انہیں لیڈر بنایا ہے ؛ آپ جب چاہیں انہیں لیڈری سے ہٹا سکتے ہیں مگر یہ وقت ان کی حوصلہ شکنی کرنے اور اپنی صفوں میں بد دلی پھیلانے کے لیے موزوں نہیں ہے - بے شک آپ کے دل غم و غصہ سے خون ہو رہے ہیں - ہماری اپنی کیفیت یہی ہے مگر ہمارے ضبط اور صبر کے امتحان کا وقت ہے - وزارت کو کام کرنے کا موقع تو دیجیے ، اس کے بعد ان کے کام کو پرکھیئے - اگر وہ ناکارہ و نا اہل ثابت ہوں تو انہیں وزارتی گدیوں سے ہٹا دیجیے - ہم اس کوشش میں آپ کے مد و معاون ثابت ہوں گے - مگر کسی کو کام کرنے کا موقع دیے بغیر اس پر نالائقی کا فتویٰ صادر کرکے اس کی راہ میں مشکلات پیدا کرنا یا اس سے عدم تعاون کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں -

عوام سے ہماری دوسری گزارش یہ ہے کہ وہ پاکستان میں بدامنی ، لوٹ مار اور قتل و غارت کو روکیں - اس سے آپ کی حکومت کی ساری توجہ صرف قیام امن پر مرکوز ہو رہی ہے اور وہ کچھ اور کرنے کے قابل نہیں ہے - اس سے نہ صرف مغربی پنجاب کی ترقی رک گئی ہے بلکہ مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کو بھی نقصان پہنچ رہا ہے ، کیوں کہ ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے - اب عوام مغربی پنجاب میں امن قائم کرکے اپنی حکومت کو اس قابل بنا دیں کہ وہ اپنی پوری توجہ ان مظلوموں کی امداد پر صرف کر سکے -

یہ سطور ۱۱ اگست کو لکھی گئی تھیں مگر اس دن بھی اخبار نہ چھپ سکا - ہمیں یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ ان سطور میں جو تجاویز پیش کی گئی ہیں ان میں سے اکثر پر عمل شروع ہو گیا ہے اور انشاءاللہ باقی تجاویز پر بھی بہت جلد عمل

شروع ہو جائے گا۔''
(نوائے وقت ۲۰ اگست ۱۹۴۷ء)

بانیٔ پاکستان قائد اعظم کی رحلت پاکستانیوں کے لیے صدمۂ جانکاہ تھی۔ حمید نظامی کو قائد اعظم کی شفقت اور توجہ حاصل رہی تھی۔ انھیں ملت کی کشتی کے نا خدا سے عقیدت تھی۔ انھیں قائد اعظم کی رحلت کے المیہ کی سنگینی اور شدت کا احساس تھا، مگر انھوں نے اس موقع پر بھی جذباتی ہونے کی بجائے قوم کو دلاسہ دیا اور یہ صدمہ سہنے کے لیے ذہنی و جذباتی طور پر تیار کرنے کی کوشش کی۔ ذیل کا اداریہ اس کی مثال ہے۔

''قائد اعظم

عمر ہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

یہ بات ہر مسلمان کے دل میں ہے کہ اس وقت جب کہ پاکستان اور ملت اسلامیہ ہر طرف سے خطرات میں گھرے ہوئے ہیں، ہمیں قائد اعظم کے تدبر اور رہنمائی کی بے حد ضرورت تھی اور اسی نازک مرحلے پر اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنے پاس بلا لیا۔ مگر ایک طرف عام مسلمان کے یہ جذبات ہیں اور دوسری طرف اس کا یہ عقیدہ کہ کوئی موت بے وقت نہیں ہوتی۔ خدا اپنے بندے کو موت کا پیغام اسی گھڑی بھیجتا ہے جب وہ اس دنیائے فانی میں اپنا وقت پورا کر چکا ہو۔۔۔اس تاثر کو کوئی دلیل، کوئی توضیح، کوئی ڈھارس دل آزردہ سے جدا نہیں کر سکتی کہ قوم کو اس وقت قائد اعظم کی سب سے زیادہ ضرورت تھی مگر مسلمان کا اس پر بھی ایمان محکم ہے کہ موت کا وقت ہر شخص کے لیے معین ہے اور اس میں ایک پل کے لیے ادھر ادھر ہونے کی کوئی گنجائش نہیں۔ قائد اعظم کی وفات حسرت آیات صرف

پاکستان کے مسلمانوں کے لیے ہی نہیں پورے عالم اسلام کے لیے ایک صدمہ جانکاہ ہے ۔ گو یہ کہنا غلط ہوگا کہ یہ موت غیر متوقع تھی ۔ مرحوم و مغفور کی صحت کثرت کار کی وجہ سے ایک عرصے سے اچھی نہیں تھی ۔ گو دل وفور محبت کی وجہ سے اس امکان کو ماننے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوتا تھا مگر کون کہہ سکتا ہے کہ اسے یہ دھڑکا ہر وقت نہیں لگا رہتا تھا ۔ قدرت کا قانون ہے کہ کسی شخص کو اس عالم خاکی میں عمر دوام نہیں بخشی جا سکتی ۔ اگر یہ اٹل قانون کسی استثنا کا روادار ہوتا تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات اس سے مستثنٰی ہوتی ۔ حضور کی وفات کا بھی مسلمانوں کو اس قدر صدمہ ہوا کہ ان کے دل نہیں مانتے تھے کہ اللہ کا رسول بھی مر سکتا ہے ۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالٰی عنہ وفور غم و عشق سے بے حال تھے اور تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر اعلان کرتے تھے کہ جو شخص یہ کہے گا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مر گئے ہیں میں اس کا سر تن سے اڑا دوں گا ۔ اس وقت رسول کریم کے حبیب صدیق اور یار غار حضرت ابوبکرؓ آگے بڑھے ۔ انہوں نے ابن خطاب سے فرمایا : ''عمر صبر سے کام لو! '' پھر با آواز بلند فرمایا : ''اے ایمان والو ! جو شخص محمد کی پرستش کرتا تھا وہ سن لے کہ محمد آج وفات پا گئے ہیں ۔ لیکن جو شخص اللہ کی پرستش کرتا تھا وہ سن لے کہ اللہ زندہ ہے اور اسے موت نہیں ہے ۔''

قائد اعظم محمد علی جناح ، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ان غلاموں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے خلوص اور عمل سے عاشقان نبی کی صف میں ایک ممتاز جگہ حاصل کر لی ہے ۔ اس صدی میں ان سے بڑھ کر کسی نے امت محمدی کی خدمت نہیں کی ۔ یہ خدمت خود رسول پاک کی خدمت گنی جائے گی ۔ ہم تو اسے نبی امی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اعجاز سمجھتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

کا ایک غلام ہندوؤں اور انگریزوں کے مشترکہ محاذ کے خلاف
تن تنہا ۔۔۔ اور بالکل بےسر و سامانی کے ساتھ ۔۔۔ برسر پیکار رہا
اور آخر اللہ نے اس کو فتح بخشی ۔ تاریخ اس کی مثال نہیں پیش کر
سکتی کہ تنہا ایک بے یار و مددگار آدمی کی کوششوں سے ایک
عظیم الشان مملکت سات سال کے قلیل عرصے میں معرض وجود میں
آئی ہو ۔ یہ معجزہ مشیت ایزدی نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک
غلام کی قسمت میں ہی لکھ رکھا تھا ۔

قائد اعظم اور پاکستان لازم و ملزوم تھے ۔ حقیقت یہ ہے
کہ قائد اعظم نے اپنے وجود کو پاکستان کے وجود میں مدغم
کر دیا تھا ۔ اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ پاکستان قائد اعظم
کی کوششوں سے قائم ہوا ۔ قیام پاکستان کے بعد استحکام پاکستان
کے لیے بھی ہر پاکستانی سے زیادہ محنت قائد اعظم ہی کر رہے
تھے ۔ سب کو معلوم ہے کہ مرحوم و مغفور کی صحت گزشتہ دو
ماہ سے خراب تھی اور ڈاکٹروں نے انہیں کامل آرام کی تاکید
کر رکھی تھی ۔ طبی مشورہ کے ماتحت ہی وہ پہلے زیارت میں اور
اس کے بعد کوئٹہ میں قیام فرما تھے ۔ مگر پاکستان کے لیے محنت
کا یہ عالم تھا کہ کوئٹہ سے ایک نامہ نگار حبیب الرحمان صاحب
کا خط ہمیں ۱۲ ستمبر کو موصول ہوا جس کے ابتدائی الفاظ یہ
ہیں : ''جناب قائد اعظم مدظلہ العالی بخیر و عافیت ہیں اور مملکت
پاکستان کے نظم و نسق کے متعلق چھ گھنٹے دفتر میں بیٹھ کر
کام کرتے ہیں ۔'' یہ خط ۱۰ یا گیارہ ستمبر کو لکھا گیا ہوگا ۔
نامہ نگار نے اس دن ڈاک میں ڈالا جب قائد اعظم ابھی
کوئٹہ میں ہی تھے مگر ہمارے دفتر میں ایسے وقت پہنچا کہ ان کی
وفات حسرت آیات کی خبر آٹھ گھنٹے پہلے موصول ہو چکی تھی ۔
غور فرمائیے ! ۷۱ برس کی عمر ۔۔۔ مرض الموت لاحق ۔۔۔ کمزوری
کا یہ عالم کہ ڈاکٹر کامل آرام کا مشورہ دے رہے ہیں مگر فرض

کا احساس اور استحکام پاکستان کی دھن ہے کہ اس حال میں بھی چھ گھنٹے روزانہ کام کرا رہی ہے - ہم میں سے کتنے ہیں جو پچیس تیس برس کی عمر میں بھی اچھی صحت کے باوجود چھ گھنٹے روزانہ محنت کرتے ہیں؟ کوئٹہ سے کراچی کا سفر بھی ، جو ان کی زندگی کا آخری سفر ثابت ہوا ، قائد اعظم نے اپنے وزرا کے مشورے پر نہیں اختیار فرمایا بلکہ ڈاکٹروں کی تنبیہ کی بھی پروا نہیں کی اور یہ کہتے ہوئے کہ قوم و ملک کو نہایت اہم مسائل درپیش ہیں ، اس وقت میرا دارالسلطنت سے دور رہنا ٹھیک نہیں ، کراچی تشریف لے گئے ۔ شاید مشیت ایزدی کو یہی منظور تھا کہ جس شہر میں انھوں نے پہلی مرتبہ آنکھ کھولی ، اسی شہر میں ان کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہوں ۔ لیکن آخری سانس تک ملک و ملت کی خدمت میں گزاری ہے ۔ یہ موت شہید کی موت نہیں تو شہادت اور کسے کہتے ہیں ؟ خدمت ، بے غرض خدمت!! مسلسل خدمت !!! یہی قائد اعظم کا پیغام ہے جو وہ قوم کے نام چھوڑ گئے ہیں ۔ ان کی روح زندہ ہے اور یہ دیکھ رہی ہے کہ قوم ان کے پیغام پر کس طرح لبیک کہتی ہے ۔ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں ، قائد اعظم نے اپنے وجود کو پاکستان کے وجود میں مدغم کر دیا تھا ۔ ان کی زندگی پاکستان کے لیے وقف ہو کر رہ گئی تھی . پاکستان کو قائد اعظم محمد علی جناح کی شخصیت سے جدا نہیں کیا جا سکتا ۔ محمد علی جناح 'پاکستان مجسم' تھے ۔ اگر پاکستان زندہ ہے تو محمد علی جناح زندہ ہیں ۔ انشاءاللہ تعالیٰ پاکستان ابدالآباد تک زندہ رہے گا اور محمد علی جناح بھی ابدالآباد تک زندہ رہیں گے ۔ دو سو سال بعد بھی جب کسی کے لب پر پاکستان کا نام آئے گا تو اس کا ذہن خود بخود محمد علی جناح کی طرف لوٹ جائے گا ۔

قائداعظم ان زندۂ جاوید ہستیوں میں سے ہیں ، جنھیں موت کا

بے رحم ہاتھ بھی نہیں مٹا سکتا۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

ان کا خاکی جسم آج ہمارے درمیان نہیں ہے مگر جو مشعل انہوں نے روشن کی ہے، وہ صدیوں تک ہماری رہنمائی کرتی رہے گی۔ یہ ٹھیک ہے آج ہم چاروں طرف سے خطرات میں گھرے ہوئے ہیں مگر قائد کی موت ہمارے دلوں میں افسردگی و مایوسی کی بجائے ایک نیا عزم اور ایک نیا ولولہ ان خطروں کے مقابلے کے لیے پیدا کرے گی۔ یہ ٹھیک ہے آج ہر طرف تاریکی ہی تاریکی ہے مگر قائد اعظم کی زندگی سے ہمیں روشنی ملے گی۔ انہوں نے حق کی شمع کو ایک ایسے ہی وقت میں بلند کیا تھا جب چاروں طرف اس سے بھی زیادہ گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ آج ہم میں کوئی ایسا لیڈر نہیں ہے جو ان کی جگہ لے سکے، مگر قائد اعظم کو بھی اللہ تعالیٰ نے ہی ہماری قیادت کے لیے مامور فرمایا تھا اور انہوں نے ہماری رہنمائی کا ذمہ اس وقت اٹھایا تھا جب خدا کو یہ منظور ہوا کہ وہ مسلمانان ہند کی کشتی کو گرداب سے نکال کر ساحل مراد تک لے جائیں۔ ۱۹۰۷ء سے ان کا شمار آل انڈیا لیڈروں میں تھا مگر ۱۹۳۷ء تک کسی نے ایسے گوہر یک دانہ کی قدر نہ پہچانی۔ لیکن جب خدا کو یہ منظور ہوا کہ وہ میر کارواں بنیں تو دس ہی سال کے اندر پوری قوم ان کی پشت پر تھی اور سارے دشمن ان کے قدموں پر۔ اللہ کو منظور ہوگا تو وہ قائد اعظم کا جانشین پیدا کرے گا لیکن جب تک وہ مرد مومن اس خلا کو پورا نہیں کر دیتا جو قائد اعظم کی موت نے پیدا کر دیا ہے، اس وقت تک ہم میں سے ہر ایک کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی اپنی جگہ محمد علی جناح بن جائے۔ یعنی ہر شخص جہاں کہیں بھی ہے، وزیر ہے یا سرکاری حاکم، کارخانہ دار ہے یا تاجر، مزدور ہے یا دکاندار، بوڑھا ہے یا جوان، عورت ہے

یا مرد ، اسی خلوص ، اسی بے غرضی ، اسی ہمت ، اسی عزم اور اسی استقلال کے ساتھ ملک و ملت کی خدمت پر کمر باندھے جو قائد اعظم کے طغرائے امتیاز تھے ۔ محمد علی جناح جب تک زندہ رہے سات کروڑ پاکستانیوں کا کام کرتے رہے اور چھوٹے بڑے ہر مسلمان کا ہر مسئلے کے متعلق یہی رد عمل ہوتا تھا کہ قائداعظم اسے حسن و خوبی کے ساتھ حل کر لیں گے ، مجھے فکر کی کیا ضرورت ہے ؟ اب ان کی موت کے بعد سات کروڑ پاکستانیوں کا فرض ہے کہ وہ مل کر اس کام کو مکمل کرنے کی کوشش کریں جسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے قائداعظم نے جان عزیز جاں آفریں کے سپرد کی ۔ یہ کام استحکام پاکستان ہے ۔ قائد اعظم کی بہترین یادگار پاکستان ہے اور ان سے محبت کا بہترین مظاہرہ اسے مضبوط بنانے کی سعی !

قائد اعظم زندہ باد ــــــ

ــــــ پاکستان پائندہ باد''

(نوائے وقت ۱۶ ستمبر ۱۹۴۸ء)

اگرچہ یہ امر مسلم ہے کہ عصری تقاضوں کے تحت قیام پاکستان کے بعد صحافت میں بحیثیت مجموعی وہ گھن گرج نہ رہی جو پہلے ہوتی تھی ۔ اور صحافت کا جدید دور کوئی ظفر علی خان یا محمدعلی جوہر پیدا نہ کرسکا ۔ تاہم اس دور میں بھی بعض اداریہ نویسوں نے بیباکی اور جرأت کی تابندہ روایت کو برقرار رکھا ۔ ۱۹۵۸ ع میں مارشل لا نافذ ہونے کے بعد جن صحافیوں نے جمہوریت کی جلد بحالی اور آئین کی صحیح خطوط پر تشکیل کا بار بار مطالبہ کیا اور نئی ہمہ مقتدر حکومت کے بعض اقدامات اور ارکان پر جرأت کے ساتھ تنقید کی ، ان میں حمید نظامی کا نام سر فہرست ہے ۔ اکتوبر ۱۹۵۸ ع میں

مارشل لا نافذ ہوتے ہی آئین معطل ہو گیا ۔ سیاسی جماعتیں اور سیاسی سرگرمیاں ختم ہوگئیں ۔ نئی حکومت کی طرف سے سابق سیاستدانوں پر خوب لے دے ہونے لگی ۔ خوشامدیوں نے سُر ملا کر سیاستدانوں کی مذمت شروع کردی ۔ بعض حلقوں کی طرف سے یہ مطالبہ بھی ہونے لگا کہ سیاستدانوں اور سیاسی کارکنوں کو آئندہ کے لیے حق رائے دہی سے محروم کردیا جائے۔ ایسے وقت میں حمید نظامی نے ''توازن قائم رکھنے کی کوشش کیجیے'' کے زیر عنوان اداریے میں لکھا :

'' یہ بحث اس وقت بڑی حد تک محض علمی ہے مگر ہم اس موضوع پر بعض گزارشات ضروری سمجھتے ہیں ۔ کیونکہ ہمیں ڈر ہے کہ بیجا خوشامد کرنے والوں کا ایک گروہ (عجیب اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ گروہ ہر دور میں خوشامد پیشہ ہی رہا ہے) اس قسم کی انٹ سنٹ تجاویز پیش کرنے کو ایک فیشن نہ بنالے اور ملک میں ایک نیا ذہنی انتشار نہ پیدا کردے ...۔

بے ایمان افراد ہماری زندگی کے ہر شعبے میں پائے جاتے ہیں ۔ زمینداروں ، صنعتکاروں ، کارخانہداروں ، تاجروں ، دوکانداروں ، سرکاری ملازموں غرضیکہ ہر گروہ میں کالی بھیڑیں موجود ہیں ۔ لیکن ہر سرکاری ملازم بے ایمان نہیں ، ہر دوکاندار بددیانت نہیں ہے ۔ ارباب سیاست اور سیاسی کارکنوں کے گروہ میں بھی کالی بھیڑیں موجود ہیں مگر سارے سیاسی کارکن بلا امتیاز بددیانت نہیں ہیں ۔ ...۔ آپ بے ایمان افراد کی نہ صرف مذمت کیجیے ، انہیں سزا بھی دیجیے ، مگر یہ عدم توازن کی انتہا ہے کہ ہر اس شخص کو جس نے ماضی میں کبھی سیاست سے دلچسپی لی ہو حق رائے دہی سے محروم کرنے کی سفارش کی جائے ۔ پاکستان میں گیارہ برس پارلیمانی جمہوری نظام نافذ رہا ہے ۔ اور پارلیمانی جمہوری نظام میں سیاست سے دلچسپی معیوب

نہیں ، ضروری سمجھی جاتی ہے ، کیونکہ اس کے بغیر جمہوری نظام چل ہی نہیں سکتا ۔ اس سے بھی زیادہ اہم اور قابل غور بات یہ ہے کہ ۱۹۴۳ ع سے ۱۹۴۷ ع تک چار سال نیم براعظم میں مسلمانوں کی انتہائی سیاسی سرگرمیوں کا دور رہا ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے مسلمان آزادی اور پاکستان کی سیاسی لڑائی لڑ رہے تھے ۔ قائد اعظم کی مسلسل اپیل یہ تھی کہ بچے ، بوڑھے اور ادھیڑ عمر ، نوجوان ، طالبعلم ، مزدور تاجر ، دوکاندار ، مرد ، عورتیں سبھی آزادی اور پاکستان کی اس جدوجہد میں حصہ لیں اور سب کو معلوم ہے کہ چند بد بختوں کو چھوڑ کر پوری قوم نے آن کی آواز پر لبیک کہا - جن بچوں کی عمر دس برس تھی وہ بھی سیاست میں دلچسپی لیتے تھے اور پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتے تھے - سرکاری ملازموں کو چھوڑ کر ، کہ وہ قواعد ملازمت سے مجبور تھے اور قائد اعظم نے آن سے نوکری چھوڑنے کا مطالبہ نہیں کیا تھا ، ۴۷ - ۱۹۴۶ ع میں دس برس سے اوپر کی عمر کا شاید ہی کوئی مسلمان بالغ یا نا بالغ ہو جس کا سیاسی ماضی نہ ہو اور اس نے اس زمانے میں سیاست میں حصہ نہ لیا ہو ۔ اگر کوئی ایسا شخص ہے تو وہ قومی احساس سے یکسر عاری ہے اس لیے آج بھی کسی اعتماد یا عزت کا مستحق نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ آزادی کے لیے جدوجہد کرنے والی قوم میں سیاست سے دلچسپی ایک مقدس فرض ہے - - - - جمہوری ملک میں سیاست کاروبار حکومت چلانے کا دوسرا نام ہے -

(نوائے وقت ۲۳ اکتوبر ۱۹۵۸ ع)

اس وقت کے سر براہ حکومت اور مارشل لا کے ناظم اعلی نے طرز حکومت کے بارے میں اپنے خیال کا اظہار کیا تو حمید نظامی نے اس خیال سے اختلاف کرتے ہوئے ۴ دسمبر ۱۹۵۸ ع

کے اخبار میں '' نصب العین کی یاددہانی اور منزل کی نشاندہی'' کے عنوان سے ایک اداریے میں لکھا :

''۔ ۔ ۔ ۔ اے پی پی کی رپورٹ کے مطابق جنرل محمد ایوب خان نے کہا ہے کہ پارلیمانی طرز حکومت ایک ایسے ملک میں چلایا جا سکتا ہے جہاں سیاست دان آئین کی حقیقی روح کے تقاضے پورے کریں اور رائے دہندگان اتنے تعلیم یافتہ ہوں کہ وہ اپنے نمائندوں کو صحیح اقدام کے لیے مجبور کرسکیں ۔ ۔ ۔ ۔ تعلیم والی شرط بڑی حد تک ضروری اور پسندیدہ ہے لیکن ہم یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ پاکستان کے جمہوری نظام کو کامیابی کے ساتھ چلانے کی راہ میں جو مشکلات پیش آئیں اور جو گڑبڑ پیدا ہوئی اس کی تمام تر ذمہ داری ان پڑھ ووٹروں پر عائد کرنا مناسب نہیں ہوگا ، بلکہ یہ کہنا شاید زیادہ درست ہوگا کہ گڑبڑ کے لیے زیادہ تر ذمہ دار نام نہاد تعلیم یافتہ افراد ہی تھے ۔ ۔ ۔ ایک اچھا شہری ہونے کے لیے محض تعلیم یافتہ یا اعالی تعلیم یافتہ ہونا ہی کافی نہیں ؛ ایمان اور خلوص بھی تعلیم ہی کی طرح بلکہ شاید تعلم سے بھی زیادہ اہم صفات ہیں جن کے بغیر کوئی شخص اچھا شہری نہیں بن سکتا ۔ کردار کو تعلیم کی کمی اتنا خراب نہیں کرتی جتنا ایمان کی کمی خراب کرتی ہے ۔ جمہوریت کا تجربہ ایسے ملکوں میں بھی کامیاب ہوا ہے جہاں خواندگی کا تناسب پاکستان کے مقابلے پر کچھ زیادہ نہیں تھا ۔''

جب انہوں نے حکومت کے بعض ارکان کی تقریروں اور اعلانات سے یہ اخذ کیا کہ آئین کی تیاری کا مسئلہ بوجوہ معرض التوا میں ڈالا جا رہا ہے تو انہوں نے ۱۹ دسمبر ۱۹۵۸ ع کے نوائے وقت میں ایک شذرہ بعنوان '' آئین کی تیاری کا مسئلہ '' لکھا جس میں کہا کہ :

" وزیر اطلاعات نے صدر کے ایک اعلان کا حوالہ دیتے ہوئے ڈھاکہ میں اخباری نمائندوں کو یہ بتایا کہ جونہی حالات بہتر ہوئے ملک کے بہترین صلاحیت رکھنے والے قابل افراد کو آئین تیار کرنے کا کام سونپ دیا جائے گا ۔ ۔ ۔ اگر گستاخی نہ سمجھی جائے تو ہم اس سلسلے میں ایک گزارش کریں گے کہ آئین تیار کرنا کوئی معمولی یا آسان کام نہیں ۔ اگر واقعی ایک اچھا اور قابل عمل آئین تیار کرنا مقصود ہو تو اس کی تیاری کے لیے وقت چاہیے ۔ جلدی میں جو آئین مرتب کیا جائے گا اس میں لازمی طور پر خامیاں رہ جائیں گی ۔ کیا اس تجویز پر غور نہیں کیا جا سکتا کہ دوسرے اہم کام بھی ہوتے رہیں اور ان کے ساتھ ہی ساتھ آئین کی تیاری کے عظیم کام کا آغاز بھی کر دیا جائے ؟ ہم بڑے ادب کے ساتھ یہ کہنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ دنیا کے کسی ملک میں کوئی حکومت بھی اس ملک کے سارے مسائل حل نہیں کر سکی اور بہترین حکومتیں بھی کبھی اس پر قادر نہیں ہوئیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ افراد کی طرح قوموں اور ملکوں کے لیے بھی نت نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں ۔ ایک مسئلہ حل ہوتا ہے تو ایک نیا مسئلہ پیدا ہوجاتا ہے ۔ اس لیے کسی اہم مسئلے کو ، خواہ وہ آئین کی تیاری کا مسئلہ ہی کیوں نہ ہو ، اس وقت تک ملتوی رکھنا مناسب نہ ہوگا جب تک کہ باقی تمام مسائل حل نہ ہو جائیں ۔"

مارشل لا کے نفاذ کے تین ماہ بعد حکومت نے اخبارات کو اس امر کی اجازت دے دی کہ وہ مناسب تعمیری تنقید کریں ۔ نظامی صاحب تو اس سے پہلے بھی تنقید کا حق ادا کر رہے تھے چنانچہ انھوں نے " تنقید کا مسئلہ " کے زیر عنوان نوائے وقت میں لکھا :

" ۔ ۔ ۔ گزشتہ دو تین روز میں بعض دوستوں نے جب

ہم سے کہا کہ اب تو حکومت نے اخبارات کو تنقید کی اجازت دے دی ہے تو ہمارا سر ندامت سے جھک گیا ۔ جو تنقید حکومت کی اجازت کی محتاج ہوگی وہ کیا تنقید ہوگی ؟ بلاشبہ اخبار نویسی ایک پیشہ ہے اور ہم اس کے ذریعے اپنی روزی کماتے ہیں ، مگر یہ ایک مقدس مشن بھی ہے اور مشن کے بارے میں خلوص کا امتحان خطرے کے وقت ہوتا ہے ۔ اگر ہم اپنے مشن کی خاطر خطرہ مول لینے کو تیار نہیں یا خطرے کے وقت اپنی زبان بند کرلینے اور اپنا سر جھکا دینے ہی کو بہترین مصاحت گردانتے ہیں تو پھر مردم شماری کا وہ ستم ظریف انسر سچا تھا جس نے اخبار نویسوں اور ارباب نشاط کو ایک ہی خانے میں شمار کیا تھا ۔ کردار کی آزمائش بحران یا خطرے کے وقت ہوتی ہے ۔ اگر اس وقت ہم اپنے ضمیر کی آواز نہیں سن سکتے یا اسے خاموش کردیتے ہیں تو کسی مقدس مشن سے وابستگی کے متعلق ہمارا دعویٰ باطل ہے ۔ پھر تو بس روٹی کمانے والی بات ہی باقی رہ جاتی ہے اور وہ کسی طور کیا کھانے مچھندر ۔ ۔ ۔ ۔ ''

(افتتاحیہ نوائے وقت اشاعت ۲۰ جنوری ۱۹۵۹ء)

۹ مارچ ۱۹۵۹ ع کو اس وقت کے وزیر خارجہ مسٹر منظور قادر نے آئین کے متعلق کچھ ایسی باتیں کہیں جو حمید نظامی کے خیال میں درست نہیں تھیں چنانچہ انھوں نے ۱۰ مارچ ۱۹۵۹ع کے نوائے وقت میں ''اثر کرے نہ کرے سن تو لے مری فریاد '' کے زیر عنوان افتتاحیہ میں لکھا :

'' مسٹر منظور قادر نے لائل پور کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے آئین کی روح یا ہیئت کے بارے میں بعض باتیں کہی ہیں ۔ ایک رپورٹ کے مطابق آپ نے کہا : ''اگر لوگ اپنی زندگیوں کو اسلام کے مطابق ڈھال لیں تو جو بھی آئین ہوگا خود بخود اسلامی بن جائے گا ۔ ۔ ۔ ۔ ملک کے لیے اسلامی

آئین مرتب کرنا آسان کام نہیں ہے اس کی وجہ اسلام میں فرقہ بندی ہے ۔ ۔ ۔ ۔'' ایک تیسری رپورٹ یہ ہے کہ وزیرخارجہ مسٹر منظور قادر نے کہا : ''اسلامی دستور بنانا آسان نہیں ہے ۔ انھوں نے کہا کہ ''مسلمانوں میں فرقہ بندی اور قرآن و سنت کی تفسیر کے بارے میں ان کے اختلافات اسلامی دستور کی تیاری میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں ۔ مسلمانوں میں ۷۲ فرقے ہیں جن کی سنت نبوی ؐ اور قرآن کریم کے متعلق تفسیر ایک دوسرے سے مختلف ہے'' ۔ انھوں نے کہا کہ ایک قابل عمل آئین اسی صورت میں بن سکتا ہے کہ ملک میں مکمل اتحاد ہو ۔ جب یہ اتحاد قائم ہوجائے گا ، عوام کے نمائندے منتخب کیے جائیں گے جو جس طرز کا چاہیں آئین تیار کریں گے ۔''

وزیر خارجہ نے اپنی بات پبلک میں کہی ہے اور اس لیے کہی ہے کہ وہ پبلک کی رائے عامہ معلوم کرنا چاہتے ہیں ۔ ہمیں امید ہے کہ وہ ہماری بات تحمل سے سنیں گے ۔ پہلی بالکل صاف اور موٹی بات یہ ہے کہ یہ ملک برصغیر کے مسلمانوں نے ایک نظریے کے ماتحت حاصل کیا تھا ۔ یہ ایک نظریاتی مملکت ہے اور مسلمان اس ملک میں مسلمانوں کی طرح زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں ۔ اس ملک کے لیے جو بھی آئین مرتب کیا جائے اس کا ایک بنیادی اصول یہ ہونا چاہیے کہ حکومت اس ملک کے مسلمانوں کی حوصلہ افزائی اور مدد کرے گی کہ وہ اپنی زندگیاں اسلامی سانچے میں ڈھال لیں ۔ سیکولر یا لادینی نظام حکومت اس اصول کی نفی کرتا ہے ، بلکہ پاکستان کے بنیادی نظریے کے منافی ہے ، اس لیے پاکستان میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ۔

دوسری گزارش کا تعلق عملی حقیقت سے ہے ۔ اس ملک میں غالب اکثریت مسلمانوں کی ہے ۔ عصر حاضر میں اس

جمہوری اصول سے انحراف ممکن نہیں کہ تمام اہم امور ملکی میں آخری فیصلے کا اختیار عوام ہی کو حاصل ہے۔ دنیا کے ان ملکوں میں بھی جہاں شاہی نظام رائج ہے، اب اس اصول کا احترام کیا جاتا ہے کہ جمہوری رائے ہی آخری فیصلے کی مجاز ہے۔ کوئی محدود اقلیت، خواہ وہ عالم، فاضل اور لائق افراد پر ہی مشتمل کیوں نہ ہو، اپنی مرضی عوام کی غالب اکثریت پر مسلط نہیں کرسکتی۔

کوئی معقول آدمی تھیوکریسی یا پاپائیت یا ملاؤں کی حکومت کا مطالبہ نہیں کرتا، مگر ان اصطلاحات کی آڑ لے کر اس معقول مطالبے پر غور کرنے سے انکار نہیں کرنا چاہیے کہ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے۔ اس کا قیام ایک نظریے کی بنا پر عمل میں آیا تھا، لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اس کا آئین اسی بنیادی نظریے سے مطابقت رکھتا ہو ۔۔۔ اس ضمن میں فرقہ بندی اور اختلافات کا ذکر سن کر ہمیں بے حد افسوس ہوا۔ بالخصوص یہ بات کہ قوم میں مکمل اتحاد ہو تو ۔۔۔ کیا یہ ایک عملی شرط ہے؟ دنیا کی کسی قوم میں کبھی مکمل اتحاد ہوا ہے؟ خود مسلمانوں میں کبھی مکمل اتحاد ہوا؟ خود رسول ؐ پاک کے ذہن مبارک میں یہ بات نہ تھی کہ قوم میں مکمل اتحاد ہوگا یا ہونا چاہیے ورنہ حضور ؐ یہ نہ فرماتے کہ میری امت میں اختلاف باعث رحمت ہے۔ دیانتدارانہ اختلاف کی گنجائش تو مثالی سوسائٹی میں بھی ہوتی ہے۔ بلکہ ہمیں یہ کہنے کی اجازت دی جائے کہ جس سوسائٹی میں دیانتدارانہ اختلاف کی گنجائش نہیں، وہ مثالی تو کیا ایک اچھی سوسائٹی کہلانے کی بھی مستحق نہیں ۔۔۔ منظور قادر ایک جدید تعلیم یافتہ آدمی ہیں، انہیں شاید ایک ماڈرن نظریہ زیادہ اپیل کرے کہ اختلاف جمہوریت کی جان ہے۔ اپوزیشن یا اختلاف کے بغیر جمہوریت

ایک فریب ہے۔ مکمل اتحاد زندوں کی سوسائٹی میں ناممکن ہے۔ مکمل اتحاد آپ کو قبرستان ہی میں ملے گا۔

مسلمانوں میں فرقہ بندی ضرور ہے مگر بنیادی امور اور بنیادی مسائل میں بہت کم اختلاف ہے اور یہ اختلاف اسلامی دستور کی تیاری میں ہرگز حائل نہیں۔ ان تمام اختلافات کے باوجود سابق دستور ساز اسمبلی نے ایک ایسا آئین بنا دیا تھا جسے پاکستان کے سب فرقوں نے اسلامی مان لیا تھا۔۔۔۔''

مختصر یہ کہ حمید نظامی مرحوم نے مارشل لاء کے زمانے میں جمہوریت کی بحالی اور آئین کی جلد تیاری کا بار بار مطالبہ کیا۔ ان کی اداریہ نگاری کا یہ انداز جہاں ان کی جرأت کا ثبوت مہیا کرتا ہے وہاں یہ بھی بتاتا ہے کہ اگر اداریہ نویس کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہو تو وہ ہر قسم کی بندشوں کے باوجود اپنا مافی‌الضمیر ظاہر کرسکتا ہے۔

۱۸ جون ۱۹۵۹ء کو 'آئین کا مسئلہ' کے عنوان سے ایک اداریے میں لکھا:

''گورنر مشرق پاکستان نے نتھیا گلی کانفرنس میں شرکت کے بعد ڈھاکہ جاتے ہوئے راستے میں لاہور کے اخبار نویسوں کو یہ بتایا کہ آئین کمیشن سال رواں ختم ہونے سے پہلے مقرر کر دیا جائے گا۔ پھر ڈھاکہ پہنچ کر بھی آپ نے یہی بات کہی اور اس میں یہ اضافہ کیا کہ کمیشن اپنی رپورٹ ۱۹۶۰ء کے آخر تک مکمل کر لے گا۔

آئین کمیشن کے تقرر کے بارے میں پہلے بھی اس توقع کا اظہار کیا گیا تھا کہ یہ کمیشن آخر اکتوبر یا نومبر میں معرض وجود میں آ جائے گا۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اب گورنر مشرق پاکستان نے بھی اس توقع کا اعادہ کیا ہے۔ اس سے

یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آئین کے سلسلے میں ابتدائی کام اور وہ سارے کام جنھیں ٹائم ٹیبل میں آئین سے پہلے نمبر پر رکھا گیا تھا پروگرام کے مطابق ہو رہے ہیں ۔ لیکن مسٹر ذاکر حسین کا یہ ارشاد کہ آئین کمیشن اپنی رپورٹ ۱۹۶۰ء کے آخر تک مکمل کر لے گا ، غالباً ان کے ذاتی اندازہ و قیاس پر مبنی ہے ۔ ہمارا خیال ہے کہ کمیشن اپنی رپورٹ مکمل کرنے کے لیے پورا ایک برس نہیں لے گا ، بلکہ یہ رپورٹ اس سے بہت پہلے مکمل کر لی جائے گی ۔ ہمارے اس قیاس کی بنیاد اس امر پر ہے کہ اس کمیشن کو وہ موانع و مشکلات درپیش نہیں ہوں گے جو سابقہ دستور ساز اسمبلیوں کا وقت ضائع کرتے رہے ۔ کمیشن مختصر ہوگا اور یہ توقع بیجا نہیں کہ اس کے ارکان اصول کی حد تک ایک ہی خیال اور نظریے کے حامی ہوں گے ، اس لیے بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ کمیشن کو اپنی رپورٹ تیار کرنے میں زیادہ وقت صرف کرنا پڑے ، اور ہماری ناچیز رائے میں کوشش بھی یہی ہونی چاہیے کہ یہ کام جلد از جلد ختم کیا جائے ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ نئے آئین کے نفاذ اور اس کے ماتحت پہلے انتخاب کا انحصار ایک حد تک اصلاحات بالخصوص زرعی اصلاحات کے نفاذ پر ہے ۔ کسی کو اس حقیقت سے انکار نہیں کرنا چاہیے کہ اہل سیاست کے مخصوص مفاد زرعی اصلاحات کے نفاذ کی راہ میں ہمیشہ حائل رہے اور اس خطرے کی جانب سے بھی آنکھیں بند نہیں کی جا سکتیں کہ زرعی اصلاحات کے مستحکم نفاذ سے قبل اگر اہل سیاست کو موقع ملے تو مخصوص مفاد کے زیر اثر ان اصلاحات کو ناکام بنانے اور ان پر پانی پھیرنے کی کوشش ضرور کی جائے گی اور یہ بحیثیت مجموعی ملک کی بدقسمتی ہوگی اس لیے اولین — اور — پوری توجہ کی مستحق یہ اصلاحات ہیں لیکن اصلاحات کے نفاذ کے بعد (جو اب زیادہ دور نہیں) جب

ایک مرتبہ تشکیل آئین کے کام کا آغاز ہو جائے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ یہ کام لمبا وقت لے۔

نئے آئین کی جلد از جلد تشکیل و تدوین کی ضرورت و اہمیت کے بارے میں ان کالموں میں کئی مرتبہ لکھا جا چکا ہے اور یہ مسئلہ اتنا پیچیدہ یا ناقابل فہم نہیں ہے کہ اس کی وضاحت و تصدیق کے لیے دلائل و شواہد کا انبار لگایا جائے۔ تلخ و ناگوار بات کا سننا اور تلخ و ناگوار حقائق کا سامنا کرنا ایک ایسا ضروری وصف ہے جو ہر اس آدمی میں ہونا چاہیے جو کوئی بڑا کام کرنا چاہتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی قوم عظمت کی خواہاں ہے تو اسے بھی تلخ و ناگوار حقائق کا سامنا کرنے کی جرأت اپنے اندر پیدا کرنی چاہیے۔ محض میٹھی میٹھی باتیں اور صرف مدح و ستائش کے تذکرے فرد کی طرح قوم کو بھی بے عمل بنا دیتے ہیں ۔۔۔

آزاد جمہوری دنیا میں جس کے ساتھ ہمارے گہرے تعلقات ہیں، آئین کے بغیر ملک ایک ایسا بدن ہے جو روح کی تلاش میں ہو۔ بات بہت تلخ و ناگوار ہے مگر بہر حال غور کے قابل ہے کہ جب ہمارے دوستوں کا رد عمل یہ ہے تو مخالفوں کا تاثر کیا ہوگا؟ آئین کی جلد از جلد تشکیل پر ہمارے زور دینے کی ایک وجہ ہماری بھی خواہش ہے کہ یہ تاثر جلد از جلد دور ہو تاکہ ہم بین الاقوامی برادری میں اپنا سر فخر کے ساتھ اونچا کر سکیں۔ ۔۔۔۔ الخ۔"

خصوصیات

۱۔ مستند و معتبر

ڈاکٹر محمد باقر کے بقول: "اگر صرف نوائے وقت کے اداریوں کو جمع کرکے ان کا جائزہ لیا جائے تو تحصیل پاکستان اور

پاکستان کو قائم رکھنے کی مساعی کی ایک مستند تاریخ مرتب ہو سکتی ہے اور ان افراد اور ان تحریکوں کی نشاندہی بھی ہو سکتی ہے جنھوں نے پاکستان کو برباد کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی؟ ۔'' ظاہر ہے کہ نوائے وقت کے بیشتر اداریے حمید نظامی ہی لکھتے تھے اور ان اداریوں سے مستند تاریخ مرتب ہو سکنے کی وجہ یہ ہے کہ حمید نظامی نے قیام پاکستان سے پہلے حصول پاکستان اور قیام پاکستان کے بعد اس کو مضبوط و مستحکم بنانے ، نظریہ' پاکستان کی تشریح اور تحفظ کے سلسلے میں اپنے اداریوں میں بہت کچھ لکھا اور جو کچھ لکھا اعتدال اور استدلال کے ساتھ لکھا ۔

۲ - اعتدال و استدلال

انہوں نے ۱۹۴۰ء میں نوائے وقت کی اولین اشاعت میں ''کچھ اپنے متعلق'' کے زیر عنوان لکھا تھا ''نوجوان ہونے کے باوجود ہم جوش فضول کے قائل نہیں'' ۔ چنانچہ ان کے اداریوں کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ کسی حال میں بھی اعتدال اور توازن کا دامن نہیں چھوڑتے ۔ ان کا سب سے بڑا ہتھیار ان کا استدلال ہے ۔ 'استدلال' اور اعتدال کی روش سے تحریر یا تقریر میں خوشگوار معقولیت پیدا ہو جاتی ہے اور پڑھنے یا سننے والے اگر تحریر یا تقریر میں پیش کردہ نقطہ' نظر کے خلاف بھی ہوں تو وہ اسے غیر معقول یا ناخوشگوار نہیں کہہ سکتے ۔ حمید نظامی کے اداریے معقولیت ، افہام و تفہیم اور استدلال کے عناصر سے بہرہ ور ہونے کے باعث ترغیبی اثر رکھتے ہیں ۔

۳ - جرأت

حمید نظامی مرحوم کے اداریوں کا تیسرا اہم وصف جرأت اظہار ہے ۔ وہ اعتدال اور استدلال کا دامن تھامے رکھنے کے

باوجود مطلب کی بات کھل کر اور جرأت کے ساتھ کہتے تھے۔ قائد اعظم پاکستان کے بانی اور مسلمانوں کے محبوب رہنما تھے۔ ۱۰ جولائی ۱۹۴۷ء کو برطانوی وزیر اعظم نے دارالعوام میں اعلان کیا کہ ۱۵ اگست کے بعد قائد اعظم محمد علی جناح پاکستان کے پہلے گورنر جنرل ہوں گے۔ قائد اعظم نے متحدہ ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو پاکستان اور بھارت کا مشترکہ گورنر جنرل بنانے کے مضمرات کو محسوس کرتے ہوئے خود پاکستان کا گورنر جنرل بننا منظور اور پسند کیا تھا۔ مگر حمید نظامی اپنی دانست میں یہ سمجھتے تھے کہ قائد اعظم حکومت سے باہر رہ کر پاکستان کی بہتر رہنمائی فرما سکتے ہیں، چنانچہ انہوں نے اداریے میں لکھا: ''یہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور مسلمان عوام کی قوت ارادی ہے کہ قائد اعظم نے ایک معجزہ کر دکھایا۔ مگر حصول پاکستان کے بعد ایک مضبوط سلطنت کی تعمیر اس سے بھی مشکل کام ہے اور اس کے لیے مسلمان آج بھی قائد اعظم کی رہنمائی کے محتاج ہیں اور کل سے زیادہ ـــــ ہماری ناقص رائے یہ ہے کہ قائد اعظم مسلم لیگ کے محبوب رہنما کی حیثیت سے پاکستان کے گورنر جنرل کی نسبت بہتر رہنمائی کر سکتے ہیں۔''

قیام پاکستان کے بعد انہوں نے 'ملازمتوں کو قومیانے' کے مسئلے کو اصول بنا کر بڑے بڑے عہدوں سے انگریزوں کی سبکدوشی کا بار بار مطالبہ کیا اور حاکمان وقت کی ناراضگی کی پروا نہ کی۔ جرأت و حق گوئی کی بنا پر ہی انہیں کچھ عرصے تک نوائے وقت کی جبری بندش کا صدمہ بھی سہنا پڑا۔ مگر انہوں نے 'جہاد' اور 'نوائے پاکستان' کی صورت میں اصولی لڑائی جاری رکھی اور ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ ۱۹۵۸ء میں مارشل لا کے نفاذ کے بعد بھی انہوں نے اپنے اخبار کی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے سرتوڑ کوشش کی اور سب سے پہلے آئین اور جمہوریت

کی بحالی کا مطالبہ کیا ۔ مگر ہمیشہ کی طرح اصولوں کی بنا پر لیکن جرأت کے ساتھ ۔ جسٹس محمد رستم کیانی مرحوم نے حمید نظامی کی برسی کے موقع پر ان کے اسی وصف کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا : ''علامہ اقبال کا ۔ یا قائداعظم کا ذکر کرتے ہوئے مجھے حمید نظامی یاد آتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ایسا آدمی جو اعتدال سے بھی نہ بڑھے مگر حد اعتدال پر کھڑے ہو کر افق امکاں کے بے پایاں حدود دکھا سکے ۔ ۔ ۔ ۔ ایسا آدمی وہ تھا جو اب نہیں۸ ۔'' اعتدال و توازن مگر جرأت و بیباکی کے ساتھ بات کہنا حمید نظامی کا منفرد انداز قرار دیا جا سکتا ہے ۔ میاں بشیر احمد لکھتے ہیں : ''وہ قلم کے معاملے میں کسی مفاہمت کے روادار نہ تھے ۔ ۔ ۔ ۔ انہوں نے نوائے وقت کو اپنے زور بیان سے ایک تحریک ، ایک انجمن ، ایک ادارہ ، ایک تنظیم اور ایک شمشیر براں بنا دیا۹ ۔''

مولانا راغب احسن کے الفاظ میں : ''انہوں نے اعلیٰ روحانی اقدار اور ایماندارانہ صحافت کی بلند ترین روایات قائم کیں اور سخت نامناسب حالات میں بھی جمہوری حریت ، شہری آزادیوں ، قانون کی حکمرانی ، آزادی پریس اور مظلوموں کے لیے انصاف و مساوات کی کمال بے خوفی سے تائید و حمایت کی ۔ وہ پاکستان میں اسلامی ملت ، جمہوری سیاست اور ابنائے اسلام کی آزادی و یکجہتی کے علمبردار تھے۱۰ ۔''

۴ ۔ اختصار و جامعیت

حمید نظامی کے اداریوں کی ایک اور خصوصیت ان کا اختصار اور جامعیت ہے ۔ اگرچہ نوائے وقت کے اجرا سے پہلے اردو اداریہ نویسی میں استدلال اور متانت کے عناصر پیدا ہو گئے تھے ، مگر طوالت کا رجحان ابھی موجود تھا ۔ حمید نظامی نے اردو اداریے کو مختصر اور جامع بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا ۔ انہوں نے اداریوں میں غیر ضروری تفصیل بلکہ زائد الفاظ کے

استعمال سے بھی احتراز کیا ۔ صرف موضوع سے متعلق باتیں جامعیت کے ساتھ لکھنے کی طرح ڈالی ۔

۵ ۔ سلاست

سلاست بھی حمید نظامی کے اداریوں کا ایک اہم وصف ہے ۔ انہوں نے اداریے کو خالصتاً صحافتی تحریر بنایا ۔ اگرچہ ان سے پہلے بھی معرکۃالآرا اداریے لکھے جاتے تھے مگر ان میں علمیت کا پہلو غالب ہوتا تھا ۔ انہوں نے صرف زبان کی خوبصورتی اور فصاحت و بلاغت کو پیش نظر نہیں رکھا بلکہ یہ کوشش کی کہ مطلب کی بات آسان سے آسان الفاظ میں کہی جائے تاکہ کم خواندہ قارئین بھی سمجھ سکیں ۔ اس سلسلے میں آغا شورش کاشمیری لکھتے ہیں کہ : ''حمید نظامی نے اداریہ نویسی کو مختصر ، جامع ، برمحل ، تخلیقی اور موضوع کے اردگرد کیا ۔ ۔ ۔ اردو اخبار نویسی کو انگریزی اخباروں کی طرح باوقار کیا اور بلند سطح پر لے گئے بلکہ اداریوں کے اعتبار سے اور بھی بالا کیا ۔ ۔ ۔ ثقیل الفاظ کی جگہ سہل الفاظ کو رواج دیا[۱۱] ۔'' شورش کاشمیری ہی مزید لکھتے ہیں کہ : ''حمید نظامی کا قلم شمشیر اصفہان تھا کہ اس کی کاٹ سے وزارتوں کے سر اڑ جاتے تھے ۔ جس کے اداریوں کو بڑے بڑوں کے دسترخوان پر ناشتے سے زیادہ خصوصیت حاصل تھی[۱۲] ۔''

مولانا عبدالماجد دریا بادی نے ۶ جون ۱۹۵۸ء کے صدق جدید میں لکھا تھا :

''نوائے وقت اردو روزناموں میں بڑی حد تک ایک معیاری پرچہ ہے ۔ زبان صحیح ، سلیس ، شگفتہ ۔ عوامیت ، بازاریت اور ابتذال سے ہمیشہ بلند ۔ نقیب شخصیتوں کا نہیں اصول کا ، ناقد پارٹیوں کا نہیں مسائل کا ۔ تحریر میں نہ جذباتی نہ جدلیاتی بلکہ

استدلالی ۔ متانت ، سنجیدگی ، شرافت کا ہر حال میں حامل ۔ اپنے اخباری مقالوں کی طرح وہ (حمید نظامی) گفتگو میں بھی ماشاءاللہ وزن اور توازن دونوں پر قادر ہیں ۔''

حمید نظامی نے اردو اداریہ کو مختصر، جامع، آسان اور پر اثر بنانے کے ساتھ ساتھ پورے ادارتی صفحے کو بھی زیادہ وقیع بنایا ۔ انہوں نے ادارتی صفحے پر حالات سے ہم آہنگ مضامین شائع کیے جن میں گرد و پیش کے واقعات کی توضیح و توجیہ بہتر ، مؤثر اور مدلل انداز میں کی جاتی تھی ۔ اگرچہ پہلے بھی اخبارات کے ادارتی صفحات پر مضامین شائع ہوتے تھے مگر ان میں سے اکثر علمی نوعیت کے [ہوتے تھے ۔ حمید نظامی نے ادارتی صفحے پر بھی زیادہ تر سیاسی نوعیت کے مضامین شائع کیے ۔ دوسرے اخباروں کے مزاحیہ کالموں میں اگرچہ سیاسیات ، مختلف طبقوں اور شخصیتوں پر مزاحیہ یا طنزیہ انداز میں لکھا جاتا تھا ، مگر حمید نظامی نے اپنے اخبار کے مزاحیہ کالم 'سر راہے' کو بھی زیادہ بامقصد طور پر استعمال کیا ۔ وہ بسا اوقات اس کالم میں بھی سیاسی مسائل ہی پر لکھتے تھے اور جو باتیں ادارتی کالموں میں نہیں لکھی جاتی تھیں یا نہیں لکھی جا سکتی تھیں وہ 'سر راہے' میں ہلکے پھلکے یا طنزیہ انداز میں لکھ دی جاتی تھیں ۔ بحیثیت مجموعی 'سر راہے' میں مزاح یا طنز کا عنصر کم ہوتا تھا ۔ اس عنوان کے تحت چھپنے والے بعض کالم ایسے ہوتے تھے کہ ان میں اور اداریوں میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا تھا ۔ مثلاً :

''پربھات' کے جہل مرکب مدیر کو 'زمیندار' ، 'انقلاب' ، 'شہباز' ، 'احسان' ، نوائے وقت' ، 'اجیت' سبھی نے ہزار بار سمجھایا کہ جس مسئلے کے متعلق علم نہ ہو اس کے متعلق تحقیق کی ٹانگ نہ توڑی جائے مگر ناروہنی جی اور اصلاح دو متضاد چیزیں ہیں ۔

گاندھی جی نے یہ کہا تھا کہ دنیا بھر میں یہ کہیں نہ دیکھا کہ مذہب بدل لینے سے کسی کی قومیت بھی بدل گئی۔ اس پر ہم نے یہ عرض کیا کہ دنیا بھر میں سوائے ہندوستان اور ہندو مت کے یہ بھی کہیں نہیں دیکھا کہ انسان انسان میں فرق ہو اور انسانوں کے ایک گروہ کی انسانیت حیوانیت میں تبدیل ہو گئی ہو اور اس کے ساتھ کھانا پینا ، رشتہ ناطہ جرم عظیم قرار دیا گیا ہو۔

نارومنی جی نے اس پر بھی تحقیق کے پتھر لڑھکائے ہیں اور لکھا ہے کہ عرب کے مسلمان بادشاہوں نے بھی تو عیسائیوں سے رشتہ ناطہ حرام کر رکھا تھا اور اس وقت مسلمان عیسائیوں کا چھوا ہوا نہیں کھاتے تھے۔

سچ ہے جہالت کی کوئی انتہا ہے نہ علاج۔ چودہ سو سال سے مسلمان عیسائیوں سے اہل کتاب کی حیثیت سے رشتے ناطے کرتے چلے آ رہے ہیں اور عیسائیوں کے ہاتھ کا چھوا کسی زمانے میں بھی مسلمانوں نے حرام تو کجا مکروہ بھی نہیں سمجھا مگر پتا نہیں نارومنی نے تاریخ کی کس کتاب میں یہ پڑھ لیا ہے کہ مسلمان عیسائیوں سے وہی سلوک کر رہے ہیں جو ہندو اچھوتوں سے کرتے ہیں ، اور نارومنی اس کو بالکل بھول گئے کہ اچھوت عیسائی نہیں مسلمان بھی نہیں بلکہ ہندو ہی ہیں اور ہندو ہونے کے باوجود جاتی ان سے یہ سلوک روا رکھتی ہے۔''

(سر راہے نوائے وقت ۹ ۱ اکتوبر ۱۹۴۴ء)

اور

''ویر بھارت' کو شکایت ہے کہ ریڈیو میں پاکستان قائم ہو گیا۔ کیسے ؟ ذرا سنیے :

''آل انڈیا ریڈیو کی خبروں کی زبان بھی خالص پاکستانی ہے اور اس میں بین الاقوامی ، سیاسی ، مستقبل ، مشیر ، سفارت خانہ ،

صنعت ، جمہوری آئین ، مہم وغیرہ سینکڑوں الفاظ اس جناتی بولی
کے پائے جاتے ہیں جس کا مطالب وسطی اور جنوبی ہند کے لوگ
لغت کی مدد سے بھی نہیں سمجھ سکتے ۔''

'ویر بھارت' کی حالت بالکل اس روائتی ونادار کی طرح ہے جو
اس ہانڈی کا بھی جس میں کھاتا ہے لحاظ نہیں کرتا ۔ 'ویر بھارت'
کے اسی شذرہ میں جو خود ایڈیٹر 'ویر بھارت' نے اس جناتی زبان
کے خلاف لکھا ہے مندرجہ ذیل الفاظ استعمال کیے ہیں : موروثی ،
نام نہاد ، اطلاع ، مخصوص ، مستثنٰی ، افتتاح ، محفل ۔ کیا 'ویر
بھارت' میں بھی پاکستان بن گیا ہے یا اردو زبان ہی ایسی ہے کہ
مہاشہ لاکھ جتن کرتے ہیں مگر اس کے بغیر کام نہیں چلتا؟ ''

(سر راہے ۔ نوائے وقت ۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۴۴ء)

موضوعات

حمید نظامی مرحوم اپنی وفات کے دن ۲۵ فروری ۱۹۶۲ء
تک اداریہ نگاری کرتے رہے اور ان کا اخبار اب بھی موجود
ہے ۔ ان کے اداریوں کے موضوعات میں کم و بیش وہ تمام عناصر
کارفرما ہیں جو جدید اداریوں کو ماضی کے اداریوں سے ممیز کرتے
ہیں ؛ مگر ان کے اداریوں کے موضوعات ان کے ہمعصروں کے
اداریوں کے موضوعات سے ایک معاملے میں مختلف ہیں ۔ وہ زیادہ تر
سیاسی اور اہم قومی معاملات و امور پر اداریے لکھتے تھے ۔
پاکستان کے قیام تک تو ان کے اداریوں کے بیشتر موضوعات کا
مرکز و محور 'حصول پاکستان' رہا ۔ اس کے بعد نظریۂ پاکستان
اور جمہوریت ۔ اس کے برعکس بعض دوسرے اداریہ نویس بعض
ادوار میں بوجوہ کمتر اہمیت کے مقامی ، علاقائی گروہی ،
ثقافتی اور لسانی مسائل پر بھی لکھتے رہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس
دور میں مقامی اور علاقائی مسائل نے بھی اہمیت اختیار کرلی ہے ۔

اسلوب

حمید نظامی مرحوم کے اسلوب تحریر کے متعلق ایک ہی بات کہی جا سکتی ہے اور وہ یہ کہ ان کا اسلوب صحافتی اسلوب ہے - یعنی مفہوم کو آسان سے آسان اور مختصر سے مختصر الفاظ میں ادا کرنا - اور زبان کی چاشنی اور خوبصورتی کو اولین اہمیت نہ دینا - حمید نظامی مولانا ظفر علی خان اور مولانا محمد علی جوہر ایسے اکابر کی طرح عالم ، ادیب ، شاعر اور خطیب نہیں تھے بلکہ صرف صحافی تھے اور انہوں نے اپنا اخبار بھی خاص مقصد کے تحت جاری کیا - پھر وہ جوش فضول کے قائل بھی نہیں تھے ، چنانچہ انہوں نے خالص صحافتی انداز میں لکھا ؛ اس لیے ان کے اداریوں یا دوسری تحریروں میں کوئی الگ یا منفرد اسلوب نظر نہیں آتا - وہ سیدھی سادی آسان اور عام فہم زبان لکھتے ہیں ، بلکہ بعض اوقات زبان کے قواعد کو ملحوظ رکھنے کے بجائے یہ کوشش کرتے ہیں کہ 'مفہوم' عام فہم انداز میں ادا ہو جائے ، خواہ زبان میں حسن پیدا ہو یا نہ ہو -

حوالہ جات

۱ - بحوالہ مضمون ڈاکٹر محمد باقر مطبوعہ نوائے وقت اشاعت ۲۲ جولائی ۱۹۶۹ء -

۲ - بیگم محمودہ حمید نظامی : نشان منزل ، ص ۱۲۸ -

۳ - ایضاً ص ۱۳۰ -

۴ - ''نوائے وقت کے پچیس سال'' مضمون از ظہور عالم شہید مطبوعہ نوائے وقت اشاعت ۲۲ جولائی ۱۹۶۹ء -

۵ - صحافت پاکستان و ہند میں ، صفحات ۴۹۱ ، ۴۹۲ -

۶ - شورش کاشمیری : حمید نظامی (ابتدائیہ از ظہور عالم شہید) -

۷ - ''نوائے وقت ایک عہد ساز اخبار'' مضمون از ڈاکٹر محمد باقر ، نوائے وقت لاہور اشاعت ۲۲ جولائی ۱۹۶۹ء

۸ - بحوالہ حمید نظامی از شورش کاشمیری -

۹ - ''نوائے وقت کی داستان حریت'' مضمون میاں بشیر احمد مطبوعہ نوائے وقت لاہور اشاعت ۲۲ جولائی ۱۹۶۹ء -

۱۰ - بیگم محمودہ حمید نظامی : نشان منزل ص ۱۵۷ -

۱۱ - شورش کاشمیری : حمید نظامی ، ص ۹۲ -

۱۲ - ایضاً ص ۲۷ -

سوالات

۱ - سر سید احمد خاں کے اداریوں کی خصوصیات ، بیان کیجیے اور جواب کو مثالوں سے واضح کیجیے -

۲ - اردو اداریے کے ارتقا میں سر سید احمد خاں کے کردار پر روشنی ڈالیے -

۳ - سر سید احمد خاں کے اداریوں کے اسلوب پر بحث کیجیے -

۴ - مولانا ظفرعلی خاں کی اداریہ نگاری کی اہم خصوصیات پر روشنی ڈالیے -

۵ - مولانا ظفر علی خاں نے اردو اداریے کو کہاں تک اور کیوں کر متاثر کیا ؟

۶ - مولانا ظفر علی خاں کے اداریوں کی زبان اور اسلوب کا تنقیدی جائزہ لیجیے -

۷ - ''مولانا ظفر علی خاں کے اداریوں کا نمایاں ترین وصف جرأت اور حق گوئی ہے'' تبصرہ کیجیے -

۸ - بحیثیت اداریہ نگار مولانا محمد علی جوہر کا مقام متعین کیجیے -

۹ - مولانا محمد علی جوہر کی اردو اداریہ نگاری کی خصوصیات بیان کیجیے -

۱۰ - مولانا محمد علی جوہر کے اداریوں کے اسلوب پر بحث کیجیے -

۱۱ - مولانا ابوالکلام آزاد کے اداریوں کے رنگ اور انداز کا تنقیدی جائزہ لیجیے -

۱۲ - مولانا ابوالکلام آزاد کے اداریوں کی خصوصیات بیان کیجیے -

۱۳ - مولانا ابوالکلام آزاد کی اداریہ نگاری کا زبان اور اسلوب کے اعتبار سے جائزہ لیجیے اور جواب کو مثالوں سے واضح کیجیے -

۱۴ - ''مولانا ابوالکلام آزاد داعی تھے اور ان کے اداریوں میں بھی دعوت کا رنگ موجود ہے'' بحث کیجیے -

۱۵ - ''مولانا ظفر علی خاں ، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت سراسر مبارزت طلبی ہے'' تینوں کے اداریوں کی روشنی میں اس رائے پر تبصرہ کیجیے -

۱۶ - ''مولانا محمد علی اور ظفر علی خاں پیدائشی صحافی تھے'' دونوں اکابر کے اداریوں کی روشنی میں اس رائے پر بحث کیجیے -

۱۷ - مولانا غلام رسول مہر نے اردو اداریے کو کہاں تک اور کیوں کر متاثر کیا ؟ مدلل جواب دیجیے -

۱۸ - ''مولانا غلام رسول مہر نے ایک بار پھر اردو اداریے میں سر سید احمد خاں کی عقلیت کا انداز پیدا کیا'' تبصرہ کیجیے -

۱۹ - مولانا غلام رسول مہر کی اداریہ نگاری کا تنقیدی جائزہ لیجیے -

۲۰ - اردو اداریے کے ارتقا میں حمید نظامی نے کیا کردار ادا کیا ؟ مدلل جواب دیجیے -

۲۱ - ''حمید نظامی نے اعتدال اور توازن کو برقرار رکھتے ہوئے جرأت و حق گوئی کی مثال قائم کی'' حمید نظامی کے اداریوں کی روشنی میں اس رائے پر تبصرہ کیجیے -

۲۲ - حمید نظامی نے بحیثیت اداریہ نویس تحریک پاکستان میں کیا حصہ لیا ؟ مدلل جواب دیجیے -

تیسرا باب

اردو اداریہ نویسی کے اسالیب

بنیادی نثری اسالیب

اردو اداریوں کے اسالیب کا جائزہ لینے سے پیشتر اردو زبان کے بنیادی نثری اسالیب کا جائزہ لینا ضروری ہے ۔ اگرچہ اسلوب زبان کا نہیں ، لکھنے والے کا ہوتا ہے ، اور کوئی لکھنے والا صاحب طرز اسی وقت بنتا ہے جب وہ ایک منفرد اسلوب بیان و اظہار اختیار کرتا ہے ۔ تاہم ہر زبان اور اس کے ادب کی ترقی کے مختلف ادوار یا ایک ہی دور کے مختلف مکاتب کی تخلیقات میں ایسا یکساں یا کم و بیش یکساں اسلوب ملتا ہے جسے زبان کا اسلوب قرار دیا جا سکتا ہے ۔ اردو زبان چونکہ مختلف اور متعدد زبانوں کے الفاظ کی آمیزش سے معرض وجود میں آئی ہے اس لیے اس میں نثر کے کئی مسلم اسالیب ملتے ہیں ۔ بقول رشید احمد صدیقی : ” ہند و پاک میں کم زبانیں ایسی ہوں گی جن میں نثر کے اتنے مسلم اسالیب ملتے ہوں جتنے کہ اردو میں[1] ۔“

اردو نثر میں واضح نثری اسلوب فورٹ ولیم کالج کے ادیبوں کی تصنیفات ، تالیفات اور تراجم میں ملتا ہے ۔ اس کالج کے زمانے سے پہلے ”گنج العلم“ خواجہ بندہ نواز ، میراں جی شمس العشاق کے رسالوں اور کتابوں اور دکن کی دوسری

تصنیفات میں اردو زبان کے جو نمونے ملتے ہیں ان میں سے کسی کو بھی واضح نثری اسلوب قرار نہیں دیا جاسکتا - ان نمونوں میں آہنگ کی ناہمواری نمایاں ہے اور اردو نثر کہیں شاعری سے قدم ملاتی نظر آتی ہے تو کہیں خطابت کے قریب پہنچ جاتی ہے - ''سب رس'' اور ''نو طرز مرصع'' کی زبان الفاظ کا گورکھ دھندا ہے - ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کے الفاظ میں ان میں : ''کاغذی گھوڑے یا زیادہ سے زیادہ کاٹھ کے گھوڑے رینگتے نظر آتے ہیں - ہاں فرق یہ ہے کہ ان پر ریشمی زین پڑے ہوئے ہیں جو نظر فریب اور زرق برق ہیں - مگر ان زین پوشوں کے نیچے جو گھوڑے ہیں ، ترصیع کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہیں - اور بعض اوقات تو ان پر اتنا بوجھ ہے کہ چلانے سے بھی نہیں چلتے ، جامد اور ساکت رہتے ہیں -۲'' چنانچہ جو گھوڑے چلتے ہی نہیں ان کی چال کے متعلق رائے کیسے دی جاسکتی ہے ؟ مختصر یہ کہ یہ کتابیں بھی کسی خاص اسلوب کی نمائندہ نہیں ہیں -

فورٹ ولیم کالج نے نثر کے ایک نئے دبستان کی بنیاد رکھی اور سادہ اور سلیس اردو نثر کی تحریک شروع کی - اگرچہ اس کالج سے وابستہ تمام ادیبوں کی تصنیفات ، تالیفات یا تراجم آسان اور سلیس نہیں ، تاہم اس کی نمائندہ اور مقبول عام کتابیں ''باغ و بہار'' اور ''توتا کہانی'' پورے دبستان کی ترجمانی کرتی ہیں - اگرچہ ان کی زبان پر فارسی کا اثر ہے ، مگر اظہار بیان میں بے تکلفی ہے ، سلاست اور روانی ہے - لیکن اس کالج کی سرپرستی میں تیار ہونے والی کتابوں میں سے کسی کتاب میں اس زمانے کی زندگی کا عکس نہیں ملتا - اور ان کتابوں کی زبان اجتماعی و انفرادی تجربات اور مشاہدات کے اظہار کا ذریعہ نہیں بنی - وہ واقعیت کے قریب نہ آسکی ، نیز سادہ اور سلیس

زبان لکھنے کی تحریک اردو کے بڑے مراکز دلی اور لکھنؤ سے دور کلکتہ میں شروع ہوئی تھی۔ پھر اس وقت اردو کو آسان اور سلیس بنانے کی کوششوں کے باوجود سرکاری زبان فارسی تھی، اس لیے یہ تحریک عام نہ ہوسکی، اور جب انگریزی، بنگالی اور مرہٹی وغیرہ زبانوں کے اخبارات کی طرح کلکتے سے پہلے اردو اخبار کا اجرا ہوا تو اردو کی مانگ نہ ہونے کے باعث چل نہ سکا۔ اس اخبار میں اداریہ نہیں چھپتا تھا۔ خبروں اور متن کی زبان فورٹ ولیم کالج کی تحریک سے متاثر ہے۔ یہ زبان واقعیت، اجتماعی و انفرادی تجربات و مشاہدات کے اظہار کا ذریعہ ہونے کے باوجود ''باغ و بہار'' اور ''توتا کہانی'' کی زبان کے قریب ہے۔ ادائگی میں بے تکلفی ہے، اس میں کچھ کچھ سلاست اور سادگی ہے۔ اس پر عربی اور فارسی کا اثر ہے مگر عربی اور فارسی الفاظ کی بھرمار نہیں ہے۔ مطالب کی نوعیت کے اعتبار سے جملوں کی ساخت الگ اور قدرے ناہموار ہے تاہم اسلوب فورٹ ولیم کالج کے دبستان کا نمائندہ ہے۔ مثلاً :

''ان سبھوں نے موافق دستور کے سلامی کی، ریزیڈنٹ صاحب کوٹھی سے نکل حضرت کو اندر لے گئے، حاضری کھلائی، خلوت میں کچھ باتیں ہوئیں، معتبرالدولہ بھی حاضر تھے۔ حضرت عطر نے بلدی مالی کو جس نے فصلی میوے کی ڈالی گزاری تھی، پانچ روپے انعام دے وہاں سے رخصت ہوئے، محل سرا میں داخل ہوتے صاحب عالم بہادر سے فرمایا کہ یہاں حاضر رہو، خود بدولت چار گھوڑے کی گاڑی میں سوار ہو حسن باغ کو کہ وہ مکان صاحب عالم بہادر کے واسطے آراستہ ہوا تھا ملاحظہ فرما ایک شبیہ اپنی اور ایک شبیہ کسو دوسرے کی لے محل سرا میں آئے۔''

(جام جہاں نما، ۱۲ اکتوبر ۱۸۲۵ ع)

۱۸۳۰ ع میں فارسی کی جگہ اردو کو سرکاری زبان بنا دیا گیا ، مگر اس کے بعد بھی طویل عرصے تک عوامی سطح پر فارسی ہی مستعمل اور مقبول رہی اور بعد میں جاری ہونے والے اردو اخبارات کی زبان پر بھی فارسی کا غلبہ رہا - بمبئی میں اگرچہ اردو اخبارات کا اجرا دلی میں بعض اردو اخبارات جاری ہونے کے بعد ہوا ، یہاں کے ابتدائی اردو اخبارات میں بھی اداریے نہیں ہوتے تھے ؛ تاہم دوسرے مندرجات کی زبان فورٹ ولیم کالج کے دستان یا ''جام جہاں نما'' کی زبان سے مختلف ہے ، اس میں عربی اور فارسی الفاظ کی کثرت ہے - صرف افعال اردو کے استعمال ہوئے ہیں - مثلاً :

''حمد و سپاس بے نہایت ، ثنا و ستائش بے غایت اس جناب احدیت قادر کریم خالق و رزاق و رحیم کو سزاوار ہے جو اپنے بندوں کے ہر کام کے لیے مسبب الاسباب رہبر و مدد گار ہے - الحال اس کے کمال عنایت و مہربانی سے اور حضرات عالی درجات ناظرین با غرور و تمکین و قدردانوں کی دستگیری اور فیض رسانی سے صحیفہ ''کشف الاخبار'' کی جلد ششم بخیر و سعادت تمام ہوئی ، سال ہفتم نے آغاز پایا[۳] -''

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ صحافت کی ضرورت و اہمیت بڑھتی گئی - حالات کے تقاضوں کے تحت اردو کے مراکز سے اردو اخبارات کا اجرا لازمی ہو گیا اور ان اخبارات کا پہلا دور ۱۸۵۷ ع میں ختم ہوا - چنانچہ ۱۸۵۷ع تک دلی ، آگرہ ، لکھنؤ ، مدراس ، بنارس اور پنجاب سے جو اردو اخبارات شائع ہوئے ان کی زبان کے اسالیب میں وہی فرق ملتا ہے جو ان تینوں مقامات کے ادیبوں اور شاعروں کی زبان میں موجود ہے چونکہ اس دور میں اخبارات میں الگ اداریے نہیں چھپتے تھے

اور بعض خبروں میں ہی اداری رائے شامل ہوتی تھی ، اس لیے اس دور کے اداریوں کے اسالیب گویا اخبارات کے مجموعی مندرجات ہی کے اسالیب ہوتے تھے -

دلی اور آگرہ

۱۸۵۷ع تک دلی اور آگرہ سے یہ اخبارات و رسائل جاری ہوئے : دہلی اخبار (جو بعد ازاں دہلی اردو اخبار بن گیا) ، ''مظہر حق'' ''سراج الاخبار'' ''سیدالاخبار'' ''صادق الاخبار'' ''گل رعنا'' یا ''کریم الاخبار'' ''اسعدالاخبار'' ''معیارالشعرا'' ''قطب الاخبار'' ''مفتاح الاخبار'' ، ''مطلع الاخبار'' ''اخبارالحقائق'' ''مفیدالخلائق'' ''قران السعدین'' ''فوائدالناظرین'' اور ''محب ہند'' وغیرہ - ان اخبارات کے نام ہی بتاتے ہیں کہ یہ گویا اردو نہیں فارسی یا عربی اخبارات و رسائل ہیں - ان کی زبان میں معمولی فرق کے ساتھ عربی و فارسی الفاظ کی آمیزش بہت زیادہ ہے - اگر جملوں سے اردو افعال یا ضمائر و اسماء نکال دیے جائیں تو عربی آمیز فارسی باقی رہ جاتی ہے -

''ہزار شکر اور لاکھ احسان ایزد و منان کہ روز مبارک عید قربان شر شریران بدآئین اور فساد معاندین یعنی فرنگیان بے دین سے بخیریت گزرا اور ہنود و اہل اسلام میں بابت گؤ کشی کسی طرح کا جھگڑا نہ ہوا اور دونوں گروہ آپس میں ہمچو شیر و شکر ملے رہے'' -
(دوسرا صادق الاخبار ۱۹ مارچ ۱۸۵۷ع)

لکھنؤ

لکھنؤ سے ۱۸۵۷ع تک جو اخبارات جاری ہوئے ان میں سے ''لکھنؤ اخبار'' ''طلسم لکھنؤ'' ''سحر سامری'' اور ''مخزن الاخبار'' وغیرہ قابل ذکر ہیں - ان اخبارات کی زبان

پر لکھنوی دبستان کا رنگ غالب ہے ۔ عبارت مقفٰی اور مسجع ہے ۔ خبری اور اعلاناتی نوعیت کے مندرجات بھی منظوم ہیں یا مقفٰی عبارت میں ہیں ۔ زبان میں عربی و فارسی الفاظ کی آمیزش بھی ہے مگر کم اور دلی اور آگرہ کے اخبارات کی زبان کے مقابلہ میں بہت ہی کم ۔ مثلاً :

''اس اخبار کی طبع کا ہر جمعہ کو دستور ہے اور خبر کی تصحیح کا التزام بالمقدور ہے ۔ مدح و ذم کا انداز نہیں رکھا ، ہاں سچ کہنے سے قلم کو باز نہیں رکھا ۔'' اور

''لکھنؤ میں سنیچر آیا ہے ، چوروں نے ہنگامہ مچایا ہے ، جو سانحہ ہے عجائب ہے ، آنکھ جوہکی پگڑی غائب ہے ۔''
(طلسم لکھنؤ ۱۸۵۶ء)

اور

''ان دنوں غلہ کی گرانی ہے ، گراں خاطر کی ارزانی ہے ۔ اس قدر مہنگا اناج ہے ، آسیائے فلک بھی دانے کو محتاج ہے ، فاقہ کشوں کی برق آہ شرر بار سے خرمن ماہ جل گیا گروہ نان خورشید لشکر غم کے پاؤں نیچے کچل گیا ۔''
(سحر سامری نومبر ۱۸۵۶)

مدراس اور بنارس

مدراس اور بنارس وغیرہ سے ۱۸۵۷ء تک جاری ہونے والے اخبارات میں سے 'سدھاکر اخبار' (ناگری رسم الخط) 'باغ و بہار' ، 'مراۃ العلوم' ، 'آفتاب ہند' ، 'خیر خواہ ہند' 'اعظم الاخبار' ، 'آفتاب عالم تاب' ، 'جامع الاخبار' ، 'بنارس اخبار' (ناگری رسم الخط میں) اور بنارس گزٹ وغیرہ قابل ذکر ہیں ۔ ان اخبارات کی زبان سادگی اور سلاست کے اعتبار سے لکھنؤ کے اخبارات کی زبان سے قریب ہے اور اسلوب کے اعتبار سے کلکتے کے

اخبارات یا فورٹ ولیم کالج کی نمائندہ اردو کتابوں کی زبان کے نزدیک ہے ۔ جملے نسبتاً سلیس اور چھوٹے ہیں ، اظہار و بیان میں بے تکلفی ہے ، عربی و فارسی الفاظ کم ہیں ۔ مثلاً :

''اس زمانے میں اہل اسلام کے درمیان افلاس و تنگی روز افزوں کا کیا سبب ہے ؟ یہی ، لوگ کسب معاش کی عقل سے بےبہرہ ہیں ۔ لکھنے پڑھنے میں جو کچھ حوصلہ پیدا ہو جائے تو کیا پوری تربیت ہو چکی ، یا اچھی شاعری اور پوری انشا پردازی کرنے لگے تو کیا مرد معقول بن گئے؟''

(اعظم الاخبار بحوالہ ہندوستانی اخبار نویسی محمد عتیق صدیقی ۳۰۸)

پنجاب

پنجاب کے مختلف علاقوں سے ۱۸۵۷ء تک جاری ہونے والے اخبارات میں کوہ نور ، ریاض نور ، دریائے نور ، باغ نور ، نور علی نور ، وکٹوریہ پیپر ، شملہ اخبار ، ہمائے بے بہا اور چشمہ فیض وغیرہ قابل ذکر ہیں ۔ چونکہ اس علاقے میں اردو صحافت کو متعین لسانی اسالیب کا ورثہ نہیں ملا تھا اور اخبارات شروع ہی مشاہدات و تجربات کے اظہار و بیان اور واقعیت کی تصویر کشی کے لیے ہوتے تھے ، اس لیے ان کا لسانی اسلوب شروع ہی سے مختلف تھا ۔ زبان نسبتاً آسان اور سادہ ہے ۔ اگرچہ عربی اور فارسی کا اثر موجود ہے مگر اتنا نہیں جتنا دلی کے اخبارات پر تھا ۔ لکھنؤی اخبارات کے برعکس زبان مسجع و مقفی نہیں بلکہ سیدھا سادا انداز ہے ۔ بیان میں بے تکلفی اور بےساختگی ہے ۔ جملوں کی ساخت بھی قدرے آسان ہے اور زبان میں ایجاز و اختصار ہے ۔ مثلاً :

''اب اودھ کے لوگ ضبطی ملک سے ناخوش ہیں ۔ ہزار ہا واران نوکری شور و غل مچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سرکار

کو سوائے ملک اودھ کے غیر مقامات کے آدمیوں کو نوکر رکھنا بعید از انصاف ہے - بادشاہ کے قدیمی ملازمین بجز چند آدمیوں کے سب برخاست ہوگئے - ان سے کہا گیا ہے کہ تمھارے حقوق کا لحاظ کیا جاوے گا - اب بادشاہ کی حالت پر سب کو رحم آتا ہے -''

(کوہ نور ۲۶ فروری ۱۸۵۶ع)

''... گزارش کیا جاتا ہے کہ غرض اصلی اجرائے اس نسخہ دل پذیر بہتر از اکسیر سے یہ ہے کہ پنجاب میں جو زبان اردو کو بدرجہ غایت اقتدار ہے ، دفاتر سرکاری میں اس کا رواج ہے - شعر و سخن میں بھی اس کو لطیف کہتے ہیں ، بول چال میں بھی اس کی فصاحت پر توجہ فرماتے ہیں... سو اس میں ایسے مضامین درج ہوا کریں گے جن سے زبان اردو کی ماہیت بوجہ احسن واضح ہو گی اور اس زبان کے شائقین کو نفع خاطر خواہ بہ آئین سہین حاصل ہو گا -

(خورشید پنجاب جنوری ۱۸۵۶ع)

دوسرا دور

۱۸۵۷ع سے پہلے اردو ادبی زبان تھی - اس میں شعری تخلیقات زیادہ تھیں اور نثری کم، اور نثری تخلیقات بھی ادبی نوعیت ہی کی تھیں - چنانچہ اس وقت تک صحافت کی زبان بھی کم و بیش ویسی ہی رہی -

سرسید احمد خاں کے رسالہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ سے اردو صحافت کے دوسرے دور کا آغاز ہوا - سرسید نے اردو زبان کی اصلاح اور ترقی کے لیے بھی ہمہ گیر تحریک شروع کی - پھر اس دور میں بعض اخبارات میں اداریے بھی علیحدہ سے شائع ہونے لگے - اگرچہ اداریوں کی زبان اخبارات کے دوسرے مندرجات سے مختلف نہیں ہوتی تھی ، اس لیے کہ اس دور میں بھی صحافتی زبان علمی و ادبی زبان سے مختلف نہیں تھی - علاوہ ازیں سارا اخبار

عموماً ایک ہی شخص مرتب کرتا تھا ، اس لیے اخبار کے تمام مندرجات کی زبان کم و بیش ایک سی ہوتی تھی ۔ اس دور سے قبل صحافت بھی شاعرانہ انداز بیان لیے ہوئے تھی اور یہ چیز مسائل پر غور اور علوم کے اردو میں ڈھالنے کے راستے میں رکاوٹ تھی ۔ اسی طرح قدیم انداز نثر میں ''بات کو بڑھانے اور پھیلانے'' کا رجحان زیادہ تھا ۔ اب ایجاز و اختصار یعنی جامعیت پر زور دیا گیا ۔ سرسید احمد خاں اور ان کے رفقائے کرام نے تحریر کے قدیم لگے بندھے اصولوں کو چھوڑ کر آزادی اسلوب اور آزادی موضوع کی رسم جاری کی ۔ انگریزی الفاظ بھی بے محابا استعمال کیے ۔ انھوں نے اردو ادب کو مادیت ، عقلیت ، اجتماعیت اور حقائق نگاری سے آشنا کیا ۔ چونکہ اس وقت صحافت ادب سے الگ نہیں تھی ، اس لیے اردو صحافت نے بھی یہی اوصاف اپنائے ۔ بقول رشید احمد صدیقی :

''سر سید اور ان کے رفقائے کرام نے اردو ادب کے بیشتر موضوعات پر جو تصانیف پیش کی ہیں ، ان کو مختلف اسالیب کے اعتبار سے بنیادی یا معیاری قرار دیا جا سکتا ہے ، اس لیے کہ ان کے بعد آنے والوں نے جہاں کہیں ان موضوعات کو اختیار کیا ہے ، مثلاً مذہب ، کلام ، سیرت ، تنقید ، سیاست ، انشائیے وغیرہ ، ان کا اسلوب تحریر کم و بیش ان بزرگوں کے اسالیب نگارش سے جا ملا ہے [۳] ۔''

کمال یا حیرت کی بات یہ ہے کہ جن اخبارات و رسائل نے سرسید احمد خاں کی تحریک کی نظریاتی اعتبار سے مخالفت کی ، زبان کے معاملے میں انھوں نے بھی سر سید احمد اور ان کے گروہ کی پیروی کی ۔ سرسید اور ان کی تحریک کی مخالفت میں لکھنؤ کا اودھ پنچ اور اس کے قلمی معاونین پیش پیش تھے ، مگر چکبست کے الفاظ میں :

''اودھ پنچ کی یادگار خدمت یہ ہے کہ اس نے اردو نثر کو
اس کا مصنوعی زیور اتار کر جس میں سوائے کاغذی پھولوں کے
کچھ نہ تھا ، ایسے پھولوں سے آراستہ کیا جن میں قدرتی لطافت
کا رنگ موجود تھا ۔ اودھ پنچ سے پہلے رجب علی سرور کے طرز
تحریر کی پرستش ہوتی تھی اور عام مذاق تصنع و بناوٹ کی طرف
مائل تھا ۔ اس زمانے میں جو اردو اخبارات جاری تھے ان کی
زبان ایسی ہوتی تھی جسے ہم محض محبت سے اردو کہہ سکتے ہیں ۔
آج نثر اردو جس سلیس اور پاکیزہ روش پر جاری ہے اس کی ایجاد
میں 'اودھ پنچ' بہت بڑا حصہ ہے [۵] ۔''

اودھ پنچ کے قلمی معاونین مرزا مچھو بیگ ، ستم ظریف ،
احمد علی صاحب شوق ، پنڈت تربھون ناتھ ہجر ، نواب سید
محمد آزاد ، بابو جوالا پرشاد برق ، احمد علی کسمنڈوی اور حضرت
اکبر الہ آبادی ، ایک طرز نو کے موجد ہی نہیں تھے ، وہ زبان
و قلم کے دھنی تھے ۔ ان کی عبارت شوخی و تازگی اور خدا داد
بے تکلفی سے معمور ہے اور ان کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے ۔
اگرچہ ان میں سے ہر ایک کا اسلوب بیان دوسروں سے قدرے
مختلف اور منفرد ہے ، مگر سادگی ، سلاست ، بے تکلفی اور محاورے
کی چاشنی ان کی تحریروں کی مشترک قدریں ہیں ۔ ان میں سے اکثر
نے سید احمد خاں اور ان کے بعض رفقا کی طرح انگریزی الفاظ استعمال
نہیں کیے ہیں ۔ سر سید اور ان کے رفقا کی تحریروں میں متانت غالب
ہے ؛ البتہ کہیں کہیں زیر لب تبسم کی کیفیت ملتی ہے ۔ مگر
اودھ پنچ کی بیشتر تحریروں میں تبسم زیرلب کی کیفیت نہیں پھبتیوں
کا رنگ ہے ۔ طبیعت کی شوخی اور بے تکلفی اکثر درجہ' اعتدال سے
گزر جاتی ہے اور مذاق سلیم مجروح ہوتا ہے ۔ اگرچہ اس قسم کی
ظرافت اس زمانے کے دستور اور لکھنے والوں کے معمول کے مطابق
تھی ؛ مگر اس کے باوجود اس زمانے کے دوسرے دبستانوں سے

وابستہ اہل قلم کی تحریروں کی متانت ، سنجیدگی اور مقصدیت کے مقابلے میں بری طرح کھٹکتی ہے - اودھ پنچ کا یہ دور انیسویں صدی کے اواخر سے لے کر بیسویں صدی کے ربع اول تک چلتا رہا - لیکن اس دور میں زمانے کا رنگ بدل گیا اور اردو صحافت نہ صرف روزانہ صحافت بن گئی بلکہ اس نے کئی اور منزلیں بھی طے کر لیں -

پنجاب میں کوہ نور سے لے کر پیسہ اخبار کے اجرا (۱۸۸۷ء) تک کا عرصہ بہت اہمیت رکھتا ہے - بقول انوار قریشی :

''یہ وہ عرصہ ہے جس میں اردو صحافت کی نشو و نما ہوئی اور وہ مختلف دشوار گزار راستوں سے گزرتی ہوئی موجودہ مقام تک پہنچی - اس زمانے میں اردو چمک دار حالت میں نمودار ہوئی۲ -''

اس عرصے میں پنجاب کے مختلف علاقوں سے سوا دو سو کے قریب اخبارات و رسائل نمودار ہوئے جو انسانی زندگی کے تقریباً تمام مسائل کی ترجمانی کرتے تھے - ان میں سے زیادہ تر علمی اور سیاسی تھے ، کچھ علم طب کے رسائل تھے ، چند ایک مزاحیہ صحافت کے علمبردار تھے - کچھ فن کاشت کاری اور باغبانی کی اشاعت کے لیے مخصوص تھے - کچھ سرکاری پروپیگنڈا اور لوکل سیلف گورنمنٹ کی ترجمانی کرتے تھے - کچھ مذہبی رسائل بھی تھے ، مگر ان میں سے بیشتر مذہبی مناظرات میں الجھے رہتے تھے-

پنجاب کے بیشتر اخبارات و رسائل کوہ نور کے اسلوب سے متاثر تھے - اگرچہ دلی اور لکھنؤ کے اخبارات و رسائل کے مقابلے میں پنجاب کے اخبارات و رسائل کی زبان پہلے ہی آسان اور سلیس تھی ، سرسید احمد خاں کی تحریک نے اسے اور بھی آسان اور سلیس بنا دیا -

سرسید کے بعد

سرسید احمد خاں کی وفات کے بعد سے مولانا ظفر علی خاں، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر کی صحافت کے آغاز تک اسلوب کے اعتبار سے کوئی نئی تحریک نہیں ملتی۔ قدیم مشکل پسندی کا دور تو پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ بیسویں صدی کے ساتھ ہی تحریکوں کا دور شروع ہو گیا اور سیاسی بیداری پیدا ہونے لگی۔ سیاسی بیداری نے ادبی اور صحافتی بیداری کے لیے مہمیز کا کام دیا۔

مولانا ظفر علی خاں، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد کے میدان صحافت میں آجانے سے اردو صحافت ایک نئے دور میں داخل ہوگئی۔ یہ زمانہ پاک و ہند کی تاریخ کا بھی بہت اہم زمانہ ہے۔ پھر مولانا ظفر علی خاں، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد عالم بھی تھے، سیاست دان بھی، ادیب بھی اور پرجوش خطیب بھی۔ چنانچہ ان کے اداریوں میں وہی خطابتی انداز جھلکتا ہے اور اردو اداریہ نگاری کی یہ روش پہلی تمام روشوں سے مختلف تھی۔ اس وقت شاعروں، صورت گروں اور افسانہ نویسوں کے اعصاب پر عورت سوار تھی، لیکن صحافت نعرۂ رستاخیز کا رنگ لیے ہوئے تھی۔ اس دور میں سرسید کے زمانے کی متین، سنجیدہ اور سادہ نثر کے خلاف رد عمل ملتا ہے۔ زبان پرجوش، جارحانہ اور چونکا دینے والی تھی۔ اردو اداریوں اور بحیثیت مجموعی صحافت کا جو اسلوب پہلے وجود میں آچکا تھا اس پر ادب نے دوبارہ یورش کردی اور ایک بار پھر صحافتی اسلوب کی جگہ ادبی اسالیب نے لے لی۔ سیاسی عوامل نے اس کی معاونت کی۔ اردو صحافت نے خلافت اور عالم اسلام کے دوسرے مسائل کو اٹھاکر اسلامی دنیا سے ایک نیا رشتہ قائم کیا اور ایسی ادبی

زبان کو فروغ دیا جو عام قاری کے ذہن سے زیادہ دیر ہم آہنگ نہیں رہ سکتی تھی ۔ صحافتی ادب کی جگہ ادبی صحافت رائج ہوگئی ۔ صحافت میں جذبات نگاری کا راستہ کھل گیا ، مگر بعض دوسرے اہم راستے بند ہوگئے ۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریر میں خلوص ہے ۔ الہلال جذباتی صحیفہ نگاری کا بے مثال شاہکار تھا ۔ اس میں ایک خاص قسم کی ادبیت موجود تھی ، مگر مشکل اور مغلق الفاظ کی بھرمار ہے ۔ جگہ جگہ عربی اور فارسی جملوں اور شعروں کا بے محابا استعمال ہوا ہے ۔ بقول سکسینہ : ''مولانا آزاد نے عربی اور فارسی کے غیر مانوس الفاظ سے اردو کو مشکل بنا دیا ہے ۔'' مولانا محمد علی چونکہ انگریزی زبان و ادب اور صحافت کے مزاج سے واقف تھے اس لیے انہوں نے زبان میں عربی و فارسی کی رنگ آمیزی قبول نہ کی ۔ مگر ان کی اردو صحافت کی عمر مختصر ہونے کے باعث ان کا رنگ محدود اور مختصر رہا ۔

مولانا ظفر علی خاں نے اردو صحافت کو اتنا کچھ دیا کہ وہ بابائے صحافت کہلائے ۔ انہوں نے سابق پنجاب میں صحافت کی آبیاری کی ۔ بہت سے لوگوں نے زمیندار میں صحافتی تربیت حاصل کی ۔ مولانا نے اردو صحافت کو بے باکی جرأت ، بے خوفی اور گرج عطا کی ، لیکن اردو صحافت میں عقیلت کو دبانے اور جذبات کو غالب کرنے میں بھی انھی نے زیادہ حصہ لیا ۔ پرشوکت الفاظ ، بلند بانگ ترکیبیں ، پرجوش لہجہ ، عربیت اور فارسیت کا غلبہ ان کی زبان کا خاصہ ہے ۔ وہ اداریوں میں بھی الفاظ کے تانے بانے سے نئی نئی ترکیبیں وضع کرتے ہیں ۔ الفاظ ان کے یہاں نئی نئی صورتوں میں جلوہ گر ہوتے ہیں ۔ محاورات بکثرت استعمال کرتے ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑی ندی رواں دواں ہے ۔ ان کے یہاں جذبات اور

تخیل کا امتزاج ملتا ہے۔ ان پر علامہ شبلی نعمانی اور مولانا محمد حسین آزاد کا بھی اثر ہے اور انگریزی ادب میں ایڈگرایلن پو ، رائڈر ہیگرڈ اور رڈیارڈ کپلنگ سے متاثر ہیں ۔

جدید دور

مولانا ظفر علی خاں کا اخبار چونکہ روزنامہ تھا اور وسیع حلقۂ اثر و اشاعت رکھتا تھا ، اور پھر اس ادارے میں بہت سے اور قابل صحافی و ادیب بھی کام کرتے تھے جو براہ راست یا بالواسطہ مولانا کے انداز کو عام کرنے میں حصہ لیتے تھے ، اس لیے کچھ عرصے تک آردو ادارے کا یہ اسلوب مقبول اور عام رہا ۔ لیکن جوں جوں جذبات کی بجائے عقل و ہوش سے کام لینے کا وقت آتا گیا اور اخبارات خواص کے ساتھ ساتھ عوام تک بھی پہنچنے لگے ، آردو اداریوں کے اسلوب اور لب و لہجہ میں بھی تبدیلی کی ضرورت کا احساس شدید ہوتا چلا گیا اور اس ضرورت کو سب سے پہلے ''انقلاب'' کے مدیروں مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید سالک مرحوم نے پورا کیا ۔ انہوں نے اداریوں کی زبان کو آسان ، عام فہم اور سادہ بنایا اور جوش و جذبات کی بجائے عقل و استدلال سے بات سمجھانے کا طریقہ اختیار کیا ۔ مولانا مہر کی زبان میں انتہائی سادگی ، استدلال اور عقلیت ہے ۔ ۱۹۳۶ء تک زمانے کے تقاضوں کے تحت آردو ادارے بلکہ پوری صحافت کا مزاج یکسر بدل گیا ۔ مولانا ظفر علی خاں اور مولانا ابوالکلام ازاد کا اثر صحافت کی زبان میں کم ہوگیا ۔ انقلاب کے بعد جاری ہونے والے اخبارات نے زبان و اسلوب کے معاملے میں پہلے زمیندار اور انقلاب کے بین بین راستہ اختیار کیا ، پھر انقلاب کی روش کی طرف جھک گئے۔ ۱۹۴۰ء میں نوائے وقت کا اجرا ادارے کی زبان و اسلوب کی

تبدیلی میں ایک اور اہم سنگ میل ثابت ہوا ۔ ادب اور صحافت کے راستے الگ الگ ہوگئے ۔ پہلے صحافت ادب سے متاثر تھی تو اس کے بعد ادب میں صحافت کی زبان اور اسلوب کی سادگی اور سلاست کا نفوذ ہونے لگا ۔ نوائے وقت نے سادہ ، مختصر مگر مدلل اداریہ نگاری کو مزید پروان چڑھایا ۔ عام خواندہ بلکہ نیم خواندہ لوگ بھی اخبار پڑھنے لگے ۔ اس لیے مواد کو خوبصورت یا بامطلب زبان اور دلکش اسلوب میں پیش کرنے کی بجائے صفحات پر خوبصورت انداز میں پیش کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی ۔ رفتہ رفتہ قواعد کی رو سے زبان کی صحت بھی غیر ضروری سمجھی جانے لگی ، اور منتہائے مقصود یہ بن گیا کہ مفہوم کی بجائے آسان اور کم سے کم الفاظ میں مدعا بیان ہوجائے ، خواہ ایسا کرتے وقت زبان کے قواعد کی خلاف ورزی ہی ہو ۔ اگر قارئین کی توجہ مفہوم کی بجائے الفاظ یا اُن کی دروبست کی طرف منعطف ہوتی ہے تو یہ اداریہ نویسی اور صحافت کے مقصد کے خلاف ہے ۔ لسانی اعتبار سے یہ ایک المیہ بھی ہے کہ اب زبان کی صحت ملحوظ نہیں رکھی جاتی ۔ بہرحال اب صحافت کی نئی اقسام نے زبان کو اور بھی سہل بنانے اور اظہار و بیان میں زیادہ سے زیادہ ایجاز و اختصار کو بروئے کار لانے کی ضرورت پیدا کردی ہے ۔

حوالے

۱۔ تنقیدی مقالات ، مرتبہ مرزا ادیب ، لاہور اکیڈمی لاہور ، ۱۹۶۵ع ص ۸۱ ۔

۲۔ میر امن سے عبدالحق تک ، ڈاکٹر سید عبداللہ ، مجلس ترقی ادب لاہور ، مئی ۱۹۶۵ ص ۳ ۔

۳- بحوالہ رسالہ آردو ، اکتوبر ۱۹۴۵ ''بمبئی کی صحافت'' رئیس احمد جعفری ، ص ۷۸۳ تا ۸۰۳ ۔

۴- تہذیب الاخلاق ، اختتام سال ۱۲۹۱ء ہجری ، بحوالہ علی گڑھ نمبر علی گڑھ میگزین ، ص ۱۰ ، مقالہ آل احمد سرور ''سر سید اور مغرب کے تہذیبی و ادبی اثرات'' ۔

۵- مضامین چکبست ، مقالات بر اودھ پنچ و نامہ نگاران ۔

۶- پنجاب میں آردو صحافت کا ارتقائی دور ، انوار قریشی امروز لاہور - مئی ۱۹۵۸ع ۔

سوالات

۱ - آردو اداریے نے ارتقائی مراحل کے دوران میں جو مختلف اسالیب اختیار کیے آن پر روشنی ڈالیے ؟

۲ - سر سید احمد خاں نے آردو اداریے کے اسلوب کو کس حد تک اور کیسے متاثر کیا ؟

۳ - مولانا ظفر علی خاں ، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد نے آردو اداریے کے اسلوب کو کن حیثیتوں سے متاثر کیا ؟ مدلل جواب دیجیے ۔

۴ - جدید اردو اداریے کے اسالیب پر روشنی ڈالیے ۔

۵ - اسلوب کے اعتبار سے جدید اور قدیم آردو اداریوں کا فرق واضح کیجیے ۔

—:o:—

[تم جدرل]

صحافت پر دیگر کتب

ابلاغ عام : مہدی حسن ، لیکچرر شعبہ' صحافت ، پنجاب یونیورسٹی

قیمت : تین روپے پچاس پیسے

فن صحافت کے موضوع پر مرکزی اردو بورڈ کی یہ کتاب ایم - اے (صحافت) کے طلبہ کے علاوہ اخبارات ، ریڈیو ، ٹیلی ویژن ، تعلقات عامہ اور محکمہ' اطلاعات سے متعلق افراد کے لیے بھی سودمند ہے - اس کتاب میں ابلاغ عام کے متعلق جدید ترین معلومات مہیا کی گئی ہیں اور کتاب کو جابجا تصویروں اور خاکوں سے مزین کیا گیا ہے -

ابلاغ عام کے چند اہم عنوانات : ابلاغ کی راہ میں رکاوٹ * ابلاغ عام کے ذرائع * ابلاغ عام کے تاثرات * ابلاغ عام کی اہمیت * ابلاغ عام اور رائے عامہ * حکومت اور ابلاغ عام وغیرہ

ابلاغ عام کے مندرجہ ذریعوں میں دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لیے یہ کتاب بے حد مفید ہے اور موجودہ دور کی سب سے اہم قومی اور بین الاقوامی ضرورت ہے - کتاب کے آخر میں اہم انگریزی اصطلاحات کے اردو تراجم بھی دیے گئے ہیں -

---

فن ادارت : مسکین علی حجازی ، لیکچرر شعبہ' صحافت ، پنجاب یونیورسٹی

قیمت : چھ روپے

ابلاغ عام کے اہم ترین ذرائع ریڈیو ، ٹیلی ویژن اور اخبارات و جرائد کے نظام میں روزافزوں توسیع کا تقاضا یہ ہے کہ صحافت اور صحافیانہ نوعیت کے نظری و عملی پہلوؤں پر زیادہ سے زیادہ کتابیں فراہم کی جائیں - چنانچہ مرکزی اردو بورڈ اس سے پہلے دو کتابیں ''فن صحافت'' اور ''ابلاغ عام'' پیش کرچکا ہے - یہ کتاب اس سلسلے کی تیسری کڑی ہے - یہ کتاب اخبارات ، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے نیوزسیکشن کی بنیادی اور اہم ترین شخصیت 'سب ایڈیٹر' کے فرائض کا ہمہ گیر احاطہ کرتی ہے ، اخباروں کے سرچشموں اور ان کے ذرائع حصول نیز صحافی اصطلاحات ، علامات سے متعلق الگ الگ ابواب میں مفصل معلومات جمع کر دی گئی ہیں ، تاکہ عام قاری اور صحافت کا طالبعلم دونوں ان سے مستفید ہوسکیں -

مرکزی اردو بورڈ

طباعت سرورق رہبر پریس لمیٹڈ ، لاہور